Kuch Tou Likh Ke Log Kehte hai

کچھ تو لکھئے کہ لوگ کہتے ہیں

مصنّف

آغا اشرف علی

ترجمہ کار

سیّد حبیب

(جملہ حقوق بحقِ مصنّف محفوظ ہیں)

نام تصنیف: کچھ تو لکھئے کہ لوگ کہتے ہیں.....

نام مصنّف: ڈاکٹر آغا اشرف علی

ترجمہ کار: سیّد حبیب

کمپوزنگ: روشن ضمیر

طبع اوّل: 2010ء

صفحات: 341

تعداد: 3000

قیمت: 400 روپے

مطبع: شالیمار آرٹ پریس سرینگر

کشمیر ٹائمز پبلی کیشنز، جموں وکشمیر

فہرست مضامین

۱۔	آغاز اور بڑھتی ہوئی زندگی	1
۲۔	ایس پی کالج سے جامعہ ملیہ اسلامیہ تک	31
۳۔	شیخ محمد عبداللہ اور آزادیٔ کشمیر	76
۴۔	ملٹری جی..... جے ہند	104
۵۔	یورپ اور امریکہ میں تعلیم و تربیت	127
۶۔	طریق کوہکن میں وہی حیلے ہیں پرویزی	159
۷۔	گھرانہ	227
۸۔	احباب اور شاگرد	250
۹۔	میر کے دین و مذہب کو.....	304
۱۰۔	نساء	327
۱۱۔	تصاویر	

انتساب

اس مرحومہ خاتون کے نام

جس کے بطن سے حنا، شاہد، اقبال اور سمیتا پیدا ہوئے

جس نے میری تخلیق میں ایسا کارنامہ انجام دیا

جو میں نے خواب میں بھی نہ دیکھا تھا۔

اشرف

عرضِ نیازِ مترجم

پروفیسر آغا اشرف علی پڑھے لکھے شخص ہیں، اُستاد ہیں اور جہاں دیدہ مجلس آرا۔ اُن کی آنکھ بہت تیز ہے اور شوق وسیع و عمیق۔ ان کی انگریزی دُھلی منجھی ہے، فلسفیانہ افکار سے حامل۔ ان کے طنز آمیز نشتر بھی چیرے دگر اور اُڑانیں بھی سحر آمیز۔ میں ان کا شاگرد کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگا تیلی کہہ کر بھی اپنی کم بضاعتی اور کم ظرفی بیان نہیں کر سکتا۔ خیال و نظر، تحسین و تنقید کے ان کے اپنے انداز نرالے ہیں، جداگانہ ہیں۔ وہ کن کے ساتھ اُٹھیں، بیٹھیں، کیا پڑھیں کیا نہ پڑھیں، کس پر واہ واہ کریں اور کہاں آہ بھریں، مجھ جیسے بے وتیرے کا اس میں کیا دخل؟

غالباً ۲۰۰۵ء میں جب جناب حندال طیب جی اپنے گرانقدر خدمات سے سبکدوش ہوئے آغا صاحب کے ساتھ ان کے گھر میں اٹھنے بیٹھنے اور مجلس آرائی کرنے لگے۔ میں جب اُن دنوں بھی کبھی کبھی آغا صاحب سے ملنے جاتا تو انہیں گرم گفتاری میں مشغول پاتا اور طیّب جی کو آرام سے سننے میں محو۔ معلوم ہوا تھا کہ آغا صاحب اپنی زندگی کی کہانی طیّب جی کو سنا رہے ہیں جو ریکارڈ بھی ہو رہی ہے۔ روز پچتالیس منٹ کا کیسٹ تیار ہوتا تھا اور اٹھتیس دن میں انیس کیسٹ صدا بند ہوئے تھے۔ کسے معلوم تھا کہ یہ کہانی میری اپنی اُردو زبان میں اس کتاب کی صورت اختیار کرے گی۔ شاگرد ہونے کے حدود کے اندر اندر میں نہ آغا صاحب کو مشورہ دے سکتا تھا اور نہ ان کے خیالات میں مداخلت کر سکتا تھا۔ اگر سہواً کسی وقت ایسی غلطی سرزد ہو جاتی تو آغا صاحب self appointed adviser کی ڈانٹ

سناتے اور میرا منہ بند!

میرا کام شروع ہونے سے پہلے ایک فلم ساز اعجاز رشید صاحب نے انگریزی زبان میں آغا صاحب کے بیانی فرمودات کتابی صورت میں لانے کی ٹھان لی تھی۔ ان کا کام کہاں پہنچا یا رُک گیا، مجھے معلوم نہیں۔ آغا صاحب کے ایک اور دوست محمد شفیع خان صاحب نے دو تین کیسٹ سن کر کچھ انگریزی عبارت لکھ ڈالی تھی مگر میں ان کے کام سے استفادہ کر نہ سکا اس لئے کہ وہ میرے کام کے ڈھانچے میں، جس میں کئی ایک ابواب شامل تھے، بیٹھ نہ سکتا تھا۔ نیز شفیع صاحب نے بہت سارے الفاظ اس لئے غلط لکھے تھے کیونکہ ان کے کان آغا صاحب کی سبک گفتاری کے ساتھ نباہ (adjust) نہ کر سکے تھے۔

آغا صاحب نے میرا کام جانکاہ قرار دیا ہے۔ میں اس سے اتفاق کروں یا نہ کروں مگر یہ کام صبر آزما تھا ضرور خاص کر اس وقت جبکہ ان کے فرمودات کے ساتھ چھیڑ بھی نہیں سکتا تھا۔ ان کے خیال میں نے اُردو زبان میں من وعن منتقل کئے ہیں اور ایسی زبان میں جو ان کے فکر اور احساس کے ساتھ میل کھاتی ہے۔ میں نہ زبان داں ہوں اور نہ قلم کار مگر توفیق الٰہی سے جو ہو سکا وہ کر دیا ہے۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف! قارئین کرام میری کوتاہیوں پر صبر کر کے اگر معاف کریں تو بات بنے گی!

حبیب
زبرون، برین نشاط
سری نگر
اپریل ۲۰۱۰ء

پیش لفظ

پیسٹرناک (Pasternak) نے لکھا ہے کہ کیسے کیسے لوگوں سے میں نے زندگی میں محبت کی جو مری زندگی کے بننے اور بنانے میں کام آئی۔ یہ روئیداد اس لئے لکھ رہا ہوں کہ اپنے خوشگوار فرض کو نبھاؤں اور اللہ میاں کا شکر ادا کروں جس کے فیض سے حالات، اتفاق اور بخت کی نامعلوم کُن مطابقتوں سے مجھ پر کچھ ایسی گذری کہ یہاں اس کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔ ابھی میں کالج میں ہی پڑھ رہا تھا کہ مشفق استاد مرحوم صاحب زادہ محمود نے مجھے پال برنٹن سے ملنے کو کہا جو سری نگر تشریف لائے تھے۔ میرے نانا کے بعد یہ دوسرا طوفان تھا جس کو میں نے گلے لگایا۔ ابھی میری زندگی کا کچا دھاگہ الجھنے ہی لگا تھا کہ اس میں ایک اور گرہ پڑ گئی۔ اسی خوش قسمت سال یعنی ۱۹۴۱ء میں جبکہ میں عمر کی پہلی دہائی سے ہی گذر رہا تھا، مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین سے ذہنی و نفسیاتی ٹکراؤ کا حادثہ پیش آیا۔ پھر ۱۹۴۲ء میں، میں علی گڈھ پہنچا ہی تھا کہ مرحوم پروفیسر محمد حبیب کی فیاضی نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔ اس سمندر میں دو سال ڈبکیاں لے ہی رہا تھا کہ دو سال گذر گئے اور میں مرحوم ذاکر صاحب کے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں پہنچ گیا۔ یہ سب بندھن زنجیروں اور ہتھکڑیوں کی طرح اس قیدی کے ہاتھوں پر بندھ گئے تھے کہ میں پروفیسر حبیب کے چھوٹے بھائی مرحوم پروفیسر محمد مجیب کی خدمت میں پہنچ گیا۔ حبیب صاحب نے ان کے نام ایک خط بھی دے دیا تھا۔ آج اس کتاب میں ان اساتذہ، ان احباب اور ان ساتھیوں کا ذکر کر رہا ہوں اور اس طرح اپنے کاندھوں سے ان کے احسانات کا بوجھ اُتارنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میرا حافظہ کمزور و ناپائیدار ہے اس لئے سب اکابر اور دوستوں کا ذکر آیا ہو یا نہ مگر بصد آداب و نیاز سب کا شکریہ بجالانے کا متمنی ہوں اور اپنی کوتاہیوں کیلئے معافی کا

خواستگار رہوں۔ ڈاکٹر جانکی ناتھ جان، ماسٹر سوم ناتھ رینہ، پروفیسر سروانند ٹھسو، مکھن لال رینہ، مکھن لال ٹیکو، گوپی ناتھ رینہ، امکار ناتھ لابرو، بنرجی مصری، ان سب کی یاد تازہ کر رہا ہوں مگر مرحوم سید میر قاسم، غلام محمد راجپوری اور محمد یوسف بٹ صاحب، روپ کرشن مرزا اور بی، این دودا کو گویا اپنی آنکھوں سے چلتے پھرتے، میٹھے میٹھے بول بولتے دیکھ رہا ہوں اور ان کی مہربانیوں کے پھولوں سے بو باس کی خوش دماغیاں محسوس کر رہا ہوں۔

جامعہ میں ڈاکٹر عابد حسین مرحوم کی ذہنی اور فلسفیانہ اڑان کوئی بھولے تو کیسے یا شفیق الرحمٰن قدوائی کو جو جامعہ کے اولین معماروں میں گنے جاتے تھے۔ کیسے کیسے لوگ موجود تھے وہاں مثلاً میرے ساتھی اختر حسین فاروقی صاحب، آرٹ کے استاد اور حسن لازوال کے شیدائی۔ ان کی ہی بدولت میں اپنی بیوی سے نسبت جوڑ چکا تھا اور یہ نسبت ایک سنگ میل تھی جہاں سے میری اخلاقی اور نفسیاتی تعلیم کا درس شروع ہوا تھا۔

۱۹۵۲ء میں جب میں انگلستان سے واپس کشمیر آیا تو میری زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوا۔ آر، سی، رینہ صاحب، پروفیسر این این رینہ صاحب، پروفیسر موہن لال مصری، مکھن لال مصری اور پروفیسر کرشنا مصری میرے رفیق بن گئے اور ان کی رفاقتوں نے مجھے عقل و خرد کی تازگی کے جام پلائے۔ سب سے زریں موقعہ اس وقت نصیب ہوا جب میرے استاد میرے قلبی دوست بن گئے اور اس طرح صاحبزادہ محمود صاحب، جے این بھان صاحب اور خصوصیت کے ساتھ پروفیسر جیالال کول صاحب کے ساتھ دل سے ملانے کے رسیلے گھونٹ پینے پلانے کی باری آئی۔ استاد اور شاگرد جب دوست بنتے ہیں تو دوستی کی گہرائیاں زندگی کا ساز و سوز پیدا کرتی ہیں اور لمحات ذہنی و قلبی کھل کھلاہٹوں کا ساز چھیڑتے ہیں۔ اسی آئینے میں ان تعلقات کو دیکھنا ہے جو یونیورسٹی کشمیر میں پروان چڑھے اور پروفیسر موتی لال لدو، پروفیسر چونی لال وشن، پروفیسر این این رینہ اور پروفیسر موہن لال مصری کو میرے قریب لایا۔ یونیورسٹی کے سنہری پانچ چھ سال یوں سمجھئے کہ پھل ثابت ہوئے اس درس کا جو بحیثیت استاد میں نے ۱۹۴۵ء میں جامعہ میں اپنے دل میں بویا تھا۔

میرا حافظہ تازہ ہے، خوش نصیبی کی وجہ سے بھی، کہ میرے شاگردوں سے معدودے چند اول درجے میں ایم، ایڈ میں پاس ہوئے اور اس درس کی آخری شاخ پر ایسے امبری سیب نمودار ہوئے کہ میں آج تک اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا نہ کر سکا۔ موتی لال وکیل، مولوی عبدالحی[1]، حبیب، مہدی الحسن رضوی، اقبال نازکی اور محمودہ ایسے دوست بنے کہ مجھے بے اختیار ۱۹۴۵ء کی مشہور رپورٹ General Education in a Free Society: The Report of the Harward Committee میں درج یہ جملہ یاد آیا کہ استاد کے خلوص اور خدمت کا اس سے بڑا کوئی تحفہ نہیں:

"The quieter rewards and inward satisfactions of the teaching profession ..."

میرے یونیورسٹی میں قیام کا غالباً آخری سال تھا جب ایک شاگرد سے ایسا سبق سیکھا جو کبھی بھلا نہیں سکتا۔ حلیمی کا وہ سبق میری سب سے بڑی ضرورت تھی اور وہ یوں پیش آیا۔ میں کلاس میں مجیب صاحب کی کتاب دی انڈین مسلمز سے مسلمان کی تعریف (definition) بیان کر رہا تھا اور یہ کہہ کہ یہ تعریف مجیب صاحب نے عارف اجمیری شیخ معین الدین چشتی سے مستعار لی ہے۔ چونکہ یہ قابل ذکر تعریف ہے اور ناقابل فراموش میں اسے ان ہی کی زبان میں نقل کر رہا ہوں:

A Muslim is enjoined to cultivate a generosity like the generosity of the river, a benevolence like the benevolence of the sun, and a hospitality like the hospitality of the earth"

یہ سنتے ہی ایم، ایڈ کی ایک چھوٹی سی لڑکی سکینہ مسعودی جو کھریو پانپور سے آئی تھی، اٹھ کھڑی ہوئی اور کہا کہ یہ تعریف غالباً خواجہ اجمیریؒ کی نہیں حضرت بایزید بسطامیؒ کی ہے جو ان سے پہلے گذر چکے ہیں۔ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۷۰ء تک ایک ربع صدی گذر چکی تھی کہ میں پہلی بار ٹھٹکا، گھبرایا اور کچھ کہے بغیر گھر آیا۔ حسن اتفاق سے میں نے یونیورسٹی سے ایک کتاب ڈ

۱۔ مولوی عبدالحی اور اقبال نازکی نے گو کہ فسٹ ڈویژن نہیں پایا تھا مگر ان کی صلاحیتوں نے مجھے بہت متاثر کیا۔

تھی جو اناماری شمل نے اسلامی تصوف پر لکھی ہے۔ اس میں یہ تعریف بایزید بسطامی کی نسبت سے درج ہے۔ پھر دوسری ربع صدی گذری کہ میں جوزف نیڈم سے متعارف ہوا اور عاجزی (humility) کی یہ تعریف نیڈم کی زبان میں نظر سے گذری۔ میں اسے اپنی زندگی کا ماحصل سمجھتا ہوں:

> Humility is surely a concealed form of love, a willingness to give to others the benefit of the doubt, to be prepared to learn from them and in short a refusal to say that 'We are the people', and that 'wisdom was born with us'.[1]

یہ الفاظ نیڈم کے اس لیکچر سے لئے گئے ہیں جس کا عنوان ہے Christianity and the Asian Cultures۔ یہ لیکچر ان کی کتاب میں چھپا ہوا ہے جو یونیسکو نے خصوصی طور پر چھاپی ہے۔ آٹھ دس صفحے پر مشتمل یہ لیکچر میرا محبوب مضمون ہے۔

اختتام پر میرا خوشگوار فرض ہے کہ ان احباب کا ذکر کروں جو ریٹائر ہونے کے بعد مجھ سے ملے۔ کمانڈر سیٹھ صاحب، ڈاکٹر اوپندر کول اور ان کے ہونہار چھوٹے بھائی شنکر کول، ڈاکٹر ایس این درجن کی بے وقت موت نے مجھے مجروح کر کے چھوڑا۔

میری آخری ہچکچاہٹ ختم ہوئی جب دلّی میں پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے اس کتاب کے بارے میں مجھ سے کہا کہ اسے بلا عذر چھپوا دیجئے۔ قدوائی صاحب میرے اور میری بیوی کے سب سے مشہور شاگرد ہیں جو اب غالب اکیڈمی کے ناظم ہیں اور حال ہی میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے اردو کے پروفیسر کی حیثیت سے ریٹائر ہو چکے ہیں۔ عزیز دوست فاروق نازکی صاحب نے بھی یہی مشورہ دیا۔

میں دل سے محسوس کرتا ہوں کہ میرے شاگردوں میں سے صرف دو ایسے شاگرد ہیں جو ہر لحاظ سے مجھ سے آگے نکل پڑے ہیں۔ ایک ڈاکٹر اقبال نازکی جنہوں نے افلاطون کی معرکتہ آلارا کتاب ''ریاست'' کا کشمیری ترجمہ کیا۔ یہ کتاب حال ہی میں کشمیر یونیورسٹی

1. Within the Four Seas: Joseph Needham, FRS.

نے چھاپی ہے۔ دوسرے میرے سب سے عزیز شاگرد سید حبیب ہیں جنہوں نے میری سوانح عمری ''راہنما'' پہلے ہی لکھ ڈالی ہے۔ ان کے ہی مبارک ہاتھوں سے یہ جانکاہ ترجمہ وجود میں آیا۔ حبیب کوسوں دور مجھ سے آگے نکل چکے ہیں۔ یاد رہے کہ انہوں نے انگریزی اور اردو میں علامہ اقبال پر دو کتابیں لکھی ہیں اور انگریزی میں تصوف پر ایک چھوٹی سی کتاب۔ انگریزی زبان میں میرے انیس کیسٹ سن سن کر، ان کے مطالب سمجھ سمجھ کر، ان مطالب کو مختلف ابواب میں لا لا کر یہ ترجمہ وجود میں آیا۔ یہ کیسٹ دراصل حندال طیّب جی کے ساتھ بیٹھ کر اٹھتیس دن میں وجود میں آئے۔ میں روز پنتالیس منٹ تک طیّب جی کے ساتھ اپنی زندگی کے بارے میں گفتگو کرتا تھا۔ وہ بیچ بیچ میں سوال پوچھتے تاکہ میری زندگی کے حالات وواقعات میں معانی بھر جائیں اور تسلسل کے ساتھ۔ طیبؔ صاحب اس کیلئے تحسین اور تہہ دل سے شکریہ کے مستحق ہیں۔ پی لال کی زبان میں کہیں تو یہ ترجمہ محض ترجمہ نہیں بلکہ transcreation ہے یعنی میری انگریزی بات چیت کا تخلیقی اردو رُوپ جس کیلئے میری روح حبیب کو ہمیشہ ہمیشہ یاد کریگی۔

آخر پر میں کشمیر ٹائمز پبلی کیشنز، جموں وکشمیر کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جن کی مہربانیوں سے اس کتاب کے شائع کرنے کا کام احسن طریقے سے ممکن ہوسکا۔ شالیمار پرنٹنگ پریس اور روشن ضمیر کی دلچسپ کوششوں کا بھی اعتراف ہے۔ ان محسن کوششوں سے بھی کتاب کی اشاعت ممکن ہوسکی!

آغا اشرف علی

صوفیہ نشان

راجباغ

۱۵، اپریل ۲۰۱۰ء

آغاز اور بڑھتی ہوئی زندگی

مُڑ کے دیکھتا ہوں تو بچپن کے دن یاد آتے ہیں۔ میرے حافظے میں وہ خوف ابھی بھی کروٹیں لیتے ہیں جو بچپن ہی میں تحفظ کی کمی سے میرے دل میں پیدا ہو گئے تھے۔ میں نامراد بچہ تھا۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ مرا بھاگ تھا یا میری تقدیر۔ میری ماں نے مجھ سے پہلے دو بیٹوں کو جنم دیا تھا۔ اب اس کی خواہش تھی کہ بیٹی ہو مگر بیٹی نہیں، میں پیدا ہوا۔ اُدھر میرے نانا آغا سید حسین مرحوم کی شریکِ حیات فوت ہو گئی تھی۔ اس نے میری ماں کی سہیلی کے ساتھ شادی کی۔ وہ عمر کے لحاظ سے میری ماں سے بھی چھوٹی تھی۔ میرے نانا عمر رسیدہ تھے۔ نانی بانجھ تھی اس لئے اس کی اولاد نہیں ہو سکتی تھی۔ اسے خدشات نے گھیر لیا تھا کہ اولاد نہ ہونے کی وجہ سے اسے نانا کی جائیداد سے حصہ نہیں ملے گا۔ اس نے مجھے متبنّٰی بنا لیا مگر اس کے خدشات نے میرے دل میں تحفظ کی کمی بڑھا دی۔ ایک دو وجوہات اور بھی تھے جنہوں نے میرے دل میں خوف پیدا کیا تھا۔ ایک کا تعلق مولوی جوّاد انصاری مرحوم کے مکان کے ساتھ تھا جو دریائے جہلم کے کنارے پر واقع تھا۔ یہ وہ مکان ہے جو بعد میں مولوی افتخار حسین انصاری نے رہائش کیلئے چن لیا تھا۔ اس گھر میں آغا جلال صاحب کی گھر والی زینت بہن بھی رہتی تھی۔ میں بچپن کے ابتدائی دنوں میں اس کے ساتھ کھیلتا تھا، اس لئے اس سے ملنے اس کے گھر جاتا تھا۔ مکان کی دوسری منزل میں دریا کی طرف ایک کھڑکی کھلتی تھی۔ ایسا لگتا ہے کہ میں اس کھڑکی کے قبضے کو دو ہاتھوں سے پکڑ لیتا تھا اور دریا

میں گر کر ڈوب جاتا تھا۔ یہ کیفیت دس گیارہ سال متواتر میرے دل میں خوف پیدا کرتی رہی۔ اس قسم کا دوسرا خواب میرے موروثی گھر کے ساتھ وابستہ تھا۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں ساتھ ہی آج کا نیا سیکریٹریٹ بنا ہوا ہے۔ مکان خاصا بڑا تھا۔ جونہی اوپر سے نیچے اُترتا تھا، مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میں سینکڑوں بلکہ لاکھوں سانپ دیکھتا تھا۔ تعجب ہے کہ میں ڈرتا بھی تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں سانپوں کے نزدیک جاتا بھی تھا کہ نہیں مگر سانپ موجود ہوتے تھے ضرور۔ میرا خوف حقیقت کا سا روپ اختیار کرتا تھا۔ میری نانی بھی (جس نے مجھے گود لیا تھا) کبھی کبھی ایسی باتیں کرتی کہ میرے دل میں تشویش پیدا ہوتی تھی۔ مثلاً میں کوئی چیز کھاتا اور وہ کہتی کہ کھاؤ اور خوب کھاؤ۔ کیا معلوم یہ چیز کل ملے یا نا ملے۔ اس طرح کی باتیں میرے دل میں خوب خدشات پیدا کرتی تھیں۔ میں سوچتا کہ اگر معاملات اتنے سنگین ہیں تو میں اچھی اچھی چیزیں کیسے کھاؤں۔ نتیجہ یہ کہ دس سال تک وازہ وان اور ہر یسہ جیسی اچھی غذاؤں سے محروم رہا۔ میں نے ایسی غذائیں کھانے کی تمنا تک بھی چھوڑ دی۔ یہ انوکھی بات تو ہے مگر میں اس طرح اپنے آپ کو سزا دیتا تھا اور وہ بھی بلاوجہ!

میری زندگی کا ایک اور سخت مرحلہ اس وقت شروع ہوا جب میرے نانا ریٹائر ہو گئے۔ ۱۹۳۱ء کا زمانہ گزر چکا تھا اور میری عمر قریباً گیارہ سال کی تھی۔ ایک دو سال کے اندر ہی جائیداد کی تقسیم کا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ میرے بڑے ماموں آغا سید محمود مرحوم نابینا ہو چکے تھے اس لئے جائیداد کے زیادہ سے زیادہ حصے کی تمنا کئے ہوئے بیٹھے تھے۔ اس سے گھر میں رسہ کشی پیدا ہو گئی اور عدم تحفظ کا سا ماحول۔ ہر ایک وارث زیادہ سے زیادہ حصہ چاہتا اور اس طرح نزاع میں پھنس جاتا۔ میں نے یہ ماحول دیکھا، اس کے اثرات محسوس کئے اور چھوٹی عمر سے ہی حالات کے ساتھ سمجھوتہ کرنے لگا۔

میرے نانا کٹر مذہبی شخص تھے اور صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔ وہ راضی نہیں ہوئے کہ اپنی جائیداد کا اتنا حصہ مجھ کو دیدیں جتنا بیٹے کو دیا جاتا ہے۔ اس سے بھی میرے عدم تحفظ

میں اضافہ ہوگیا۔ اس سے میری نانی (جس نے مجھے متبنّٰی بنالیا تھا) کو بھی تشویش ہوئی ہوتی۔ ایک اور فتنہ اس وقت کھڑا ہوگیا جب میرے بھائیوں کو نانا کے مذہبی ہونے کے باوجود اتنی جائیداد نہ ملی جتنی مجھے۔ مجھے آدھا حصہ مل گیا اور انہیں آدھا حصہ اکٹھے۔ ظاہر اًیہ نامناسب بات تھی اس لئے میرے بھائی ناراض ہوگئے۔ تاہم مجھے جائیداد کا اتنا حصہ نہ ملا جتنا ہمیں توقع تھی۔ میری نانی نے مجھے گود لیا تھا۔ میرے والدین چاہتے تھے کہ نانی کی جائیداد بھی مجھ کو ملے۔ مگر معلوم ہوا کہ سرینگر شہر میں کسی کو بیٹا نہیں بنایا جاسکتا۔ پس نانا کے گھر میں میری خصوصی پوزیشن ختم ہوگئی اور بارہ سال کی عمر میں مجھے اپنے باپ کے پاس واپس آنا پڑا۔ اب نہ دربار موکے ساتھ نانا کے ہمراہ جموں جانا ہے، نہ لاہور اور نہ کراچی۔ لاہور میں وہ مکان بنواتے تھے۔ جب بھی وہاں جاتے، مجھے بھی ساتھ لے جاتے۔ جوڑوں کی بیماری اور ریح کا علاج کرانے کیلئے کبھی کبھی کراچی جاتے تو میں بھی ان کے ساتھ جاتا۔ وہاں وہ کلفٹن کے پاس گرین ہوٹل میں ٹھاٹھ سے رہتے تھے۔

میرے ماموں زاد بھائی اور میرے سگے بھائی نانا کا میرے ساتھ اس قدر لاڈ پیار دیکھ کر رشک کرتے تھے۔ خود نانی بھی میرے لئے اچھے اچھے کپڑے لاتی۔ کسی حد تک میں لاڈ سے پھول گیا تھا۔ میں چھ سات سال کا بچہ تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میرے لئے نہایت ہی عمدہ چمڑے کا جوتا لایا گیا تھا جس کے اوپری حصے پر (zip) زپ لگائی ہوئی تھی۔ میرے بھائی حسد کی نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگے۔ ان کے ساتھ اب لڑائی جھگڑے بھی شروع ہونے لگے۔ وہ مل کر مجھے پکڑتے اور پیٹتے۔ اس طرح میں تنہا رہنے لگا اور تنہائی کے احساس نے مجھے گھیر لیا۔ میں نانا کے گھر کی خصوصی پوزیشن کھو چکا تھا۔ ادھر اب باپ کے گھر میں سب سے چھوٹا درجہ مل گیا تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس تبدیلی سے میری زندگی پر کون سے منفی اثرات پڑ گئے۔ ایک بات تو واضح ہے کہ میں دل کی بات دل ہی دل میں چھپانے لگا۔ ہمارے گھر میں اب اتالیق (tutors) بھی آنے لگے تھے۔ ان میں ایک

کشمیری پنڈت مجھے خواہ مخواہ مارتے تھے۔ گھر والے اس مار پیٹ کی کوئی خاص نوٹس نہیں لیتے بلکہ بچوں کیلئے اسے ایک مفید چیز گردانتے تھے۔ ہم سب بچے کاغذ کی پرچیوں پر ''نوشتہ'' لیکر سکول جاتے تھے۔ ان پر ''آج بچے مہذب رہے'' لکھا جاتا تھا۔ ہم یہ پرچیاں استادوں کے حوالے کرتے اور ان کے عتاب سے بچ جاتے۔

نانا کے ساتھ میری والہانہ محبت میری زندگی کا مرکزی نکتہ ہے۔ اس نے مری زندگی پر بہت بڑا اثر ڈالا ہے۔ اب بھی ان کی محبت دل میں جگہ کئے ہوئے ہے۔ وہ بہت ہی اچھے انسان تھے اور جاذبیت ان کی شخصیت کا خاصا تھا۔ میری دیکھ بھال کرتے مگر خاصی توجہ کے ساتھ۔ اس سے دیکھ بال ریسلی شفقت کا رُوپ دھار لیتی تھی۔ جموں میں وہ گھومنے جاتے تو مجھے ساتھ لے جاتے۔ ان کی محبت میرے دل میں اسقدر گھر کر گئی تھی کہ ان کے بغیر کسی کے ساتھ والہانہ محبت کا سوال تک پیدا نہیں ہوتا تھا۔[1] اگرچہ آخر کار ان کے گھر سے رخصت ہونا پڑا تاہم اُنہیں سالہا سال ادب اور احترام کے ساتھ یاد کرتا رہا اور اُن خوش گذران ایام کو بھی جو ان کے ساتھ گذارے۔ چنانچہ روز کالج کی مصروفیات سے فارغ ہو کر اور ٹینس وغیرہ کھیل کر میں لال منڈی جاتا تھا اور اُن سے ملتا تھا۔ ان کے ساتھ گھومنا نصیب ہوتا تھا مگر کارآمد باتیں بھی ہوتی تھیں۔

ہمارا گھرانہ شہر کے معدودے چند گھرانوں میں شمار ہوتا تھا۔ جاگیرداری نظام کا ٹھاٹ باٹ یعنی زمینیں، نوکر چاکر، موٹر، گھوڑے گاڑیاں اس گھر کا خاصا تھا۔ ہم چھ کے چھ بھائی (ہم تیں بھائی اور ہمارے تین ممیرے بھائی) تانگوں پر سکول جاتے تھے۔ موسم سرما میں میرے بھائی یہاں سرینگر میں ہی رہتے تھے اور میں اکیلا جموں چلا جاتا تھا۔ یہ حال ۱۹۳۱ء تک قائم رہا جب میرے نانا ریٹائر ہو گئے۔ جس وقت میں پہلی دفعہ سکول میں داخل ہوا، وہ یا

۱۔ انہوں نے اپنی زندگی میں ہی اپنا کفن اپنے پاس رکھا تھا جس سے بھی ان کی شخصیت کی طرف ایک کھڑکی کھلتی ہے۔ مگر اُن کا کفن دیکھکر زندگی کی بے ثباتی کا اثر مجھ پر پڑ گیا۔ بہت گہرا مگر!

تو ہائی کورٹ کے جج تھے یا منسٹر۔ میں نے پرائمری سکول میں داخلہ لیا تھا۔ دلچسپ بات ہے کہ میرے لئے ایک چھوٹی سی کرسی بنائی گئی تھی جس پر میں سکول میں بیٹھتا تھا۔ یہ مراعت کسی اور بچے کو حاصل نہیں تھی۔ اس خصوصی پوزیشن کا پہلا اثر یہ ہوا کہ میں ہم جماعتیوں کی دوستی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ میں کلاس میں ایک بچے کے ساتھ دوستی کرنا چاہتا تھا مگر وہ میرے ساتھ بات بھی نہیں کرتا تھا۔ کہہ دیجئے کہ میں کلاس میں ہی گویا اچھوت بن بیٹھا! نانا نے ریاضی سکھانے کے لئے خزانے سے سکّے منگوائے تھے جو خاکی رنگ کے کاغذ میں چستی سے بند ہوتے تھے۔ وہ سکّے نکال نکال کر مجھے دکھاتے تھے اور اس طرح آدھ پیسہ، ایک پیسہ، آنہ، دونّی، چونّی اور اٹھنّی سے میں واقف ہو گیا۔ ان سکوں کی مدد سے میں نے گنتی بھی سیکھی ہو گی۔

میرے نانا میرے ساتھ ہی حسن سلوک سے پیش نہیں آتے تھے بلکہ لوگوں کے ساتھ بھی اچھا برتاؤ کرتے تھے۔ بولتے تو نرم لہجے میں، دیکھ بال کرتے تو ہر ایک کی۔ معاف کرنا اُن کا شیوہ تھا۔ چھوٹے، بڑے، اپنے، پرائے، مرد، عورتیں اُن کی رحمدلی سے متاثر تھے۔ میں تو ان کے حسن سلوک اور ان کی شریف النفسی سے متاثر تھا ہی مگر عام لوگ بھی ان کے ان اوصاف سے سر جھکاتے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد جب لوگ ان کے پاس آتے، وہ ان کی فریاد سنتے اور حتی الوسع مدد کرتے۔ کوئی مہمان آتا تو دوسری منزل سے اُتر کر اُسے پہلی منزل میں بٹھاتے۔ خود بھی بیٹھتے۔ شفقت بھرے لہجے میں خیر خیریت پوچھتے، زمیں اور زمیں داری کا حال معلوم کرتے، فصلوں کی حالت دریافت کرتے اور اس کے کنبے کے دُکھ سکھ کا جائزہ لیتے۔ اتنے میں سماوار میں چائے اور چائے کے ساتھ روٹی آتی۔ اگر چائے آنے میں دیر ہوتی تو وہ خود اُٹھتے اور چائے منگواتے۔ اس اخلاقی روش اور اس سلوک کے اثرات خوب اچھے پڑتے۔ چنانچہ جب ان کی میّت سرینگر لائی گئی اور ان کو دفنایا گیا تو کثیر تعداد میں لوگوں نے اس آخری رسم میں شرکت کی اور دوبارہ جنازہ پڑھ کر خراج عقیدت پیش کیا۔ ان اوصاف حمیدہ کی چھاپ ہم گھر والوں پر بھی پڑی تھی اور بہت گہری! ہم دل کی

گہرائیوں سے ان کی عزت کرتے تھے اور اُنہیں گھر کے سارے افراد میں ممتاز شخصیت گردانتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ ہم سب خوش قسمت تھے کیونکہ سارا گھرانہ ان کے رنگ میں رنگ گیا تھا۔ اسی رنگ نے ہم سب چھوٹوں کو بعد میں خوشحال بنا دیا۔ میرے دادا آغا شیر علی مرحوم دوسری طرح کی شخصیت تھے۔ رفتار میں گفتار میں انگریز جیسے تھے اور مغربی طرز میں رنگ گئے تھے۔ کبھی بھی منصب کے پیچھے نہیں دوڑتے تھے اور نہ منصب بڑھانے کی سعی کرتے تھے۔ ایسے فتنوں سے بھی دور رہتے تھے جن میں لوگ منصب بڑھانے کی خاطر پھنس جاتے ہیں۔ وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ عیسائی مبلغوں کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے تھے جن میں کینن بسکو کا نام ادب اور احترام کے ساتھ لیا جا سکتا ہے۔ ہمارے گھرانے میں ان کی پوزیشن الگ تھلگ تھی مگر نفسیاتی اعتبار سے۔ برعکس اس کے آغا سید حسین کشمیر کے پہلے میٹریکولیٹ تھے۔[1] قلم کار تھے اور طبع آزمائی کیلئے لکھتے تھے۔ ان کی انگریزی بھی اچھی تھی اور اُردو، فارسی اور عربی بھی۔ وہ گالف کھیلتے تھے اور مارکھور، بارہ سنگھا کا شکار بھی کرتے تھے۔ جانوروں کے سینگوں سے گھر کو سجانا اور ان کی کھالوں سے زیب و زینت کا سامان بنانا ان کے مشاغل میں شامل تھا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ اعتدال پسند تھے اور اپنی ذات میں مشرق اور مغرب جذب کر گئے تھے جس سے ہم آہنگی پیدا ہو گئی تھی۔ یہ زمانہ سازی، یہ روایتی تمدن کی برقراری، یہ توانائی، یہ صحت مند توازن تفصیل چاہتا ہے مگر ہم اختصار سے کام لیں گے اور کچھ حوالے دیں گے۔ ان کے پاس افلاطون کے مقالات کی چھ جلدیں تھیں جن کا ترجمہ جوویٹ (Jowett) نے کیا تھا۔ وہ عظیم مفکر سقراط سے بھی بخوبی آشنا تھے۔ اس کا بیّن ثبوت (Trial And Death of Socrates) ''سقراط کا

۱۔ میرے نانا ۱۸۹۴ء میں راولپنڈی تانگے پر گئے اور مڈل کا امتحان دیا۔ پھر ۱۸۹۶ء میں وید لال جی کے ساتھ تانگے پر ہی راولپنڈی گئے اور میٹرک کا امتحان دیا۔ وید لال جی سرگباش ہوئے اور نانا واحد میٹرک پاس کی حیثیت سے آگے بڑھے۔ اُن کی انگریزی بہت اچھی تھی۔ محمد دین فوقؔ نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ اچھی انگریزی اور قابلیت کے سبب آغا سید حسین ترقی کر گئے۔

مقدّمہ اور ان کی رحلت" نامی کتاب ہے جو ان کے پاس موجود تھی۔ "اپک ٹیٹس کی تعلیمات" (Teachings of Epictetus) نامی کتاب سے پتہ چلتا ہے کہ وہ یونان کے کلاسیکی ادب سے بھی مستفید تھے۔ یہ کتاب بھی ان کی لائبریری میں موجود تھی۔ وہ اس کی تمثیلی کہانیاں (Allegorical Tales) سناتے اور ساتھ ساتھ مولانا کے میٹھے میٹھے اشعار پڑھتے جو ان کے حافظے میں محفوظ تھے۔[1] چنانچہ بڑے برادر آغا شوکت علی کی شادی پر جس میں پنجاب کے وزیر اعظم سکندر حیات خان بھی مدعو تھے، نانا نے مولانا رومیؔ کی مثنوی سے اشعار پر اشعار سنائے جس سے ضیافت کا ذائقہ بڑھ گیا ہوگا، حاضرین کے فکری نشے بھی چڑھ گئے ہونگے اور مجلس آرائی میں بھی چار چاند لگ گئے ہوں گے۔ گلستان و بوستان سعدی شیرازی کے دو شاہکار ہیں۔ ان کی دھوم آجکل بھی مغرب و مشرق میں مچی ہوئی ہے اس لئے کہ ان کی ادبی و معنوی حیثیت بھی مسلّمہ ہے اور ان کی موجودہ زمانے میں افادیت بھی کہ جو زمانہ سیاستِ مُدن کی علالت سے کراہتا نظر آتا ہے۔ نانا دونوں کے بلبل نوا سنج! یہاں کشمیر میں بیٹھ کر گلستان و بوستان پڑھ پڑھ کر شیراز کی ہواؤں اور نغمہ طرازیوں سے سامانِ قلب و جگر مہیا کرتے تھے۔ ان کے ذوق و شوق کی بلندیاں اور لبالب مستیاں اور بھی بڑھ جاتیں جب وہ بلبل شیراز شمس الدین حافظؔ کا دیوان پڑھتے۔ یہ دیوان انکی ادبی دل چسپیوں کی طرف کھڑکی کھولتا ہے اور ان کی عرفانی سمجھ بوجھ کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ دیوان کی تلاوت وہ بار بار کرتے تھے۔ ان کے پڑھنے کے انداز سے ان کے دل کی گہرائیاں مشکبو ہوتی تھیں اور ان کی لطف اندوزیوں کا سراغ ملتا تھا۔ یہ محض مثالیں ہیں جو یہاں دی جارہی ہیں۔ تفصیلات کے لئے صاحبانِ فکر و فن کو ان کی لائبریری پر تحقیق کرنا ہوگی۔ اس لائبریری میں مشرق و مغرب پر چیدہ چیدہ کتابیں موجود تھیں۔ ۱۹۲۸ء کی سیلاب میں میں نے خود اپنی آنکھوں سے ان کی بہت سی کتابیں پانی کے اوپر تیرتی دیکھیں۔ بے رحم سیلاب

۱۔ انسان جو غذا کھاتا ہے اس سے اس کی شخصیت پر ضرور اثر پڑتا ہے اور اس کی صحت پر۔ نانا کی صحت (روحانی) اور شخصیت مولانا کے اشعار پڑھتے پڑھتے اور ان کی تمثیلی کہانیاں سمجھتے سمجھتے بن گئی تھی۔

کے بہاؤ نے ان کی لائبریری بھی تہس نہس کر دی۔ میں جب آگے چل کر ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم سے دھیرے دھیرے واقف ہو گیا تو میں نے ان کی ذات میں بھی مغربی و مشرقی علمی و ثقافتی ہم آہنگی پائی۔ انہوں نے بھی مغربی تہذیب کے بہترین اجزاء اپنائے تھے مگر اپنے میراث کی صحت مند روش بھولے نہیں تھے۔ آغا سید حسین بے پرواتھے۔ جیو اور جینے دو اُن کی زندگی کا اصول تھا۔ وہ کسی کی غیبت نہیں کرتے تھے۔ ہمیشہ سیر کرنے جاتے اور سیر و تفریح سے لطف اندوز ہو جاتے۔ اگر ان کی دختر یا گھر والی کسی بات پر ان کے ساتھ اتفاق بھی نہ کرتیں تو بھی ان کے من پر کوئی منفی اثر نہ پڑتا۔ وہ اپنے فہم و فکر اور اپنے انداز سے زندگی گزارتے۔ بلند خیالوں کے اونچے محل میں مست رہنا ان کا معمول تھا۔

میرے دادا آغا شیر علی ظریف الطبع تھے۔ کبھی کبھی عہد رفتہ کی باتیں سناتے تھے۔ کہتے تھے کہ انہیں بچپن میں انگریزی وضع قطع کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ وہ نواکدل سے بنڈ تک چلتے چلتے آتے تھے۔ کسی فرنگی کو بنڈ پر چلتے دیکھتے تو اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگتے۔ افرنگی جب سرینگر کلب یا ریذیڈنسی کے پاس پہنچتا تو دادا سمجھتے کہ انہیں تب جانا چاہیے۔ وہ بول اٹھتے ''صاحب، اب جانے کی اجازت ہے''۔ افرنگی چونک کر مڑتا اور قہقہہ مارتا۔ اسی طرح ایک دن بسکو صاحب نے دادا سے کہا کہ جب تک وہ نہ آئیں، دادا کہیں نہیں جائیں گے۔ واپس آکر دونوں اکٹھے چائے پئیں گے۔ پھر یہ کہ دادا کے والد نے ان کو کہہ دیا تھا کہ اگر بسکو صاحب کہیں جاتے ہوں تو ان سے التماس کرنی چاہیے کہ دادا کو بھی ساتھ جانے کی اجازت دی جائے۔ اسی طرح بڑے بڑے لوگوں سے ملاقات کرنے اور اُن سے سیکھنے کے موقعے ہاتھ آئیں گے۔ چنانچہ ایک دن کھیل گاہ میں وہ کچھ قدم دور کھڑے تھے مگر کہیں جا رہے تھے۔ دادا نے اونچی آواز میں کہا ''To Whom'' یعنی ''کہاں جا رہے ہیں آپ'' بسکو صاحب نے ظریفانہ انداز میں اسی قسم کی انگریزی میں جواب دیا "Who you" یعنی ''تم کون ہو پوچھنے والے'' ایک اور لطیفہ یہ کہ ایک دن دادا کہیں افرنگیوں کے ساتھ چائے

پی رہے تھے۔ کیک دادا کے نزدیک تھا۔ کسی میم صاحبہ نے دادا سے مخاطب ہو کے کہا "Could you please cut me a piece of cake" دادا نے سمجھا کہ وہ کہہ رہی ہیں کہ "مجھے کاٹو جس طرح کیک کاٹتے ہیں"۔ اس نے جواب دیا "No Madam" "نہیں صاحبہ"۔ اس سے بھی جاندار لطیفہ یہ ہے کہ ایک دفعہ بسکو صاحب شکار کھیلنے کیلئے گئے تھے۔ دادا کو ساتھ لیا۔ جب واپس آئے تو بسکو کے گھر پر کھانے کا انتظام تھا۔ بسکو صاحب نے اپنے دوستوں سے کہا "میرے اس جواں دوست سے ملئے۔ اس نے آج ایک مردہ گیدڑ کا شکار کیا۔" دادا بسکو صاحب کے ظریفانہ کلام سے محظوظ ہوئے۔

آغا سید حسین کی قابلیت نائب تحصیلدار بننے کے بعد خوب نکھر آئی۔ مہاراجہ ہری سنگھ کو اُن کا حسن ظن تھا۔ وہ ان کی قدر کرتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۲۸ء میں جب ریاست میں عدالتِ عالیہ قائم ہوئی تو ان کو اس کا جج بنایا گیا۔ ہمارے گھر میں ایک تصویر اب بھی موجود ہے جس میں ایک طرف آن جہانی بودھ راج سہانی ہیں اور دوسری طرف نانا۔ بودھ راج نے آکسفورڈ میں تعلیم پائی تھی اور Bachelor of Civil Law (دیوانی قانون کی پہلی ڈگری) کی ڈگری حاصل کی تھی۔ آغا صاحب مروّجہ تعلیم کے اعتبار سے اُتنے پڑھے لکھے تو تھے نہیں پر مجھے وکلاء کہتے ہیں کہ وہ ان کے دیے ہوئے فیصلے اب بھی پڑھتے ہیں تاکہ قانونی معاملات میں ماہرانہ صلاحیت پیدا ہو۔ آغا صاحب کی قابلیت اور صلاحیت نے انہیں بعد میں ہوم اینڈ جوڈیشل منسٹر بھی بنایا۔

جس زمانے میں آغا صاحب (نانا) اودھم پور میں وزیر وزارت تھے اُنہوں نے نوکروں کو ہدایت دی تھی کہ وہ ان کے پاس بار بار نہ آیا کریں۔ مگر وہ صبح کے وقت کلیجی اور شام کے وقت گردے تیار کرواتے تھے اور کھاتے تھے۔ یہ غذا جوڑوں کی بیماری پیدا کرنے میں خاصا رول ادا کرتی ہے۔ لازماً نانا جوڑوں کی بیماری میں پھنس گئے۔ دوائی کے بغیر چارہ نہ رہا۔ ۱۹۱۸ء سے بیس سال تک علاج کراتے رہے۔ ہم لاہور میں ماڈل ٹاؤن سے انارکلی بازار تک دوائیاں

خریدنے جاتے تھے وہاں سے وہ فرانس سے آئی ہوئی پانی کی بوتلیں بھی خرید کر لاتے تھے۔ مجھے ابھی بھی اُن دوائیوں کا نام یاد ہے اور اس مرہم کا جو وہ جوڑوں پر لگاتے تھے۔ مگر انڈا کھاتے تھے روز۔ میں جب امریکہ چلا گیا تو ڈاکٹر نے میرا معائنہ کیا۔ میرے پت کے اندر پتھر تھے۔ اس نے مجھے احتیاط اور پرہیز کرنے کی صلاح دی۔ یہ بھی کہ مجھے انڈوں، گردوں اور خشک مچھلیوں سے پرہیز کرنی چاہیے۔ ہوسکتا ہے کہ مجھے بھی کئی سالوں کے بعد جوڑوں کی تکلیف کا سامنا کرنا پڑے۔ میں نے ڈاکٹر کو بتایا تھا کہ میرے نانا اس تکلیف کا شکار ہوگئے تھے۔ میں جب امریکہ سے واپس آ گیا تو میر پان والے نے مجھے خشک مچھلیاں دیں۔ میں نے مچھلیاں تو کھائیں مگر اسی دن میرے انگوٹھے میں درد پیدا ہوگیا۔[1]

آغا سید حسین کی موجودگی سارے گھرانے کیلئے سعادت تصور کی جاتی تھی۔ گھر کا ایک ایک فرد اُن کی موجودگی محسوس کرتا تھا۔ تاہم جب وہ جموں جاتے تو گھر کا ربط وضبط اور نظم ونسق بگڑ سا جاتا۔ نانا جب گھر پر ہوتے تھے تو سب لوگ ایک ہی جگہ جمع ہوجاتے اور کھانا کھاتے۔ رہائشی مکان کے قریب ہی ایک جگہ تھی جہاں کھانے پینے کا انتظام اور بیٹھنے کی جگہ ہوتی تھی۔ سب افرادِ خانہ چھت والی ایک گذرگاہ سے کھانا کھانے کی جگہ پر پہنچ جاتے تھے۔ کھانا کھا کر سب لوگ منظم طریقے پر مکان میں واپس جاتے تھے اور اپنے اپنے گھروں میں۔ مگر جب وہ جموں جاتے تھے تو سب لوگ بڑے ماموں کے کمرے میں، جسے محل خانہ کہتے تھے، جمع ہوجاتے تھے اور نوکروں سے وہاں ہی کھانا منگواتے تھے۔ نئی برف گرنے پر کسی کا ''برف نو افتاد'' کہنا اور پھر دوسرے افراد کا مل کر اُسے کھانا کھلانا

۱۔ میں علاج کرنے کیلئے ڈاکٹر علی جان مرحوم کے پاس چلا گیا۔ امریکہ میں میں نے ایک مفصل ٹیسٹ کروایا تھا۔ میں نے تین صفحوں پر مشتمل اس ٹیسٹ کی کاپی جان صاحب کو دکھائی۔ انہوں نے کہا ''مجھے معلوم نہیں تھا کہ امریکہ میں بھی اچھے ڈاکٹر ہوتے ہیں'' وہ یہ کہہ رہے تھے اور میں ان کی تنی ہوئی گردن کی حرکتیں دیکھ رہا تھا۔ یہ حرکتیں بائیں کندھے کی طرف مائل ہوتی تھیں۔ جان صاحب کو اپنے اوپر کتنا ناز تھا!

ضیافتوں کا انتظام کرتا تو تھا مگر ان میں شرارت بھی ملی ہوئی تھی اور بدنظمی سی بھی۔

نانا جب جموں جاتے تو اپنی موٹر میں جاتے۔ یہ اٹھائیس ہارس پاور والی اور آٹھ سلینڈر والی موٹر تھی۔ سرینگر میں ایسی موٹر صرف ایک کاروباری شخص کے پاس تھی۔ اس موٹر میں سامان کے علاوہ ایک حقہ جاتا تھا جس کی بدبو مجھے بہت ناپسند تھی۔ پیر پنجال روڈ پر رام بن تک اناروں کے پیڑ ہوتے تھے۔ میں کسی جگہ اترتا اور ایک آدھ انار لاتا جو ذرا کھٹا لگتا تھا۔ سڑک کے آر پار ان اناروں کا خاصا اچھا اثر پڑتا تھا۔ ان کی وجہ سے زمین کا کٹاؤ نہیں ہوتا تھا۔ چونکہ نومبر کے بعد سڑک بند ہو جاتی تھی اس لئے نانا پہلے ہی پرانے بانہال درّے سے پار ہو جاتے تھے۔ اٹھارہ میل اوپر جانا پڑتا تھا۔ سڑک پر میکڈم لگایا تو گیا تھا مگر تیل نہیں۔ ان دنوں گاڑیاں زیادہ نہیں چلتی تھیں۔[1] جموں سے واپسی کا سفر بھی بانہال کے راستے ہی طے ہو جاتا۔ بانہال سے گزر کر جب ہم ایک جگہ ٹھہرتے تو وہ اپنا بڑا کوٹ نکالتے اور پہن لیتے۔ اس طرح وہ مئی کے مہینے میں بھی کشمیر کی ٹھنڈی ہواؤں سے بچ نکلنے کی تدبیر کرتے۔ جس جگہ وہ کوٹ پہنتے وہاں ایک خوبصورت چھوٹا چنار ہوتا تھا۔ منڈ ابالا یا بانہال میں وہ تھری سٹار برانڈی (Three Star Brandy) پانی کے ساتھ ملا کر پیتے اور اس طرح شاید سردی کا اثر کم کرنے اور جوڑوں کے درد سے چھٹکارا پانے کی تدبیر کرتے۔ شاید وہ ڈاکٹروں کے مشورے پر چلتے تھے۔ میں جب اصرار کرتا تو میرے پانی کے گلاس میں بھی ایک دو قطرے ڈالتے اور میں سارا پانی کا گلاس پی لیتا۔

میں نے ایک دن لاہور میں نانا سے اچھا سا کھانا کھلانے کی فرمائش کی۔ وہ ان کی ملازمت کے آخری ایام تھے۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے ہم مال روڈ پر سٹیفلز (Stiffles) کے

۱۔ اس سے قریباً پچیس سال پہلے موٹر سڑک نا پید تھی۔ نانا کے ماموں حکیم علی نقی مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے شاہی حکیم تھے۔ جب وہ جموں جاتے تو پالکی میں جاتے جسے چار آدمی کندھوں پر اٹھاتے تھے۔ ہمارے گھر کے اوپر چھت کے کمرے میں ایک پالکی پڑی رہتی تھی۔ میں اور آغا جلال اس کے اندر بیٹھتے اور کھیلتے۔ میں تانبے کی تھالی ہاتھوں میں لئے اس میں بیٹھ کر موٹر چلانے کے خواب دیکھتا تھا۔

ہاں کھانا کھائیں گے۔ یہ انگریزی طرز کے کھانوں کیلئے اچھی اور مشہور جگہ تھی۔ انہوں نے ٹماٹر میں بنی مچھلیاں منگوائیں۔ مجھے یاد ہے کہ وہاں ہی انہوں نے مجھے چھری اور کانٹا استعمال کرنا سکھایا۔ میں نے اچھی طرح سیکھ لیا۔ امارت پسندی کی یہ خصلت نانا کی دین ہے۔ میں فرنگی وضع اختیار کر گیا۔ مجھ سے لوگ جب پوچھتے تھے کہ ہم کھانا کیسے کھاتے ہیں تو میں کہتا تھا کہ چھری اور کانٹے سے اور صبح وشام چار قسم کا کھانا۔ ایک ہانجی کا بیٹا میرے ساتھ پڑھتا تھا۔ ایک دن اُس نے مجھ سے پوچھا کہ ہم کیا کھاتے ہیں، میں نے ان ساری چیزوں کا نام لیا جو انگریز کھاتے تھے۔ اصل میں ہم وہی کشمیری کھانا کھاتے تھے جو عام لوگ کھاتے تھے۔ اس میں چاول کے ساتھ ایک دو قسم کے سالن ہوتے تھے۔

میری والدہ سلیقہ مند خاتون تھی اور بہت دھلی منجھی۔ کبھی کبھی کینن بسکو، اس کے بیٹے ارک بسکو، مس میلنسن، فرڈ جیکب اور دوسرے مبلغوں سمیت دس بارآدمیوں کو کھانے پر بلاتی تھی۔ نوے فیصد وازوان کھلایا جاتا تھا مگر انگریزی طرز پر پیش کیا جاتا تھا۔ مثلاً آبگوشت کا رس شوربے (soup) کے طور پر پیش کیا جاتا تھا۔ پھر طبق ماز اور کباب کی دوسری گردش شروع ہو جاتی۔ اس طرح پانچ گردشوں (course) میں پانچ قسم کا عشائیہ (dinner) کھلایا جاتا تھا۔ وازوان میں گوشتابہ موجود[1] ہوتا تھا۔ کشمیری نان بائیوں کی بنائی ہوئی بھربھری روٹی بھی کھلائی جاتی تھی جو گھی کی وجہ سے لذت پیدا کرتی تھی۔ کشمیری زبان میں اسے گردہ کہتے ہیں۔ سبزیاں بھی پکائی جاتی تھیں۔ آخر پر میٹھا پکوان کھلایا جاتا تھا جو میری والدہ خود بناتی تھی۔ انہوں نے لاہور میں خانہ داری اور گھریلو انتظام کی تربیت پائی تھی۔[2] بسکو صاحب کی فرمائش پر پھر کشمیری چائے پلائی جاتی تھی جو سماوار میں تیار کی جاتی

۱۔ شامل کہنا بہتر ہے۔ آب گوشت، طبق ماز اور گشتابہ جیسے الفاظ کشمیری زبان کے ہیں اس لئے اسی طرح لکھے جاسکتے ہیں۔

۲۔ اُن کو حکومت نے لاہور بھیجا تھا تا کہ وہ خانہ داری اور گھریلو انتظام کی تربیت پا کر ثانوی مدرسوں میں طالبات کی بہبودی کیلئے زیادہ موثر رول ادا کر سکے۔ اُن کی اُردو اور انگریزی اچھی تھی، اتنی اچھی کہ حکومت نے سمجھ لیا تھا کہ اُن کی تربیت کارآمد ثابت ہوگی!

تھی۔ یہ چائے کوفی (Coffee) کانعم البدل ہوتی تھی۔

اب تک شاید واضح ہوا ہوگا کہ ہمارا گھرانہ دو حصوں پر مشتمل تھا۔ ایک طرف میرے والد مرحوم اور دوسری طرف والدہ مرحومہ! میرے دادے کا دادا حسنِ اتفاق سے مہاراجہ رنبیر سنگھ کا شاہی حکیم بن گیا تھا۔ اس کا بیٹا مہاراجہ پرتاپ سنگھ کا شاہی حکیم بنا تھا۔ اس نے اپنی ہمشیرہ کی شادی سید رضا سے کی تھی جو سید حسین قُمی کی اولاد تھے۔ سید صاحب قُم سے آئے تھے اور یہاں زینہ گیر سوپور میں بس گئے تھے۔ میرے دادا نے نجف، کربلا اور شام کا سفر کیا تھا۔ سماجیات پڑھ کر بعد میں مجھے اندازہ ہوا تھا کہ میرے اوپر دو طرف سے دو متضاد اثرات پڑ رہے تھے۔ دادا کی طرف سے مکمل مغربیت کا اور نانا کی طرف سے مشرق و مغرب کے حسین امتزاج کا۔ مگر ان شخصیتوں کے خدوخال کا فرق اور کبھی کبھی ٹکراؤ میری اپنی شخصیت میں سرایت کر گیا۔ شاید یہ فرق یہ ٹکراؤ اُن شعلوں کا سبب بنا جو بقول علامہ اقبال ذات میں سوز و ساز پیدا کرتا ہے اور پیش رفت کا دائمی سبب بن جاتا ہے۔ میں نے اس سوز و ساز کو بارہا حسّی اور جذباتی سطح پر بھی محسوس کیا ہے اور فکری سطح پر بھی۔ اس نے میری ذات میں رنگ رنگ کے پھول کھلائے ہیں!

ہمارا کنبہ اگرچہ مغرور نہیں تھا مگر مردوں کو فوراً غصہ آتا تھا۔ ایسا لگ رہا ہے کہ ہمارا گھرانہ کچھ کھو رہا تھا مگر آہستہ آہستہ۔ نانا ڈوگرہ شاہی میں چوٹی پر پہنچ گئے تھے۔ جاگیردارانہ وضع قطع اور ٹھاٹ باٹ میں رنگے ہوئے تھے۔ آغا مظفر، آغا افضل اور آغا جلال اُن کے پوتے اور ہم تین بھائی اُن کے نواسے۔ مظفر صاحب کی ایک ہمشیرہ بھی تھی جس کا نکاح پاکستان میں ہوا۔ ہم سب لڑکے فتحکدل سکول تانگے میں چلے جاتے تھے۔ ہمارے لئے چھ گھوڑے وقف کئے گئے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ کمرناگ کا سئیس غفار بٹ مرحوم ہمیں تانگے پر سکول لیتا تھا۔ وہ نسوار دانتوں پر ملتا اور ناک میں بھی چڑھاتا تھا۔ اُس کا تانگہ چلاتے چلاتے گنگنانا اور چھینک پر چھینک مارنا ہمارا سامانِ طرب تو مہیا کرتا تھا مگر ہماری

شرارتوں کا باعث بھی بن جاتا تھا۔ جوانی میں غفار کاکا میرے نانا کے پیچھے پیچھے میلوں دوڑتا تھا۔ اُن دنوں نانا سٹلمنٹ افسر (Settlement) تھے اور گھوڑے پر اِدھر اُدھر جاتے تھے۔[1] بعد میں غفار کاکا تانگہ چلانے لگے۔ جب شیخ عبداللہ کی تحریک آزادی چلی تو کشمیریوں نے اس تحریک آزادی میں جوش وخروش اور ولولے کے ساتھ حصہ لینا شروع کیا۔ مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ ہم میں اتنا جوش اور ولولہ نہیں تھا جتنا کہ لوگوں میں۔ اگر ہم حساس ہوتے تو لوگوں کے خواب ہمارے خواب ہوتے۔ یقیناً مہاراجہ ہری سنگھ کے ساتھ نانا کی وفاداری بے لاگ اور مسلّمہ تھی اور پھر مہاراجہ ہمارے گھر بھی آ گئے تھے۔ ایک اور بات یہ تھی کہ شیخ صاحب ایم، ایس، سی پاس کر کے نانا کے پاس نوکری کیلئے آئے تھے۔ نانا اُن دنوں ہوم اینڈ جوڈیشل منسٹر تھے۔ شیخ صاحب کو کم سے کم کمسٹری میں لیکچرر کا عہدہ مل سکتا تھا۔ نانا نے اُسے صاف کہہ دیا تھا کہ کوئی جگہ خالی نہیں اس لئے وہ کام نہیں دے سکتے۔ میرا خیال ہے کہ شیخ صاحب نے اپنے خاص جلالی لہجے میں نانا کے ساتھ بات کی ہوئی ہوتی۔ مگر ایک اور بات داؤد گورو کی ہے جو کنہ کدل سے ہمارے گھر دودھ لیکے آتا تھا۔ اس نے ایک دن مجھے دو پتے درختوں کے دکھائے اور کہا کہ ان پر ''شیر کشمیر'' لکھا ہوا ہے۔ میں آٹھ سال کا تھا۔ ۱۹۳۱ء، ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۳ء کے زمانے میں ایسی باتیں لوگوں کی زبان پر ہوتی تھیں۔ میرے دادا کا گھر کم سے کم سیاسی طور پر بالیدہ تھا۔ ان کے گھر میں، جس میں میرے والد اور میری والدہ بھی رہتی تھیں، لوگوں کے احساسات کی کافی جگہ تھی۔ میرے والد مرحوم اور ان کے چھوٹے بھائی چارلس ڈکنز کے ناول پڑھتے تھے۔ میرے دادا، میرے والد اور میرے چاچا ہمیشہ کتابوں کے بارے میں باتیں کیا کرتے تھے۔ میرے والد جمی ہوئی قدروں کو للکارتے تھے۔ وہ شکّی بھی تھے۔ خارجی صورت پر زیادہ زور نہیں دیتے تھے اور نہ یقین کرتے تھے۔ میں شیعہ اعتقادات کے بارے میں کچھ کہتا تو وہ

۱۔ اب نہ غفار بٹ ہے نہ اُس کا تانگہ۔ سب چیزیں جاگیرداری نظام کے ساتھ قبر میں گویا دفن ہوگئیں۔ ہم تو یا لال منڈی چلے گئے یا راجباغ مگر غفار بٹ بے چارا بدحواس ہوگیا!

کہتے کہ یہ لوگ بس دم بھرتے ہیں۔ کہتے یہ لوگ غلط راستہ اختیار کرتے ہیں۔ یہ ثابت کرنے کیلئے وہ مرثیوں سے حوالے دیتے۔ میرا خیال ہے کہ ہم نانا کے گھرانے کی دنیا داری اور مادّی خوشحالی کا جواب دیتے تھے، خاص کر دسترخواں پر! اس طرح آزاد خیالی اور علمی سُدھ بُدھ سے اپنی محرومیوں کا نعم البدل تلاش کرتے تھے۔ یہ گروپ ہم سے شکست کھاتا۔ ہم اپنی کامیابی سے اپنے پیر خوب جماتے تھے۔ یہ سب ٹھیک مگر میرے والد صاحب کا گھرانہ علمی اعتبار سے آگے تھا۔ ہم تین بھائی توفیق الٰہی کے مطابق اس علم دوستی پر خوب نازاں تھے۔ ہمارے نانا اپنی بیٹی (والدہ مرحومہ) کی صلاحیتوں کی خوب سراہنا کرتے تھے۔ جب میں نے آگرہ میں پہلا انعام جیت لیا اور خبر ''ڈان'' میں چھپی تو نانا نے مجھے لکھا ''تمہاری ماں نو سال کی تھی جب اچھا خاصا بحث کرتی تھی۔ تم نے بحث اُس سے ورثے میں لی ہے''۔ میرا خیال ہے کہ میرے والد پڑھے لکھے شخص تھے۔ پڑھنا لکھنا میرا جین (gene) ہے۔ نانا کی رفاقت اور ان کا علمی، ادبی اور ثقافتی ماحول میری صلاحیتیں اُبھارنے میں مددگار و معاون ثابت ہوا!

بارہ سال کی عمر میں جب میں گھر واپس آیا تو یہاں مختلف قسم کا ماحول پایا۔ ماحول علمی تھا ضرور مگر اس پر مغرب کا رنگ غالب تھا، شاید دادا کی وجہ سے۔ میرے والد بھی افلاطون پڑھتے تھے مگر رگوہ چاریہ (Raghvacharyia) کی رِگ وید بھی پڑھتے تھے۔ میرے دو بھائی بھی مغربی اثر قبول کر رہے تھے۔ کچھ سال کے بعد آغا ناصر صاحب علی گڑھ چلے گئے اور وہاں اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور کشمیر آ کر پہلے ڈپٹی کمشنر اور پھر کمشنر ہو گئے۔ اس کے بعد وہ ریاست سے باہر چلے گئے اور حکومت ہندوستان میں جوئنٹ سیکریٹری، ایڈیشنل سیکریٹری اور سیکریٹری ہو گئے۔ اس طرح انہوں نے سول سروس میں اپنا نام پیدا کیا۔ مرکزی حکومت میں کام کرنے کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ہندوستان سے باہر جانے کا موقع ملا اور اس طرح اچھا خاصا تجربہ حاصل کرنے کا۔ اپنی زندگی میں جب کبھی موقع پایا، لوگوں کی مدد کی، بہت

سوں کو نوکری حاصل کرنے میں دستگیری کی۔ ان کے اپنے بچے خاصے پڑھے لکھے ہیں اور ہندوستان سے باہر کام کر رہے ہیں۔ خاصی لیاقت اور اہلیت کے لوگ ہیں۔ اس وقت ناصر صاحب سرینگر میں مقیم ہیں۔ اُنہیں کرشنا مورتی کے ساتھ خاصی دلچسپی ہے جو اولاً میں نے ہی پیدا کی ہے۔[1] وہ ان کی کتابیں پڑھتے رہتے ہیں۔ آغا شوکت علی میرے دوسرے بڑے برادر ہیں۔ زمانے کی ناہموار روش کے باوجود وہ اپنی شخصیت برقرار رکھنے میں کامیاب رہے ہیں۔ علامہ اقبال کے ساتھ ان کی خاصی دلچسپی پیدا ہوئی ہے خاص کر اسرار خودی اور رموزِ بیخودی کے حوالے سے۔ ایک دفعہ یہاں سرینگر آئے اور رموز کی کاپیاں اپنی والدہ کے حوالے کر گئے۔ والدہ نے صاحبان علم و فراست میں وہ کاپیاں بانٹ دیں۔ اس طرح شوکت صاحب کا شوق[2] بھی پورا ہوا اور والدہ کی علمی دلچسپی بھی تسکین پا گئی۔

۱۔ ایک دن میں نے جسارت سے ناصر صاحب سے کہا کہ کرشنا مورتی سرینگر آئے ہیں اور کبوتر خانے میں تقریر کرنے والے ہیں۔ کیوں نہ وہ بھی آئیں اور تقریر سنیں۔ انہوں نے رضامندی ظاہر کی۔ تقریر سن کر ہی وہ کرشنا مورتی پر فریفتہ ہوئے۔ پھر یہ ہوا کہ جب کرشنا مورتی کلکتہ، مدراس یا اور کہیں تقریروں کا پروگرام بناتے، ناصر صاحب بھی اپنے دورے کا منصوبہ اس طرح بناتے کہ دورہ بھی ہوتا اور کرشنا مورتی کے لیکچر سے فیضیاب بھی ہوتے!

۲۔ ایک لطیفہ: جب آغا شوکت علی تعلیم حاصل کرنے کے بعد واپس آئے تو ایک دن بی ٹوون کی تعریف کچھ اس طرح کرنے لگے گویا بی ٹوون زندہ ہے۔ وہ تعریفوں میں مست تھے کہ میں نے کہا اس کی عمر کیا ہوگی۔ میں اُسے پھنسانا چاہتا تھا۔ پھر میں نے کہا کہ بی ٹوون نپولین کے زمانے کا شخص تھا۔ شوکت صاحب سے رہا نہ گیا۔ انہوں نے کہا ''بکواس بند کرو۔ مجھے پروفیسر خواجہ منظور نے کہا ہے کہ بی ٹوون ابھی زندہ ہے''۔ بعد میں میں نے سمجھ لیا کہ Rationalization کسے کہتے ہیں۔ یعنی منطق سے کسی چیز کو ثابت کرنا۔ اس پر ارک فرام کا ایک اور لطیفہ: ایک شخص نے کسی سے فانوس اُدھار لیا۔ جب اسے واپس کرنے کو کہا تو اُدھار لینے والے نے جواب دیا۔ ''پہلے یہ کہ میں نے کوئی فانوس ادھار ہی نہیں لیا۔ دوسرے یہ کہ وہ بالکل ٹوٹا ہوا تھا۔ تیسرا یہ کہ میں نے فانوس آپ کو واپس کیا ہے''۔ یاد رہے کہ مجھے پال برنٹن نے بی ٹوون سے متعارف کرایا تھا۔ شوکت صاحب کے بارے میں یہ بھی لکھیں کہ انہوں نے پرنسٹن میں "The Development of Central Asia" یعنی ''وسطِ ایشیاء کی ترقی'' کتاب لکھی تھی۔ شوکت صاحب بڑے فہیم، زگی اور خوددار ہیں۔

شوکت صاحب کو مجلس آرائی کا بھی خاصا شوق تھا۔ اس شوق کو پورا کرنے کیلئے کبھی اپنے دوستوں سے ملتے ہین اور کبھی دعوتوں کا انتظام کر کے ان کی صحبت سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اُن کی طبیعت ناصر صاحب کی طبیعت سے مختلف ہے۔ میرا خیال ہے کہ طبیعت بننے میں بچپن کا کافی اثر ہوتا ہے اور اس ماحول کا جو گھرانے میں، خاندان میں ہوتا ہے۔ ہمارا خاندان ماشاءاللہ جاگیردارانہ ٹھاٹ باٹ سے رچا ہوا تھا۔ میرے حصے میں مختلف نوعیت کے حالات آئے۔ نتیجہ یہ کہ اثرات بھی مختلف پڑے۔ ایک طرف نانا اور دادا جن کا مزاج مختلف، عادات مختلف، اطوار مختلف اور دوسری طرف میرے بھائی، میرے ممیرے بھائی اور دوسرے رشتہ دار! آغا جلال میرے ہم جولی تھے اور ہمیشہ میرا ساتھ دیتے رہے۔ ان کے ساتھ میں نے زندگی بھر اچھے ایام گزارے۔ ہمارے درمیان کبھی رقابت پیدا نہ ہوئی۔ آغا مظفر خاموش، حلیم الطبع اور بردبار ہیں۔ انہوں نے ریاست سے باہر لاہور میں تعلیم حاصل کی۔ یہاں کشمیر میں اچھے عہدوں پر فائز رہے۔ بخشی صاحب کے ساتھ ان کے اچھے تعلقات رہے۔ انہی کے زمانے میں وہ ٹرانسپورٹ کے کمشنر تھے۔ آخر پر چیف سیکریٹری بھی بن گئے۔ آغا مظفر اور آغا ناصر کے درمیان بچپن سے ہی رقابت تھی جو اعلیٰ تعلیم کے دوران تقریباً ناپید تھی مگر بعد میں پھر اُبھر آئی۔ ناصر صاحب بھی بخشی صاحب کے ساتھ اچھے مراسم نبھاتے رہے۔

آغا سید حسین مہاراجہ ہری سنگھ کے بہت شکر گزار تھے۔ مہاراجہ نے ہمارے گھرانے کو کافی فائدے پہنچائے تھے۔ ایک دن نانا نے مہاراجہ کو چائے کی دعوت دی۔ اچھا خاصا انتظام کیا گیا تھا چائے کا۔ نانا کے فرزند آغا سید احمد مرحوم کی شادی چند مہینے پہلے ہوئی تھی۔ اس دن نواب خسرو جنگ تشریف لائے یہ دیکھنے کیلئے کہ شامیانہ گل پوش ہے کہ نہیں۔ اس دعوت پر ایک سو پچاس سرکاری افسر بھی بلائے گئے تھے۔ یہ سب کے سب ہندو تھے۔ ان کے لئے علیحدہ انتظام کیا گیا تھا۔ آنجہانی چیف جسٹس سر برجور دلال عارضی طور پر وزیر اعظم

تھے۔ ابھی کرنل کالون (Colonal Colvin) نہیں آئے تھے اس لئے برجور دلال قائم مقام وزیراعظم تھے۔ مہراجہ نے جاتے جاتے برجور دلال سے کہا کہ آغا سید احمد کو گزیٹیڈ نوکری دی جائے۔ میرے ماموں نے دسویں تک تعلیم حاصل کی تھی۔ نانا نے ان کو علی گڑھ بھیج دیا تھا مگر وہ ایف ایس سی میں وہاں سے فیل ہو کے واپس آئے تھے۔ پھر ان کو لائل پور اگریکلچر کالج بھیج دیا گیا تھا مگر وہاں سے بھی ناکام ہو کر لوٹ آئے تھے۔ پھر ان کے لئے ایک مولوی صاحب کو اتالیق بنایا گیا تھا تاکہ ماموں کو اُردو پڑھائیں اور ''ادیب عالم'' کیلئے تیار کریں۔ امتحان جو ہوا تو ماموں صاحب حسب معمول فیل ہو گئے۔ مگر مولوی صاحب خود بھی امتحان میں بیٹھے۔ جب اس کے بارے میں ماموں سے دریافت کیا گیا تو معلوم ہوا کہ مولوی صاحب خود بھی فیل۔

گر ہمیں مکتب است ہمیں ملّا
کارِ طفلاں تمام خواہد شد

یہ تو تعلیم کا حال تھا مگر ماموں سرکاری افسر کی حیثیت سے بہت کامیاب رہے۔ خیر برجور دلال نے آغا سید احمد کو اسسٹنٹ رجسٹرار کوآپریٹو بنایا۔ پہلے ان کو گرداسپور اور پھر بمبئی بھیج دیا گیا۔ ماموں نے دو سالہ ٹریننگ کورس کے دوران اپنی گھر والی اور خدمت گار کو ساتھ اٹھایا۔ اُن دنوں وہ دو سو روپے ماہوار تنخواہ لیتے تھے۔ بمبئی میں وہ اپنی گھر والی کے ساتھ ایّام تو گذار رہے تھے مگر کشمیریوں سے بھی ملتے تھے۔ جب واپس آئے تو اچھا کام کرتے رہے۔ وقت پر رجسٹرار کوآپریٹیوز ہو گئے پھر سیکریٹری بن گئے۔ انہوں نے تعلیم، صحت، اور جنرل ایڈمنسٹریشن میں سیکریٹری کی حیثیت سے اچھی خاصی خدمات انجام دیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد صادق صاحب کے زمانے میں پارلی منٹ کے ممبر بن گئے۔ دوبارہ پھر پارلی منٹ کیلئے چنے گئے۔ اس طرح دس سال پارلی منٹ میں رہے۔ آغا صاحب صادق صاحب کے ہم جماعتی تھے مگر تھے بہت ہی عمدہ شخصیت کے مالک۔ میری زندگی پر

ان کی شخصیت کا خاصا اثر پڑا رہا۔

نانا ریٹائر تو ہو گئے تھے مگر جموں جانا بند نہیں ہوا تھا۔ سردیاں ان کی صحت پر بُرا اثر ڈالتی تھیں۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ جموں جانے کی تیاری ہو رہی تھی تو نانا نے اپنی گھر والی سے پوچھا۔ ''سامان تو باندھ لیا گیا مگر آپ اس سال کون سے زیورات ساتھ لے رہی ہیں؟'' زیورات اس لئے ساتھ لئے جاتے تھے کہ وہاں جموں میں بھی کبھی کبھی باہر جانے کے مواقع آتے تھے اور زیورات پہننے پڑتے تھے۔ نانی کم ہی زیورات ساتھ لیتی تھی کیونکہ اس طرح نئے زیورات ملتے رہتے تھے۔ اس سال نانا نے زیورات کی بات اس لئے چھیڑ دی تھی کہ ریٹائر ہو گئے تھے اس لئے نئے زیورات خرید نہیں سکتے تھے۔ نانی نے جونہی آغا صاحب کی بات سنی تو خفا ہو گئی۔ کہا کہ وہ جائیگی ہی نہیں۔ آغا صاحب بھی کچھ کم نہ تھے۔ موٹر نکالی اور چل دیئے۔ میرے خواب، میری تمنائیں لُٹ گئیں اور میں رونے لگا۔ میں چھوٹا تھا اس لئے معاملہ سمجھ میں نہیں آیا۔ میری ماں کا بھانجا آیا اور اس نے مجھے سائیکل لا کے دیدی۔ اس میں لکڑی کے پائیڈل لگائے گئے تھے تا کہ میں سیکھ سکوں۔ سائیکل سیکھتے سیکھتے میری خوشیاں لوٹ آئیں۔ اب سمجھتا ہوں کہ نانا اور نانی کے قضیے کی بنیاد سماجی بھی تھی اور نفسیاتی بھی۔ اُن دنوں ہمارے گھر کی عورتیں ناخواندہ ہوتی تھیں۔ زیادہ سے زیادہ کسی نے قرآن پاک کی تلاوت سیکھی اور گلستان اور بوستان کے کچھ سبق پڑھے۔ ہمارا گھرانہ متمدن گھرانہ تھا اس لئے اس حد تک بھی جانا ممکن تھا ورنہ عورتوں کی تعلیم کہاں؟ صرف میری والدہ نے انگریزی پڑھی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میری اپنی نانی کے وفات کے بعد نانا نے ایک آئرش خاتون کو اس کی دیکھ بال اور تعلیم کے لئے مقرر کیا تھا۔ وہ روز اسے پڑھانے کیلئے آتی۔ جب ماں استانی بن گئی اور خوب پڑھا لکھا تو اچھے لوگوں کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا بھی نصیب ہوا اور جدید زندگی سے بھی فیض اٹھانے کا موقعہ آیا۔ بارگاہِ الٰہی سے جو علمی اور فکری دولت اور سُدھ بُدھ اسے حاصل ہوئی وہ آجکل کی عورتوں کیلئے بھی تمنا کا مینار

ہے۔ اس سے مراد یہ کہنا ہے کہ میاں اور بیوی کے درمیان اب جس نوعیت کے رشتے ہوتے ہیں اُن دنوں ایسے رشتے یا تو سرے سے ہی ناممکن تھے یا بہت ہی کم یاب!

زندگی میں مسائل کا سامنا ضرور کرنا پڑتا ہے کیونکہ زندگی کانٹوں کی سیج ہے اگرچہ اس میں پھول بھی کھلتے رہتے ہیں۔ ہمارے گھرانے میں بھی مسائل ضرور تھے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ایک دن میری والدہ نے اپنی جائیداد کے عوض (جو اسے بیٹی کی حیثیت سے ملنے والی تھی) اپنے باپ سے شوہر کیلئے موٹر مانگی۔ یہ ۱۹۳۲ء کا زمانہ تھا۔ ان دنوں میرے والد گونر کے دفتر میں سپرانٹنڈنٹ تھے۔ روز وہ ایک دو ناول ساتھ لے جاتے اور اپنے دفتر میں پڑھتے۔ خیر ان کے لئے سٹنڈرڈ۔ ۹ موٹر لائی تو گئی مگر آغا سید محمود پر گراں گزرا۔ وہ تو اصلی جاگیردار تھے اور نانا کے بڑے فرزند۔ خود بصارت کھو چکے تھے اس لئے مظفر سے کہا کہ وہ اپنے دادا کو خط لکھیں۔ مظفر اُن دنوں سولہ سترہ سال کا لڑکا تھا۔ اس نے نانا کو خط لکھا کہ کیا وہ موٹر کے لائق نہیں۔ بس کیا ہوا کہ یہ خط پڑھ کر نانا ایک ہفتے کیلئے سخت سر درد میں مبتلا رہے۔ اگر بڑے ماموں نابینا نہ ہوتے تو وہ شاید اتنے حساس نہ ہوتے اور مظفر بھی عدم تحفظ کا شکار نہ ہو جاتا۔ تاہم آغا افضل اور آغا جلال بھی محمود صاحب کے فرزند تھے۔ حیرانگی کی بات ہے کہ ان کے تعلقات میرے ساتھ کبھی کشیدہ نہ رہے بلکہ ہمیشہ بہت ہی اچھے رہے۔ رقابت کا سوال کبھی پیدا ہی نہ ہوا۔ دوسری مثال یہ ہے کہ ۱۹۴۴ء میں میری نانی اپنڈی سائٹس کی وجہ سے بیمار ہوگئی تھی۔ اس کا آپریشن ڈائمنڈ وکٹوریا ہسپتال نواکدل میں کیا گیا تھا۔ نانا روز اس سے ملنے ہسپتال جاتے تھے۔ آغا مظفر صاحب اب اسسٹنٹ سپرانٹنڈنٹ پولیس ہو گئے تھے۔ اس نے نانا سے گاڑی مانگی تھی۔ نانا نے کہا تھا کہ پٹرول راشن پر ملتا ہے اور اس کو روز ہسپتال جانا پڑتا ہے اس لئے گاڑی درکار ہے۔ بس اسی پر مظفر لڑ پڑے تھے۔ اُن دنوں ٹیلی فون جس کمرے میں ہوتا تھا اس میں سب لوگ بیٹھتے تھے۔ مظفر صاحب تب تک فون نہ اٹھاتے تھے جب تک نانا وہاں سے اُٹھ کے اپنے کمرے میں

نہ جاتے۔ یہ باتیں نانا کو ناگوار ہوتی تھیں۔ انہوں نے سوچا ہوگا کہ اپنی گھر والی کو لیکر شیو پورہ مکان میں جائیں گے۔ میری والدہ نے معاملے کی نوعیت سونگ لی ہوتی اس لئے اپنے باپ کو خط لکھا جو میں نے نانا کے پاس پہنچایا۔ نانا نے اس خط کا جواب میرے ہی حوالے کیا اور میں نے والدہ کے حوالے کیا۔ اس خط میں نانا نے لکھا تھا:

"بیٹی! ایک طرف میرے بس کی بات نہیں کہ ایسے حالات کے ساتھ سمجھوتہ کروں جن کے ساتھ سمجھوتہ کرنا لازمی ہے۔ دوسری طرف اس خیال کے ساتھ مجھے نفرت ہے کہ اپنے مصیبت زدہ فرزند کو بے یارومددگار چھوڑوں۔ پس پریشانی دور کرو۔ میں سوچے سمجھے بنا کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گا۔"[1]

اسی سال ۲۱ نومبر کو ان کی دماغی رگ پھٹ گئی۔ (Cerebral Haemorrhage) اور پانچ دن کے بعد آغا سید حسین ہوم اینڈ جوڈیشل منسٹر اس دارِفانی کو رخصت کر کے چلے گئے!

دنیا نے راہ فنا میں دیا ہے کس کا ساتھ
تم بھی چلے چلو یونہی جب تک چلی چلے

چھبیس نومبر ۱۹۴۴ء آغا سید حسین رحلت فرما گئے مگر انہیں اس وقت سرینگر لایا نہیں جا سکا۔ صندوق میں ان کی میت بند کر دی گئی اور وہاں ہی لاہور میں، جہاں وہ وفات پا چکے تھے، سپرد خاک کی گئی۔ تاہم چھ مہینے کے بعد ان کی قبر کھول دی گئی اور ان کی میت سرینگر لائی گئی۔ میں جامعہ سے آیا۔ مظفر صاحب بھی آ گئے اور آغا سید احمد بھی۔ ہم نے ان کی میت بس میں لائی۔ سرینگر میں آغا صاحب مرحوم کے ہزاروں شائقین کا ہجوم جمع تھا۔ نہایت شان سے دوبارہ جنازہ پڑھا گیا اور لوگوں نے دعائیں مانگ مانگ کر انہیں خراج

1. "Daughter, on the one hand I find it hard to put up with what I have to, on the other hand I hate to abondon my afflicted son. Set your mind at rest. I am taking no precitipate step".

عقیدت پیش کیا اور رخصت کر دیا۔ آغا صاحب کی طرح میرے دادا آغا شیر علی کچھ کم پایے کے نہ تھے۔ جب ان کی وفات ہوئی تو مقصود علی صاحب کے بڑے برادر فدا علی صاحب نے دیکھا کہ گھر پر ان کے کفن دفن کیلئے کوئی موجود نہیں۔ اس نے شکارے میں ان کی میّت آبائی قبرستان خانقاہ سوختہ پہنچائی۔ وہاں اُنہیں سپرد خاک کیا گیا۔ میں اس وقت جامعہ میں تھا۔

میں نہ غیر معمولی ذہین طالب علم تھا اور نہ چالاک مگر سکول میں اور سکول سے باہر پڑھنے لکھنے سے اور صاحبان علم وفن کی دستگیری سے دنیائے علم و دانش کے ساتھ میری وابستگی قائم ہوئی۔ فتح کدل مشن سکول کا شاندار کام بھلایا نہیں جاسکتا۔ اس مدرسے نے میری زندگی پر ہر لحاظ سے پہلا گہرا اثر ڈال دیا۔ مشن سکول کی اہمیت سے کوئی انکار کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ کینن بسکو کے ہاتھوں اس مدرسے کی بنیاد پڑے تو کیا کہنا۔ بسکو صاحب کا کشمیریوں کے اوپر بڑا احسان ہے۔ وہ اس لئے اسے عزت سے پادری صاحب کے نام سے پکارتے تھے۔ انہوں نے یہاں کی روایتی تعلیم سے ہٹ کر باضابطہ سکولی تعلیم کا آغاز کیا۔ یہ روایتی تعلیم یا مکتبوں اور پاٹھ شالوں یا گھروں میں دی جاتی تھی۔ عام طور پر ان میں مولوی اور پنڈت کام کرتے تھے جو زیادہ سے زیادہ بنیادی تعلیم سے عام طور پر آراستہ ہوتے تھے۔ گھروں میں یہی مولوی، پنڈت پڑھانے آتے تھے یا والدین پڑھاتے تھے، خاص کر باپ۔ پس بسکو صاحب کی وجہ سے ہی تعلیم باضابطہ ہوگئی اور تعلیمی نظام کی بنیاد پڑی۔ انہوں نے گہرائی اور گیرائی دونوں اعتبار سے تعلیم کا دائرہ بہت وسیع کیا۔ اتنا وسیع کہ آج بھی ان کی کوششوں کو مینار نور (Light House) کی حیثیت سے دیکھا جاسکتا ہے۔ بسکو صاحب کے فتحکدل مدرسے میں سب کے سب استاد درس و تدریس یا دوسرے تعلیمی کاموں، مشاغلوں میں دل لگائے بیٹھے تھے۔ ربط وضبط خاصا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ مدرسے نے ہماری ہمہ گیر زندگی بنانے کا بیڑا اُٹھایا تھا۔ بسکو بائز (Biscoe

(Students شام کے وقت جھیل ڈل میں کشتیاں چلانے جاتے تھے یا نہانے۔ یا پریڈ گراؤنڈ بٹہ مالو میں فٹ بال، ہاکی، کرکٹ کھیلتے تھے۔ اُن دنوں بٹہ مالو پریڈ گراونڈ کے بغیر کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں ہم کھیل سکتے تھے۔ تیراکی اور ناو بانی کے علاوہ پہاڑوں پر چڑھنا، ان پر نئی نئی راہیں کھولنا، مکّہ بازی کے کرتب دکھانا اور کھیلوں میں حصہ لینا مدرسے کی زندگی کا معمول تھا۔ اُن دنوں سرینگر میں بھی تپ دق کے مریض ہوا کرتے تھے۔ بسکو بائز اُنہیں کشتیوں میں بٹھاتے اور ڈل جھیل کی سیر کراتے تاکہ کھلی ہواؤں اور فضاؤں سے اُن کی صحت پر اچھا اثر پڑے اور ان کی کم زیادہ دل بہلائی بھی ہو جائے۔ مکانات عام طور پر لکڑی سے بنتے تھے۔ اس وجہ سے بھی آگ کی وارداتیں عام تھیں۔ اگر شہر میں کہیں بھی آگ لگ جاتی بسکو بائز اسی وقت سب سے پہلے جائے واردات پر حاضر ہو جاتے اور آگ بجھانے میں جو کھم بھی اٹھاتے۔ ''ہر رنگ میں انسان بنو''[1] مدرسے کا نصب العین تھا۔ اس نصب العین میں جسمانی، عقلی و فکری اور روحانی تعلیم[2] کے عناصر موجود تھے۔ استاد بھی تن من سے اس کام میں جٹے ہوتے تھے۔ طالب علم تو رات دن اس نشے میں شرابور ہوتے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ بسکو صاحب اور اس کے استاد ہر جگہ، ہر وقت، ہر طالب علم کے ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ یہ ماحول، یہ تربیت، یہ کردار سازی ایک مثالی چیز تھی۔ ابھی بھی ہم اس مثالیت کا اثر محسوس کر رہے ہیں۔ ۱۹۳۷ء میں میں نے دسویں کا امتحان پاس کیا۔ اس سال کوئی بھی طالب علم فسٹ ڈویژن میں کامیاب نہ ہوا۔ سخت محنت کے باوجود بسکو کے معیار تک پہنچنا کتنا مشکل تھا۔

ہائی اسکول پاس کر کے میں نے ایس پی کالج میں داخلہ لیا۔ خیال تھا کہ سائنس پڑھوں مگر گیارہویں جماعت میں فیل ہوا۔ پھر آرٹس کی تعلیم شروع کی۔ میں نے لاہور میں ایک انگریز جرّاح کرنل بواٹ (Colonal Bott) کو نانا کی جرّاحی کر کے دیکھا تھا۔ مگر میں

1. "In all things be men"
2. "Education for body, mind and soul"

گیارہویں میں مینڈک کا جسم بھی چاک نہ کرسکتا تھا۔ سائنس ترک کرنا تو پڑا مگر اس سے کوئی منفی اثر میری زندگی پر پڑا نہیں۔ اگر کسی تکنیکی ہنر میں پھنس گیا ہوتا تو وسیع علم وادب کی دنیا کے رنگا رنگ محل خانوں کی سیر سے ہاتھ دھویا ہوتا۔ کالج کی زندگی میں ہی میری نظر ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم پر پڑ گئی۔ آپ آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کے سلسلے میں سرینگر آئے تھے۔ سر جون سارجنٹ ماہر تعلیم بھی کانفرنس میں شریک تھے۔ کانفرنس ایس پی کالج کے بڑے کشادہ صحن میں ہوئی۔ پہلے دن نمائش کا افتتاح ہوا۔ پرائم منسٹر آنجہانی گوپال سوامی آئینگر نے اس کی صدارت کی۔ ذاکر صاحب نے افتتاحی تقریر کی۔ ذاکر صاحب کی زباں فصیح، بلیغ اور شستہ، انداز بیان نرالا مگر جھنجھوڑنے والا[1]۔ پہلی دفعہ تقریر سنی اور پہلی ہی دفعہ ذاکر صاحب سے عشق ہوگیا۔ سیدھا سادھا مگر بناوٹ سے مبرّا۔ آئینگر نے بھی صدارتی تقریر کی۔ بہت اچھی[2] مگر ذاکر صاحب کی تقریر سُن کر محسوس ہوا کہ کسی طوفان نے اپنی آغوش میں لیکر مجھے زمین سے اُکھاڑ دیا۔ میں نے تاریخ کی کتابوں میں جو کچھ پڑھا تھا وہ ان کے قدموں میں ڈھیر ہوگیا۔ میری ذہنی سطح یکا یک بلند ہونے لگی اور میں پرواز کرنے لگا۔ میں گھر سے بیزار ہو ہی گیا تھا۔ وہاں ایسی کوئی چیز تھی ہی نہیں جو میرے جنوں کو سنبھال سکتی تھی اور میری حساس طبیعت کو للکار سکتی تھی۔ ذاکر صاحب نے داؤ کھیلا اور میں بازی ہار گیا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے ان کے ساتھ ملاقات کا بندوبست کیسے کیا مگر اتنا تو یاد ہے کہ وہ خواجہ غلام السیدین صاحب مرحوم کے پاس ٹھہرے ہوئے تھے۔ سیدین صاحب کی رہائش گاہ ایکس چینج روڈ پر اسی جگہ تھی جہاں آج کل ریڈ کراس کا دفتر ہے۔ میں تقریباً تین

ذاکر صاحب کی تقریر کے کچھ بول:

1. As one of the numerous conventional futilities it seems one cannot altogether escape, I would much rather go through it with a speed that would not let it assume the dignity of a ceremony.
2. To have Dr. Zakir Hussain to inaugurate the All India Educational Exhibition is more than a mere conventional futility."

(گوپال سوامی آئینگر کے کچھ جوابی کلمات ملاحظہ فرمایئے)

بجے ان کی رہائش گاہ پر چلا گیا۔ وہ آرام فرما رہے تھے مگر بستر سے اُٹھے اور مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ''آپ کون ہیں اور آپ کا شغل کیا ہے؟'' میں ہکا بکا کچھ کہے بنا وہاں سے چل نکلا۔ ذاکر صاحب کا گویا سحر چھا گیا۔ آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کے بعد ۱۲ اکتوبر کو جموں و کشمیر سٹوڈنٹس فیڈریشن کے جلسے میں ذاکر صاحب نے صدارتی تقریر کی۔ اس سے ان کا اثر دوگنا ہوگیا۔ اس تقریر کا لفظ لفظ ابھی تک اس عمر میں بھی میری یادداشت میں محفوظ ہے۔ انہوں نے فرمایا:

''نوجوان دوستو! آپ کی بہت مہربانی کہ آپ نے مجھے معاملات کی صدارت کرنے کی دعوت دی۔ شاید آپ کا مقصد ہے کہ میں لمبی سی تقریر کروں اور اچھی سی۔ یہ نہ ہو پائیگا اور اس طرح آپ کی امید بر نہ آئیگی۔ میری صحت مجھے اجازت نہیں دیگی کہ میں لمبی تقریر کروں اور میری کوتاہیوں کی وجہ سے میری تقریر اچھی نہیں ہو پائیگی!

خوش قسمتی سے میں اس حاجت کو نیکی میں بدل ڈالوں گا مگر میں آپ کی ستائش نہیں کروں گا۔ میں آپ سے نہ کہوں گا کہ جوانی سب کچھ ہے۔ آپ کے ملک کا یا یوں بھی کہئے کہ سارے عالم کا مستقبل آپ کے ہاتھوں میں محفوظ ہے۔ آپ سے امیدیں وابستہ ہیں اور امیدِ وفا بھی۔ افسوس کہ آپ سے پہلے بھی بہت سوں نے جوانی کے عالم میں امیدوں کے پُل باندھے جو بنے نہیں اس لئے اپنی داستان چھوڑ گئے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ آج کی اُبھرتی ہوئی جوانی کا مستقبل کیا ہوگا مگر اس کی نوعیت ضرور مختلف ہوگی۔ ہمارے نوجوانوں کو قدم بڑھانے ہونگے اس احساس کے ساتھ کہ زندگی محض لفظوں کا کھیل نہیں اور نہ ترکیبات کی سحر انگیز دلربائی! یہ نہ عیاری ہے نہ مطلب پرستی۔ اسے نفع نقصان کا واصل باقی

نہیں کہا جاسکتا۔ اور نہ سرکاری ملازمت کا تحفظ۔ اس کا محور درد نہیں اور نہ انبساط بلکہ عروج و زوال، خودی و بے خودی، شریف النفسی و کثافتِ طبع، قدر اور بے قدری ہے۔ زندگی حقیقت ہے، سختی ہے، سنجیدگی ہے، بلند سے بلند مقاصد کے حصول کی سعی ہے، خدمت ہے، مقصد روزگار ہے، عبادت ہے۔ زندگی، استعداد نہیں، عنایت ہے۔ ہوش! کہیں یہ عنایت ضائع نہ ہو جائے۔[1]

ایس پی کالج سرینگر میں اکثر طالب علم پنڈت گھرانوں سے آتے تھے۔ جب میں نے ۱۹۳۷ء میں کالج میں داخلہ لیا تو ہندوؤں کی تعداد ۱۷۰ اور مسلمانوں کی تعداد صرف ۱۵۰ تھی۔ چند ایک طالب علم سائیکلوں پر کالج آتے تھے، باقی سب کے سب پیدل۔ ہندو لڑکے بڑے ذہین، صاف ذہن والے، ذکی اور محنتی ہوتے تھے۔ ان کے گھرانوں میں پڑھنے لکھنے کا ماحول ہوتا تھا اور وہ معاشی اعتبار سے اچھے گھرانوں سے آتے تھے۔ ڈوگرہ شاہی کے اکثر کارندے بھی کشمیری پنڈت تھے جو معاشی اعتبار سے بڑے خوشحال تھے۔

1 Young Friends! It is very kind of you to ask me to preside over your deliberations. But if in asking me to do so you want me to make a long speech or a good one, I shall have to disappoint you. I must abstain on medical grounds from making a speech, and my personal limitations will see to it that I don't make a long one.
Fortunately, I can turn this necessity into a virtue. I shall refrain from flattering you. I would not tell you that youth is everything, that the future of your country, nay the future of the world, is safe in your hands; you are the promise, you are the hope because I know that others have been young before you, their story, alas, is a sad tale, of hopes unfulfilled and promises unrealized. Nobody can predict the story of the generation that is now growing. But if it has to be different, our young men will have to stand by realizing that life is not composed of mere words. It is more than the glammer of the pharse. It is not just trickery, it is not just self-seeking, life is not a balance-sheet of personal profit and loss, it is not a secure post in a government office. The axis on which life rotates is not the axis of pleasure and pain, but the axis of progress and retrogression, of self realization and self-degradation, of the noble and the ignoable, of the worthy and the unworthy. Life, young friends, is hard, life is earnest, life is striving for ever higher ends, life is service, life is mission, life is worship, life young frinds, is not an attainment, it is an apportunity, don't let the apportunity go by.

کچھ لوگ تو ان میں فارسی ادبیات سے بھی واقف تھے جس سے ان کے ذہن کے دریچے کھُل گئے تھے اور وہ عالمانہ سُدھ بُدھ رکھتے تھے۔ اس کے مقابلے میں کشمیری مسلمان بہت پیچھے تھے۔ نہ ان کی معاشی حیثیت ٹھیک تھی اور نہ علمی۔ ہندوستان میں تحریک آزادی شروع ہو چکی تھی اور ہندوستان اور پاکستان کے تصوّر نے بھی جنم لیا تھا۔ یہاں ایس پی کالج کے مسلمان طلبا اپنی کمزوریوں کے مدّنظر ہندو مُسلم نظریے سے فائدہ اٹھانے لگے تھے۔ اسی زمانے میں ایک دن آنجہانی پروفیسر برج کشن مدن کلاس میں آئے اور کہا کہ آغا اشرف بہت ذہین لڑکا ہے۔ اس لئے وہ تاریخی سوسائٹی (Historical Society) کا سیکریٹری ہوگا۔ برج کشن مدن کا یہ کہنا کہ آناً فاناً نوے فیصد طلبا کلاس سے واک آوٹ (walk out) کر گئے۔ سارے کالج میں اسی وقت واک آوٹ کا چرچا ہونے لگا۔ کچھ مسلمان لڑکے جن کے ساتھ میں مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو کے بارے میں باتیں کیا کرتا تھا، مجھے طعنے دینے لگے۔ میں نے ۱۵۰ طالب علموں کو کالج کے احاطے میں جمع کیا اور زوردار تقریر کی۔ سبھاش چندر بوس نے گاندھی جی کے خلاف کانگریس میں ایک محاذ بنایا تھا جس کا نام ترقی پذیر محاذ (Forward Block) پڑ گیا تھا۔ میں نے ''محاذ'' کا تصوّر قبول کیا اور ایس پی کالج میں مسلمان طلباء کا محاذ کھڑا کیا۔ اس کا نام میں نے مُسلم بلاک رکھا۔ میں نے یکے بعد دیگرے تین لیکچر کئے۔ سید میر قاسم مرحوم میرے سیکریٹری، میر غلام محمد راجپوری اسسٹنٹ سیکریٹری اور شہداد صاحب خزانچی بن گئے۔ ان دنوں بھی ایس پی کالج بڑا حساس کالج مانا جاتا تھا۔ شیخ محمد عبداللہ، بخشی صاحب وغیرہ نے سن لیا تھا کہ میں کیا کر رہا تھا۔ شیخ صاحب نے بخشی صاحب کو ہدایت دی تھی کہ اشرف کو سمجھایا جائے۔ بخشی صاحب نے مجھ سے کہا کہ ذاکر حسین صاحب تشریف لا رہے ہیں، خطاب کر رہے ہیں، اس لئے ایسا نہ ہو کہ کوئی ناموزون واقعہ پیش آئے۔ ذاکر صاحب آئے اور عجب یہ کہ انہوں نے ایس پی کالج میں میرا دل ہی لے لیا۔ میری سوچ ہی بدل گئی مگر میں

اپنے ذہنی کواڑ رنگ رنگ کھولنے لگا۔ ذاکر صاحب قلب ونظر پر چھا گئے۔ ادھر کچھ وقت کالج کے سٹاف روم پر سناٹا چھایا رہا مگر جب گرمائی چھٹیاں شروع ہوئیں تو دو پروفیسر صاحبان کو میرے والدین کے پاس بھیج دیا گیا۔ اُن دونوں اوتار کرشن کچلو پرنسپل تھے۔ میرے والدین کو کہا گیا کہ اگر اشرف مُسلم بلاک توڑے گا نہیں تو اسے کالج سے خارج کیا جائے گا۔ مجھ پر دباؤ پڑ گیا اس لئے میں نے بلاک توڑ دیا۔ اس پر علی الاعلان مجھ کو "غدار" کہا گیا۔

ایس پی کالج کے دنوں کا ایک اور واقعہ! میں فائنل ییر میں تھا۔ لوکیش دربھی کالج کا ایک طالب علم تھا مگر ذہین۔ اس کے والد پنڈت ایس ایل درکالج کے پروفیسر تھے۔ لوکیش میرے ساتھ ٹینس وغیرہ کھیلتا تھا اور میرا دوست تھا۔ ہم دونوں آل راونڈ بیسٹ گریجویٹ میڈل کے امیدوار تھے۔ میں نے ایک دن لوکیش کو اپنے گھر بلایا۔ کھانے پر بات چیت کے دوران لوکیش کو بتایا کہ گریجویٹ میڈل مجھے ملے یا اُسے مگر اُس سے ہمارے تعلقات میں رخنہ نہیں پڑنا چاہیے۔ ہم نے امتحان پاس کیا۔ لوکیش میری طرح سکنڈ ڈویژن میں نہیں، تھرڈ ڈویژن میں پاس ہوا۔ اُنہی دنوں ایس پی کالج دو کالجوں میں بٹ گیا اور اس طرح امر سنگھ کالج وجود میں آیا۔ ڈاکٹر تاثیر جیسے باوقار پرنسپل چلے گئے۔ خلیفہ عبدالحکیم جیسے نامور شخص کے بارے میں افواہ تھی کہ وہ کالج کے پرنسپل کا عہدہ سنبھالیں گے مگر وہ ابھی نہیں آئے تھے۔ یہ وہی خلیفہ ہیں جنہیں اقبال پر غیر معمولی دسترس حاصل ہے۔ خلیفہ کی دانشمندی اور دانشوری بھی غیر معمولی حیثیت رکھتی ہے۔ بہرحال لوکیش صاحب کے حق میں میڈل کی سفارش کی گئی اور مجھے محروم کر دیا گیا۔ سٹاف میں چار پانچ مسلمانوں کے سوا سب غیر مسلم پروفیسر تھے۔ انہوں نے سوچا تک بھی نہیں کہ سکنڈ ڈویژن والے کو چھوڑ کر تھرڈ ڈویژن والے کو میڈل کا حقدار کیسے ٹھہرایا جائے۔ پروفیسر جے ایل کول مانے ہوئے انگریزی کے استاد تھے۔ وہ بعد میں میرے قریبی رفیق بن گئے۔ اُنہیں پروفیسر غلام السیدین نے قابلیت کی بنیاد پر میرپور انٹر میجیٹ کالج کا پرنسپل بنا کے بھیجا۔ مجھے

اب بھی پروفیسر کول کی علم دوستی پر فخر ہے۔ انہوں نے ہی پڑھنے لکھنے کا شوق مجھ میں پیدا کیا۔ ایک دن ''آندرے موروا'' کی کتاب ائریل (Ariel) مجھے پڑھنے کیلئے دی۔ یہ کتاب مشہور زمانہ شاعر پی، بی شیلے کی زندگی پر لکھی گئی ہے۔ کول صاحب خوش طبع اور مجلس آرا تھے۔ پروفیسر ایس ایل در کے ہمسائے تھے۔ بعد میں ان کے فرزند کی شادی پنڈت ایس ایل در کی صاحب زادی یعنی لوکیش کی بہن کے ساتھ ہوئی۔ بہر کیف میں نے میڈل کی سفارش کا معاملہ سُنا۔ فریادلے کے پروفیسر غلام السیدین کے پاس چلا گیا۔ سیدین صاحب ڈائریکٹر ایجوکیشن بھی تھے اور تعلیم کے سربراہ بھی۔ انہوں نے کہا کہ وہ مداخلت نہیں کر سکتے مگر میں نے اصرار کیا کہ میں میڈل کا زیادہ حقدار ہوں۔ اسی دن قریباً تین بجے پرنسپل ایس پی کالج کو سیدین صاحب کا خط ملا۔ اس میں آل راونڈ بیسٹ گریجویٹ میڈل ملتوی رکھنے کو کہا گیا تھا۔ یہ ایوارڈ آج تک ملتوی ہے۔ اب ہم پھر واپس جا کر جائزہ لیں گے کہ اس وقت ایس پی کالج میں خدا خدا کر کے صرف ۱۵۰ مسلمان طالب علم تھے۔ میں دنیا کی تاریخ شوق سے پڑھتا تھا۔ نہرو اور گاندھی پر علمی نظر رکھے ہوئے تھا۔ ۱۹۴۰ء کے قریب پنڈت جی اور شیخ صاحب کو سرینگر میں کندھے سے کندھا ملا کے چلتے دیکھا تھا۔ تاہم جب ایس پی کالج کے گھناؤنے تعصب سے واقف ہو گیا، میں ہکا بکا رہ گیا۔ قائد اعظم جناح نے ۱۹۴۰ء میں لاہور ریزولیوشن پاس کیا تھا۔ اس کے بعد پروفیسر برج کشن مدن نے مجھے ہسٹری سوسائٹی کا سیکریٹری بنایا تھا جس پر واک آوٹ ہوا تھا۔ مجھے ''نہرو کتنا عظیم لیڈر ہے اور کانگریس کتنی شاندار جماعت ہے'' کے طعنے روز سننے پڑتے تھے۔ میں غدار بھی بن گیا تھا۔ مجھے بورژوا ذہنیت کا مرتکب بھی ٹھہرا گیا تھا۔ مگر میڈل کی سفارش تھرڈ ڈویژن والے لوکیش در کے حق میں کی گئی تھی!

یہ ایس پی کالج کے ایام کی حقیقت تھی مگر مجھے لوکیش در کے ساتھ نہ کوئی دشمنی پیدا ہوئی اور نہ رقابت۔ اگر میں سیاست میں ذرا گہرائی سے چلا جاؤں تو کہوں گا کہ پنڈت ہشیار مغز

تھے اور بہت قلیل تعداد میں کشمیر میں رہتے تھے۔ وہ تسلیم نہیں کرتے تھے کہ اپنے علاوہ کسی اور کی ترقی اور بھلائی کے بارے میں سوچیں۔ کشمیر میں شیر کشمیر نے سیاسی جاگرتی کا جو نعرہ دیا تھا اور جو تحریک چلائی تھی اس سے بچانوے فیصد لوگوں پر بہت گہرے اثرات پڑ گئے تھے۔ پرائم منسٹر بنرجی نے ان کے ہی بارے میں کہا تھا کہ وہ لکڑہارے ہیں، سقائی کا کام کرتے ہیں اور مویشیوں کی طرح بہرے گھونگے ہیں جو حیوانی سطح پر گذارہ کرتے ہیں[1]۔ یہ بیان بنرجی نے اس وقت دیا تھا جب پرائم منسٹر کے عہدے سے استعفیٰ دیا تھا۔ یہ بیسویں صدی کی دوسری دہائی کا زمانہ تھا۔ میں اس زمانے کو اپنی زندگی کے ابتدائی تیس چالیس سال کے ساتھ بھی جوڑتا ہوں اور مسئلہ الحاق کے ساتھ بھی۔ یہ مسئلہ پاکستان اور ہندوستان کو نزاع میں پھنسائے ہوئے ہے اور ایسے مسائل پیدا کر چکا ہے جو ہم پچھلے ساٹھ سال سے دیکھتے آئے ہیں۔ تامل ناڈو میں بھی ایسے ہی مسائل پیدا ہو گئے تھے۔ وہاں نہ مذہب کا کوئی فرق تھا نہ کوئی نزاع۔ وہاں تو برہمنوں کو نکال باہر کر دیا گیا تھا۔ یہ برہمن بڑے ہی قابل آدمی تھے، امریکہ چلے گئے اور یورپ۔ اس طرح آئر اور آینگر قسم کے لوگ نکل گئے اور پست درجے کی ذاتیں اُبھر گئیں۔ یہ جمہوری نظام کا پروانہ حیات تھا! راج موہن گاندھی نے راج گوپال اچاریہ پر اُسی طرح سوانح عمری لکھی جس طرح مہاتما گاندھی اور سردار پٹیل پر لکھی۔ یہاں پریم ناتھ بزاز کے ہیومنزم نے سر نکالا اور بغاوت کا عندیہ دیا۔ بدقسمت کشمیر میں صنعتی میدان میں کچھ کام نہ ہوا لہٰذا سرکاری ملازمت یا سول سروس نے سرطان کی شکل اختیار کی اور ہماری تاریخ پر بڑے گہرے اور دوررس اثرات چھوڑ دیئے۔

۱۔ ان کا پورا نام البین بنرجی تھا اور سر (Sir) کا خطاب حاصل کیا تھا۔

ایس پی کالج سے جامعہ ملیہ اسلامیہ تک

ایس پی کالج سرینگر سے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کا سفر مختصر کہانی نہیں۔ اس میں نہ جانے کتنی غیبی آوازیں چھپی ہوئی ہیں جن کا زیر و بم کچھ ہوش رُبا ہے کچھ غمناک! مرزا اسداللہ خان کا شعر

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

اس پر خوف خوب بیٹھتا ہے۔ ذاکر صاحب نے اپنے بولوں سے مجھ پر عاشقی کا سحر پھینک دیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں اُن دنوں فکری لحاظ سے پگل رہا تھا۔ گھر میں، سکول میں، کالج میں، سماج میں، مذہب میں جو کچھ ہو رہا تھا، مجھ پر اثر انداز ہو رہا تھا۔ گو کہ مارکسزم کا مطالعہ ابھی باضابطہ طور پر شروع نہیں ہوا تھا مگر میں نے بہت ساری کتابیں پڑھی تھیں، بہت سارے مسائل سمجھے تھے۔ لگتا ہے کہ میں جدید تقاضوں کے مطابق تاریخ کا مطالعہ شروع کرنے کیلئے تیار ہو گیا تھا۔ علی گڈھ پہنچتے ہی پہلے ہی ہفتے میں میں نے ذاکر صاحب کو ایک لمبا خط لکھا جس میں جامعہ میں کام کرنے کی خواہش ظاہر کی گئی تھی۔ صرف تین دن کے بعد ذاکر صاحب کا جواب مل گیا۔ اُن کا خط میری بیش بہا دولت کا جُز ہے۔ نرم لہجے میں مجھے نصیحت کی گئی تھی مگر خبردار بھی کیا گیا تھا۔ دیگر باتوں کے علاوہ خط کا مضمون بائبل کے الفاظ میں یہ تھا کہ دعوت بہت سوں کو دی جاتی ہے مگر انتخاب کیا جاتا ہے بہت کم لوگوں

کا۔ زندگی بے رحم طریقے سے ان کو کوستی رہتی ہے یہاں تک کہ ان کی زندگی مثالی بن جاتی ہے اور وہ شخص بن جاتے ہیں۔ مجھے کہا گیا تھا کہ میں محنت اور صحت مند علمی مقابلہ آرائی سے گزرتے ہوئے اچھی خاصی نوکری حاصل کرسکتا ہوں۔ یہ بھی سمجھایا گیا تھا کہ میں پروفیسر محمد حبیب جیسے رہبر اور اُستاد کا شاگرد ہوں اور یہ میری نیک بختی ہے۔ مجھے رات دن محنت کر کے علی گڈھ کے قیام کا پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے تاکہ میں اچھا انسان بنوں اور علم کے زیور سے اپنے آپ کو آراستہ کروں۔ آخر پر کہا گیا تھا کہ اگر میں اپنی زندگی لوگوں کو تحفے کے طور پر دینا چاہتا ہوں تو مجھے خیال رکھنا چاہیے کہ یہ تحفہ پیش کرنے کے لائق ہو۔ یہ آخری جملہ بڑا ہی وزنی جملہ تھا۔ ذاکر صاحب کی زبان سے ایسے وزنی جملے کثرت سے نکلتے تھے۔ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ میرا جھکاؤ ذاکر صاحب کی طرف کیوں تھا اور میں کیوں اُن کا عاشق ہوگیا تھا۔ جب کبھی وہ علی گڈھ آتے، رشید احمد صدیقی مرحوم کے ہاں قیام کرتے۔ ہم دوڑ دوڑ کے وہاں جاتے جہاں سب کیلئے دروازے کھلے رہتے تھے۔ وہ مونڈا نامی کرسیوں پر بیٹھ جاتے[1] جو بہت عمدہ قسم کی مگر عجیب کُرسیاں ہوا کرتی تھیں۔ ایسی سینکڑوں کُرسیاں کرکٹ کلب انڈیا میں رکھی گئی تھیں۔ اس گھر میں بھی پانچ چھ کُرسیاں موجود تھیں۔ ذاکر صاحب اچھے لوگوں کے ساتھ بات چیت کرنے سے لطف اندوز ہوجاتے اور خود گفتگو کی شادکامیوں کا اعتراف کرتے۔ رشید احمد صدیقی ظریف تھے۔ ایک دفعہ فرمایا۔ ''ذاکر صاحب جب پاکستان وجود میں آئے گا۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ ان کی اپنی کرنسی ہوگی''؟ ذاکر صاحب نے جواباً فرمایا۔ ''یقیناً وہ علیحدہ ملک ہوگا اور لازمی ہے کہ ان کا اپنا سکّہ بھی ہوگا۔'' رشید صاحب نے فی البدیہہ کہا ''تب پاکستان کے کرنسی نوٹوں پر لکھا ہوگا، میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس نوٹ کے پیش کرنے والے کو دس روپے کی قیمت دی جائیگی۔ انشاءاللہ''۔

۱۔ یہ لوگ کرسیوں پر اپنے پیر جمائے بیٹھتے تھے اور اپنے ہاتھ کی انگلیاں ہلاتے تھے گویا کہ کھیلتے ہوں۔ ان کے پیر بے حد صاف ہوتے تھے اس لئے کہ وہ نماز پڑھتے تھے اور دن میں پانچ بار پیر دھوتے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ اسلامی طریقہ تھا یا علی گڑھ کا یا سرسید احمد خان مرحوم سے مستعار لیا ہوا۔

علی گڑھ میں پروفیسر حبیب چوٹی کے پروفیسروں میں شمار ہوتے تھے۔ میں اُن سے کیا ملا کہ دنیائے علم و دانش کے ساتھ جُڑ گیا۔ اُن کا چہرہ دیکھ کر ہی اُن کی گہرائی طبع کا پتہ لگتا تھا اور ان کے معصوم مگر گہرے دل کا۔ میں نے پہلی دفعہ علم کے مزے لوٹنا شروع کئے۔ انگلستان، جرمنی اور فرانس میں سولہ سے اٹھارہ سال کی عمر تک ایسے استادوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ انگلستان میں ایسی سطح تعلیم کو چھٹا فارم کہتے ہیں (Sixth form)۔ گویا انسان جمنازیم (Gymnasium) یا فرانس کے لیسے (lycee) سے گزرتا ہے۔ یہ نہیں کہ حبیب صاحب تک پہنچتے پہنچتے میں نے کچھ پڑھا ہی نہیں تھا۔ پڑھا تھا اور بہت کچھ پڑھا تھا خاص کر تاریخ پر۔ تاہم حبیب صاحب نے دنیا ہی بدل ڈالی۔ پہلے ہی دن کلاس میں ہمیں یونان کی دنیائے علم و ہنر میں لے لیا۔ بورڈ پر افلاطون کی تمثیل غار کے (Allegory of the Cave) کے نقوش کھینچ لئے[1]۔ پھر افلاطون پر خطاب شروع ہوا۔ پھر کبھی گوئٹے اور کبھی حضرت نظام الدین اولیاؒ ان کے فکری کردار بنتے رہے۔[2] اس طرح وہ دنیائے علم و عرفان اور فکر و فن کی سیر کراتے رہے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ ہمیں علم کے اتھاہ سمندر میں اُتار رہے ہیں اور یکا یک وہاں ہی چھوڑ رہے ہیں یا تیرنے کیلئے اور شخص بننے کیلئے یا موت کی آغوش میں دائمی نیند سونے کیلئے۔ میرا خیال ہے کہ علی گڑھ کے دو سال اس طرح گزر گئے کہ ہر معاملے کو اپنا معاملہ سمجھا اور ہر خیال میں گھوڑے دوڑانے کی کوشش کی۔ میں ہر چیز کا

۱۔ حبیب صاحب بلیک بورڈ کا خوب استعمال کرتے تھے۔ ان کی لکھائی عمدہ اور نفیس ہوتی تھی۔ جب وہ اوپر سے نیچے تک بلیک بورڈ بھر لیتے تھے تو ان کی لکھائی چھپے ہوئے کاغذ کا بڑا تختہ لگتی تھی۔

۲۔ افلاطون، گوئٹے اور خواجہ نظام الدین اولیاؒ یوں تو مختلف قسم کی شخصیتیں لگتی ہیں مگر دنیائے عرفان میں یہ لوگ ایک ہی منزل کی طرف بڑھتے ہیں۔ وہ منزل ہے منزلِ عشق جس کا کوئی آخری مقام نہیں۔ تمثیل غار بھی عرفانی مسائل کی واشگافی کرتی ہے۔ گوئٹے کے فوسٹ کا (Faust) مدعا بھی عشق ہے اور انسانی معراج۔ خواجہ نظام الدین اولیاؒ ولی تو تھے ہی مگر امیر خسرو جیسے بزرگوں کو جنم دیکر ادب اور فن کا بول بالا کیا تھا۔ اسی طرح سماجی خدمات سے انسان کے اعلیٰ مقام کی تشریح کی تھی۔

مذاق اڑانے لگا۔ مذہب، خدا کی خدائی، سب چیزیں اس کا ہدف بن گئیں[1]۔ شک بھی پیدا ہونے لگے، بڑھتے بھی گئے، حتیٰ کہ مجھ کلبیت[2] یا قنوطیت کی طرف لیتے گئے۔ میں شک کرتا گیا اور اسے علم و فضل کیلئے لازمی شے سمجھ بیٹھا۔ علی مردان میرا ایک جانی دوست تھا جو خیر پور ریاست کا شہزادہ تھا۔[3] وہ کہتا تھا کہ میری بات بات سے اختلافات چھلکتے ہیں۔ اسے نہ میرا ایمان دکھائی دیتا تھا اور نہ میرا عقیدہ۔ سچ تو یہ ہے کہ میرا نہ کوئی روایتی عقیدہ ہے اور نہ ایمان۔ علی مردان شیعہ فرقے کے ساتھ تعلق رکھتا تھا اور خوب پیسے خرچ کرتا تھا۔ ہم روز شام کو گھومنے جاتے۔ وہ کہتا ''اشرف، کیا کمیونسٹ ریاست میں مذہب کا کوئی امکان ہے؟'' میں اپنے بچپن اور ماضی کی وجہ سے سادیت (sadism) کا شکار ہو گیا تھا اس لئے علی مردان کی بے چینی سے حظ اٹھاتا تھا۔ تاہم کبھی کبھی اسے کتابوں سے بھی روشناس کراتا تھا۔ تاریخی جدلیات سے اقتباس سناتا تھا جس سے میرے فکری تلاطم اور شک و گماں کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ میں یہ کہوں کہ بخارن (Bukharin) کے اس قول نے مجھ پر ایسا حملہ کیا تھا کہ میرے فکری نقوش بھی بکھرنے لگے تھے۔

> بے چارے بوڑھے خدا کا نام بیچ میں لانا کیوں؟ اس نے تو اپنے لئے لازم سمجھا کہ جنت اور جہنم کے ساتھ ساتھ جوئیں اور عصمت فروش عورتیں، آتشک اور وودکا، قاتل اور کوڑھی، بھوک اور افلاس پیدا کرے اور اس طرح اُن گنہگاروں کو سزا دے جنہیں اس نے خود پیدا کیا اور جو اس کی مرضی سے ہی گناہ کرتے ہیں۔ دیکھ اس مسرور کائنات کے آمنے سامنے وہ اس طربیہ کا کھیل کس طرح جاری

۱۔ مذہب کی اصلی حقیقت سمجھنے کیلئے لا بہت ضروری ہے۔ مسلمانوں کا کلمہ بھی لا سے ہی شروع ہوتا ہے اور الّا تک پہنچ جاتا ہے۔ نفی اثبات کیلئے ضروری ہے۔

۲۔ کلبیت یعنی cynicism، قنوطیت یعنی passimism۔

۳۔ وہ کافی قلاقند کھاتا تھا۔ اسے ذیابیطس sugar کی بیماری لگ گئی تھی۔ بے چارا اسی بیماری سے مر گیا۔

رکھے ہوئے ہے۔[1]

میں اس قسم کی باتوں سے دوسری دنیا میں پہنچ جاتا تھا اور وہاں نہ جانے کن کن لوگوں سے ملتا تھا۔ میں عقلی مشق کرتا تھا اور دوسروں سے بھی کراتا تھا۔ میں نے افلاطون (Plato) کی کتاب ریاست (Republic) سے سیکھا تھا کہ سقراط کامل ہونے کیلئے یہی طریقہ استعمال کرتا تھا۔ میں شیعہ لوگوں کی محفلوں میں سنی لوگوں کی تعریفیں کرتا تھا کہ دیکھوں میری تعریفوں کی قوت کیا ہے اور شیعہ لوگ میری باتوں کا کیا اور کس طرح جواب دیتے ہیں۔ اسی طرح سنیوں کے ساتھ بیٹھ کر میں ان کی نکتہ چینی کرتا۔ شیعوں کی تعریف کرتا تا کہ دیکھوں وہ کیا کہتے ہیں اور مجھے فکری فائدے کیسے حاصل ہوتے ہیں۔ یاد رہے کہ ذاکر صاحب نے Republic کا ترجمہ ''ریاست'' نامی کتاب کی صورت میں کیا تھا۔ ترجمہ کرتے کرتے انہوں نے یہی سقراط کا طریقہ اختیار کیا تھا جو انسان کو مجبور کرتا ہے کہ اپنی سوچ سے کام لے اور کھل کر سامنے آئے تا کہ انسان کامل بن جائے۔ علی گڑھ میں ذاکر صاحب نے یہ ترجمہ انہی دنوں کیا تھا جب وہ ایم اے کر رہے تھے۔

میں نے علی گڑھ یونین میں اپنا سکّہ جمایا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس یونین کا میری فکری زندگی پر کافی اثر پڑ گیا ہے۔ ایک دن ڈاکٹر حلیم صاحب کی موجودگی میں میں نے مباحثے کے دوران خوب سکّہ جمایا۔ حلیم صاحب پرووائس چانسلر تھے اور آکسفورڈ میں ارنسٹ بارکر Ernest Barker کے شاگرد رہ چکے تھے۔ ان کی ادا اور ان کا طور طریقہ خوف پیدا کرتا تھا۔ ایک روز یونین نے بحث کا اہتمام کیا۔ عنوان تھا ''بنگال کی صوبائی حکومت یا مرکزی حکومت بنگال کے قحط کی ذمہ دار تھی''۔ مجھ سے کہا گیا کہ میں اس بحث میں شرکت کروں۔ انور عادل میرے ہم جماعتی تھے جو میرے مقابل بولنے والے تھے۔ میں نے

1 Why do you bring in this poor old man who was obliged to create alongside heaven and hell lice and prostitutes, syphlis and vodka, murderers and leppers, hunger and poverty as punishment for sinners whom He created and who commit sins by His desire and thus continue to play this comedy in front of a delighted universe.

جذباتی انداز میں بولنا شروع کیا اور دلائل سے خوب کام لیا۔ حلیم صاحب نے مجھے روکتے ہوئے اپنے اکڑ باز انداز سے فرمایا۔ ''کیا میں فاضل مقرر سے پوچھ سکتا ہوں کہ وہ موضوع کے حق میں بول رہے ہیں یا اس کے خلاف؟'' میں نے کہا ''جناب والا! میں موضوع پر بول رہا ہوں مگر ازیں سو راندہ ہوں اور وزاں سو ماندہ[1]۔ مجھے معلوم نہیں کہ میری زبان پر اُس وقت انگریزی کی یہ ضرب المثل کیسے چڑھی جو موقعے کے حسب حال تھی۔ تاہم سارے ہال میں لوگوں کے قہقہوں کی گونج بحث میں میری کامیابی کی شہادت دینے لگی۔ جو لوگ مجھے شکست دینا چاہتے تھے وہ خود شکست کھا گئے۔ دوسری دفعہ بحث کا عنوان پروائس چانسلر نے موقعے پر ہی منتخب کیا۔ یعنی فکر نہ کہ جبر دنیا پر حکومت کرتا ہے۔ (Idea not force rules the world) مجھ سے پہلے جن مقررین نے بولا تھا، انہوں نے نپولین کے خوب حوالے دیئے تھے۔ میں نے کہا ''آج کی شام نپولین کا نام حد سے زیادہ زبان پر آیا ہے۔ کیوں نہ میں بھی اس کے تجربات اور فرمودات سے فائدہ اٹھاؤں۔ اس نے کہا ہے کہ دنیا میں صرف دو طاقتیں ہیں، تلوار اور قلم۔ مگر بالآخر جیت قلم کی ہوتی ہے، تلوار کی نہیں۔ نپولین جب مصر کے پاس سمندری سفر کر رہا تھا تو اس نے تاروں بھری رات کا کھلا جلوہ دیکھا اور کہا کہ یہ سب کس نے بنایا ہے۔ وہ خدائے لم یزل کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ گوئٹے نے کہا کہ نپولین نیکی (virtue) کے حصول کیلئے نکلا تھا مگر اس کے عوض اسے قوت اور اقتدار ہاتھ آیا''۔ اس قسم کے بظاہر چھوٹے چھوٹ کلمات اور حوالے اکٹھے ملا ملا کر میں نے ایک معجون تیار کیا اور سامعین کے سامنے رکھا۔ میں نے کتابیں پڑھی تھیں ان کے اسباق خوب سمجھ لئے تھے، اس لئے بولتے بولتے پتے کی باتیں زبان پر چڑھتی گئیں اور دلائل سے نشانے پر لگتی گئیں۔ مجھے پہلا انعام ملا جو پچیس روپیہ چیک کی صورت میں مجھ کو دیا گیا۔

۱۔ میں نے Between the Devil and the Deep Sea محاورہ استعمال کیا تھا۔ یاد رہے کہ بنگال کی صوبائی حکومت لیگیوں کی تھی اور مرکزی حکومت انگریزوں کی۔

علی گڑھ یونین کے ساتھ ساتھ چار بڑی ہستیوں کا اثر بھی میں نے علی گڑھ میں بلاواسطہ یا بلواسطہ قبول کیا۔ یہ چار ہستیاں علی گڈھ کا سرمایہ سمجھی جاتی تھیں۔ پروفیسر محمد حبیب، پروفیسر ہادی حسن، پروفیسر حلیم اور پروفیسر حیدر۔ پروفیسر حبیب جیسے اعلیٰ پائے کے دانشور سے ملنا خوش بختی تھی اور ان سے فیض حاصل کرنا خدا کا کرم۔ ارک ہابس بام نے کارل مارکس کیلئے ایک جاپانی اصطلاح سینسی (Sensei) استعمال کی ہے۔ اس کا مطلب ہے استاد کا وہ قرضہ جو ادا نہیں کیا جا سکتا۔ میں اس اصطلاح کو حبیب صاحب کیلئے استعمال کرنا چاہوں گا گو کہ اس کے ساتھ ہی مجھے پروفیسر مجیب بھی یاد آتے ہیں۔ میں پہلے ہی ذکر کر چکا ہوں کہ حبیب صاحب نے پہلے ہی دن ''تمثیل غار'' سے سبق شروع کیا تھا۔ میرے لئے کیا چارہ تھا کہ لائبریری میں جا کر ہاتھ پاؤں ماروں اور یونان کے علمی خزانوں کا سراغ لگاؤں۔ ریاست کا مطالعہ ضروری تھا۔ یونانی فلسفے کے ساتھ ساتھ ہابس، لاک، روسو، مل اور گرین نصاب میں شامل تھے۔ حبیب صاحب بڑی شفقت سے پیش آتے اور قریب آجاتے۔ گاہے گاہے وہ عجیب عجیب باتیں کرتے جو انسان کو حیرت میں ڈالتی تھیں۔ مثلاً ایک دن کہا کہ شیخ نظام الدین اولیاءؒ کمیونسٹ تھے۔ شاید اُن کا مطلب تھا غریب نواز، پسماندہ اور کس مپرسی کی حالت میں پڑے ہوئے لوگوں کا ہمدرد، امارت اور ناجائز مال و دولت سے دور بھاگنے والا خدا پرست، وغیرہ وغیرہ۔ اُن کی بات بات تلاش حق کیلئے آمادہ کرتی تھی۔ وہ فارسی اشعار کا حوالہ دیتے اور ان کے اندر چھپی ہوئی گہرائیوں کی طرف لے جاتے۔ فارسی کے ساتھ اُن کا لگاؤ بھی ثبوت دیتا ہے کہ وہ اعلیٰ ترین انسانی قدروں کے متلاشی تھے۔ حق تو یہ ہے کہ اعلیٰ ترین قدروں کا نام ہی خدا[1] ہے۔ حبیب صاحب ان قدروں کو عام دیکھنا چاہتے تھے۔ ماوزی تنگ کے یہ شیدائی ذہن سے کام لیتے

۱۔ اسلام میں خدا کو ۹۹ ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کے اندر بھی قدریں چھپی ہوئی ہیں۔ جتنا گہرا جائیں اُتنا ہی قدروں کا ہجوم دکھائی دے گا۔ مثلاً رحمٰن کے اندر رحم، ہمدردی، عشق و محبت، غور اور ارتقائے منزل۔ اسی طرح جبار میں قوت، طاقت، تخلیق، صلاحیت، تعمیری و تخلیقی مصلحت وغیرہ۔

تھے۔ ان کے کلاس میں طلباء اکثر سوالات پوچھتے تھے۔ حبیب صاحب ان کے بہت ہی گہرے جواب دیتے تھے۔ جنون کو اپنے فکر میں آنے ہی نہیں دیتے تھے۔ ایک دن انہوں نے عثمان نامی ایک چینی کو اپنے کمرے میں لایا۔ ایم، اے کا کلاس تھا۔ روئیداد خان پشاور کا ایک طالب علم تھا۔ اُس نے عثمان سے پوچھا۔ ''آپ پہلے مسلمان ہیں یا چینی؟'' حبیب صاحب نے روئیداد خان کا سوال کاٹتے ہوئے فوراً جواب دیا کہ روئیداد خان چین میں دوسرا پاکستان بنانا چاہتا ہے۔ روئیداد خان اس کے بعد ایک لفظ بول نہ سکا۔

۱۹۵۹ء میں حبیب صاحب اپنی بیگم صاحبہ کے ساتھ کشمیر آئے اُنہیں خطبے دینے کیلئے بلایا گیا تھا۔[1] جب وہ بات کرتے تو تاریخی حقائق سامنے آتے۔ کبھی شاہ جہاں کا ذکر چھیڑتے اور کبھی اورنگ زیب کا۔ جب ہوائی اڈے پر اُترے تو کہا ''آغا صاحب شاہ جہاں کو کشمیر آنے میں چھ ہفتے لگ گئے تھے۔ راستے میں کتنے ہاتھی مر گئے تھے اور شاہ جہاں نے کتنی تکلیفیں برداشت کی تھیں جن کی وجہ سے ہی شاید وہ صرف دو بار کشمیر آسکے تھے۔ ہم صرف ایک گھنٹے میں پہنچ گئے۔'' حبیب صاحب کی طبیعت بچوں جیسی تھی۔ مجیب صاحب کہتے کہ حبیب صاحب صحیح وقت پر غلط بات کرتے ہیں۔ ایک دن وہ گاندھی جی پر تقریر کرنے کے بعد سٹاف روم میں بیٹھ گئے۔ باتوں باتوں میں رازدان صاحب کی بات اُٹھی جو بنارس یونیورسٹی میں تعلیم کے سربراہ تھے اور سکاٹ لینڈ کی ایڈنبرا یونیورسٹی میں تعلیم پا چکے تھے۔ فرمایا ''رازداں صاحب کو میں جانتا ہوں۔ بڑے قابل ہیں مگر ان کی بیوی اُنہیں پیٹتی ہیں''۔ حبیب صاحب اپنی زندگی کے آخری حصے میں اناطول فرانس کی طرح مارکسسٹ بن گئے تھے۔ مگر وہ چین کی نئی جمہوریت اور اس سے متعلق کتابوں کے بڑے شوقین تھے۔ ایک دفعہ جب کشمیر آئے تو پروفیسر جے ایل کول نے فرمایا کہ وہ حبیب صاحب کو امر سنگھ

۱۔ میں نے اُنہیں قریباً سارا کشمیر دکھایا۔ وہ کگرناک، ویری ناگ، پہلگام اور گلمرگ گئے۔ بخشی صاحب نے میزبانی کی پیشکش کی۔ حبیب صاحب نے اُس نے کہا کہ اشرف بھی بخشی صاحب کا ہی بھائی ہے۔

کلب لینا چاہتے ہیں۔ مجھ سے کہا کہ میں حبیب صاحب سے اقرار لوں۔ کول صاحب امر سنگھ کلب کے ممبر تھے۔ حبیب صاحب راضی ہوئے۔ جب وہ کلب میں چائے پی رہے تھے تو کول صاحب نے فرمایا "حبیب صاحب اچھے محبان وطن کی حیثیت سے ہمیں چین کے بارے میں کیا کرنا چاہیے؟ حبیب صاحب نے جواب دیا "یہ پست قد اور چپٹی ناک والے جہاں بھی ہوتے ہیں، چین کہتا ہے کہ یہ ہمارا ملک ہے۔ آپ بے شک اپنی فوجیں چین بھی بھیج سکتے ہیں مگر وہاں سے کسی کے واپس آنے کی امید نہیں"۔ اُس زمانے میں پنڈت جواہر لال نہرو نے چین سے نپٹنے کی پھبتی اُڑائی تھی۔ تاہم جب اس نے اپنا ڈیلی گیشن چین بھیجا تو اس میں خاص طور پر حبیب صاحب شامل تھے اور مجیب صاحب بھی۔ مجیب صاحب نے چین پر تو کتاب بھی لکھی، "نئے چین کی جھلکیاں[1] (Glimpses of New China)۔

پروفیسر ہادی حسن بھی نہایت ہی قابل، حاضر جواب اور ہشیار مغز تھے۔ ان کی یاداشت غیر معمولی تھی۔ انہوں نے کیمبرج میں نباتات میں ڈگری حاصل کی تھی مگر اس کے بعد فارسی ادبیات کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے "پارسی جہاز رانی کی تاریخ" (History of Persian Navigation) لکھی تھی۔ اس پر انہیں کیمبرج سے پی، ایچ، ڈی ملا تھا۔ وہ وضع دار تھے اور ان کی وضع میں جلال بھی تھا اور جمال بھی۔ اچکن پہنتے تھے جو ان کے پتلے جسم پر خوب سجتی تھی۔ خطابت میں اُنہیں خاصی مہارت حاصل تھی لگتا ہے کہ وہ پیدائشی طور پر خطیب تھے۔ ایک دن ایڈمرل گوڈفرے (Admiral Godfrey) علی گڑھ آئے۔ پروفیسر ہادی حسن کو کہا گیا کہ وہ ان کا شکریہ ادا کریں۔ حسن صاحب نے فی البدیہہ ایسے الفاظ کا استعمال کیا کہ سب محظوظ تو ہوئے مگر دنگ رہ گئے۔ وہ

۱۔ اس کتاب میں مجیب صاحب نے ایک جملہ لکھا تھا جو میری نظر میں نامناسب تھا۔ مگر ان دو بھائیوں میں شفقت بھری رقابت پائی جاتی تھی۔ مجیب صاحب نے لکھا تھا کہ حبیب صاحب تسبیح ساتھ رکھتے ہیں مگر جب مذہب کی بات کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اس میں تہذیب وتمدن کی اساس بننے کی گنجائش نہیں۔

بات میں بات پیدا کرتے تھے اور باتوں کو اس طرح جوڑ دیتے تھے کہ سننے والے حیران ہو جاتے تھے۔ ان کی فکری اور لسانی اڑانیں اتنی اونچی ہوتی تھیں کہ ہم چھوٹے چھوٹے ان بلندیوں کو چھو بھی نہیں سکتے تھے۔ ایک دن کشمیر آئے۔ پروفیسر غلام السیدین نے ان کو مدعو کیا تھا۔ شری گوپال سوامی آینگر نے صدارت کی۔ پروفیسر حادی حسن نے اس طرح اپنا خطبہ شروع کیا۔ ''گلاب کی طرح پھولوں میں، مور کی طرح پرندوں میں، لعلِ بے بہا کی طرح لعلوں میں۔۔۔ (اس طرح پانچ منٹ تک شاعرانہ زبان اور تلمیحات اندر تلمیحات استعمال کرتے ہوئے بولتے گئے)۔۔۔ یہ ہمارے پریذیڈنٹ ہیں۔ پریذیڈنٹ کیا پرزیڈنٹوں کے پریذیڈنٹ ہیں''۔ آینگر نے ایسی ہی شعلہ انگیز زبان میں اپنے صدارتی خطبے میں جواب دیا۔ ''مجھے معلوم نہیں تھا کہ ڈاکٹر ہادی حسن ایسے شعلہ بیان مقرر ہیں''۔ ہادی حسن نے چار اہم خطبے تیار کئے تھے، جن سے ان کی ذہانتِ طبع اور یاداشت کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ منگولوں کا فنِ حرب وضرب (The Military Strategy of Mongols)، پارسیوں کی عقلی نفاست اور ظرافت (Persian Wit and Humour)، ہندوستانی تہذیب (Indian Culture)، اور مسلمانوں کی تہذیب (Muslim Culture)۔ پروفیسر عابد حسین کہتے تھے کہ ہادی حسن ہر پیشے اور ہر کام کیلئے موزون ہیں مگر اس کام کے لئے نہیں جو انہیں سونپا گیا ہے۔ کالیداس کے مشہورِ زمانہ ڈرامہ کا اُنہوں نے ترجمہ کیا تھا۔ یہ ڈرامہ فنکاری کا Best نمونہ تو ہے ہی مگر اس کی گہرائی مافوق الفطرت تجربات کا پتہ دیتی ہے اور ہندوستان کی روحانی عظمت کی۔ ہادی حسن نے ایک دن یہ ڈرامہ یونین ہال میں اداکار کی حیثیت سے دو گھنٹے پیش کیا مگر اکیلے۔ بورڈ پر لکھا تھا: ''شکنتلا ڈرامہ، ترجمہ کار بزبان انگریزی: ڈاکٹر ہادی حسن! ڈاکٹر صاحب کو سارا ڈرامہ زبانی یاد تھا۔ ہال میں ہادی حسن صاحب نے کہا۔ ''یہ ترجمہ ہی نہیں بلکہ ترجمے کا ترجمہ ہے۔ میں نے ۱۹۴۲ء میں اسے شکنتلا کے نزدیک لایا ہے۔'' ہادی صاحب نے سارا ڈرامہ پیش کیا۔ مکالمے حسن خوبی سے

پیش کئے اور انگلیاں نچواتے نچواتے یا یوں کہیئے کہ اداکاری کے کرتب دکھاتے دکھاتے۔ جب وہ سٹیج پر چلتے چلتے ٹک ٹک، ٹک ٹک کرتے باہر جاتے تو اشارہ دیتے کہ کھڑاؤں[1] پہن کے باہر جاتے ہیں۔ شکنتلا اور ہادی کی اداکاری، واہ رے واہ حسن ادا!

ہادی حسن بڑے، خوش گفتار تھے۔[2] ایران کے رزم گو آفاقی شاعر فردوسی کی ہزارویں برسی میں شرکت کرنے کیلئے اُنہیں اور پروفیسر حبیب کو مدعو کیا گیا تھا۔ ان صاحبان کو مختلف تقریبات میں حصہ لینے کیلئے دعوت دی گئی تھی۔ دونوں صاحباں نے خطبات دئے اور اعلیٰ سطح پر علم و ادب کے شاندار مراسم کو زینت بخشی۔ ایک دن وہ کسی نواحی علاقے میں دورہ کررہے تھے کہ کسی نے بتایا کہ دکتور ہادی حسن ہیں۔ گاؤں کے سیدھے سادھے لوگ یکا یک علاج کرنے کیلئے جمع ہوگئے۔ ڈاکٹر حسن نے یکدم اُن کا علاج شروع کیا۔ پروفیسر حبیب گندمی رنگ کے تھے۔ کسی نے پوچھا وہ کون ہیں۔ ڈاکٹر حسن نے جواب دیا وہ ان کے کمپونڈر ہیں۔ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ کتنے بے تصنع آدمی تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں سنجیدگی کو کبھی آنے نہ دیا۔ ایک دن وہ ٹائی فائڈ کا شکار ہوگئے۔ اُن کی دیکھ بال کا کام ایک سیاہ فام نرس نے اپنے ذمے لیا۔ بیس دن کے بعد حسن صاحب ٹھیک ہوگئے۔ اُنہوں نے نرس سے ازراہِ تواضع کہا کہ وہ اس کی کیا خدمت کرسکتے ہیں۔ بس اُن کا کہنا کہ نرس نے رونا شروع کیا۔ معلوم ہوا کہ اسے ہادی حسن کے ساتھ عشق ہوگیا ہے۔ حسن صاحب نے ساتھ چلنے کو کہا اور نرس سچ مچ ان کے ساتھ چلی۔ ان کا نکاح ہوگیا۔ دونوں

۱۔ جس زمانے میں یہ ڈرامہ لکھا گیا تھا، لوگ کھڑاؤں پہنتے تھے۔ خاص کر سادھ سنت لوگ، پاؤں میں لکڑی کے کھڑاؤں رمز ہے لافانی آوازوں کی جن کی مدھرتا کام دیوتا کے تیروں کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ شاید یہ رمزیت ہادی حسن کے دل میں سما گئی تھی۔

۲۔ ایک دن انہوں نے یونین میں میری تقریر سنی تھی۔ مجھے اپنے پاس بلایا اور کہا ''ایک دن یہ لوگ آپ کو علی گڑھ یونیورسٹی کا وائس چانسلر بننے کی دعوت دینگے مگر ماننا نہیں''۔ ایک اور دن مجھ سے کہا ''میں نے اپنی کتاب میں ثابت کیا ہے کہ ہیون سانگ ایرانی جہاز میں ہندوستان آیا تھا مگر یہ بات غلط ہے''۔

نے زندگی خوش خوش اکٹھے گزاری۔

علی گڑھ میں ہادی اور حبیب کے علاوہ حلیم اور حیدر بھی تھے اور لائبریری کے بشیر صاحب۔ ایک اور پروفیسر تھے عربی کے، محمد عزیز میمن صاحب۔ ان کا پائجامہ ٹخنوں کے 4 اوپر تک رہتا تھا اور داڑھی لمبی ہوا کرتی تھی۔ ہاتھ میں عصا لئے ہوئے آتے تھے۔ آج کل اس قسم کی داڑھی اور اس قسم کا مختصر پائجامہ بہت مولوی صاحبان اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے لوگ پہنتے ہیں۔ ان کی وضع قطع ان کی تفہیم اسلام میں شامل ہے۔ پروفیسر حلیم کی زندگی میں کافی ربط وضبط تھا۔ وہ نظم ونسق کے ساتھ خاصی دلچسپی رکھتے تھے۔ آکسفورڈ میں تعلیم پائی تھی اور اپنے مضمون ہسٹری میں اہل بھی تھے اور ماہر بھی۔ بشیر صاحب لائبریری کیلئے نہایت موزون تھے۔ وہ کتابوں کے عاشقوں کی دستگیری کرتے تھے اور ان کے شوق کی آبیاری۔ مگر علی گڑھ کے بارے میں سب سے ضروری بات یہ تھی کہ اس کا عبوری دور شروع ہوگیا تھا۔ پہلے اس کا جھکاؤ نیشنلزم کی طرف تھا مگر دائیں بازو کے نیشنلزم کی طرف۔ اب اس کا میلان پاکستان کی طرف ہوگیا تھا۔ وائس چانسلر ضیاء الدین اس میلان کو ہوا دے رہے تھے۔ انہوں نے چند غنڈوں کے ذریعے جو اس کے چمچے تھے، ڈاکٹر اشرف پر حملہ کرایا تھا۔ ڈاکٹر اشرف ترقی پسند تھے۔ اشرف صاحب کے علاوہ پروفیسر رشید احمد صدیقی اور پروفیسر آل احمد سرور بھی ترقی پسند خیال کے دانشور تھے۔ علی گڑھ میں اندر ہی اندر جو لاوا اُبل رہا تھا، رشید صاحب اور سرور صاحب اس سے دور تھے۔ باقی اساتذہ بھی اس کی طرف توجہ نہیں دیتے تھے۔

۱۹۴۲ء میں میری بڑھتی ہوئی فکری زندگی پر ایک اور زبردست اثر پڑا۔ خالی جیب ہوتے ہوئے بھی میں نے میسور جانے کا ارادہ کیا۔ ۱۹۴۱ء میں ایک یوگی فلسفی کشمیر آئے تھے۔ وہ امریکی خاتون کلیرنس گاسک (Clarance Gasque) کے پاس مہمان تھے۔ یہ خاتون کشمیر میں گرمائی ایام گزار رہی تھی۔ مجھے پروفیسر محمود نے ان کے پاس بھیجا تھا۔

صاحبزادہ محمود ہسٹری کے پروفیسر اور میرے استاد تھے۔ پروفیسر محمود نے مجھے کہا تھا کہ میں پال صاحب سے ملوں اور ان سے گزارش کروں کہ وہ کالج کے ہسٹری گروپ کے ساتھ بیٹھ کر انہیں اپنے خیالات سے فیض یاب ہونے کا شرف بخشیں۔ پال صاحب نے معذرت ظاہر کی کہ وہ نہیں آسکیں گے کیونکہ اُنہوں نے عوام کے ساتھ گفتگو کا سلسلہ بند کیا ہے۔ میں مایوس تو ہوا مگر پال صاحب کو اپنے گھر تشریف لانے اور چائے پینے کی دعوت دی۔ انہوں نے دعوت قبول کی اور وہ آ گئے۔ مجھے بڑے لوگوں سے ملنے کا شوق لگا رہتا تھا۔ بے لاگ تجسّس نے میرا قرار چھین لیا تھا۔ اسے ذہنی کاوش کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ میں ہر جگہ بہتر سے بہتر چیز کی تلاش میں رہتا تھا۔ جب میں نے پال برنٹن کے صوفیانہ چہرے کو غور سے دیکھا مجھے محسوس ہوا کہ ان کی گہرائی طبع نے انہیں سکون عطا کیا ہے۔ نئے چہرے سے طمانیت ٹپک رہی تھی۔ بعد میں میں نے ان کی کتابیں پڑھنا شروع کیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ان کے ساتھ خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان کے خطوط میں دوسری باتوں کے علاوہ ان سوالوں کے جوابات بھی ہوتے تھے جو میں اُن سے پوچھتا تھا۔ بی۔اے میں میں نے گہرا مطالعہ کرنا شروع کیا تھا اس لئے بٹرنڈرسل[1] ایچ۔جی ویلز، اناطول فرانس، اپٹون سینکلیر (Upton Sinclair) میری زندگی کے ساتھ جڑ گئے تھے۔ پال برنٹن دل چسپ باتیں لکھتے تھے۔ مثلاً بٹرنڈرسل کا ذہن منطقی، قطعی اور معاملہ سنج ہے مگر اصلاً وہ قنوطیت کا شکار ہے اس لئے اس کا دل دل بینا نہیں۔ ایچ۔جی ویلز من کی دنیا سے نا آشنا ہے اس لئے وہ انسان کامل بن نہیں سکتا۔ اپٹون سینکلیر جوش پیدا تو کرتا ہے مگر باتیں بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے۔ پال صاحب نے مجھے اس خطاب کی کاپی بھی بھیجی تھی جو اس نے میسور میں مسلمانوں کے کالج میں دیا تھا۔ اس خطاب میں پیغمبر اسلام ﷺ کا ایک خوبصورت سیرتی نقش تھا۔ مسلمان طلبہ کی حوصلہ افزائی کرتے کرتے پال نے فرمایا تھا کہ

۱۔ بٹرنڈرسل ریاضیات کے ماہر اور فلسفی تھے۔

انہیں ہمت سے کام لینا چاہیے کیونکہ پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی بہادرانہ زندگی میں ہمت کی عملی وضاحت کی تھی۔ پال کے فرمودات میرے دل میں جگہ پا گئے اس لئے میں نے ان کے ساتھ خط و کتابت کا سلسلہ جاری کیا۔ چنانچہ میں ۱۹۴۲ء میں ان کے گھر میں مہمان کی حیثیت سے ٹھہرا۔ میں ان سے گھیان دھیان کی تربیت پاتا، ان کی کتابیں پڑھتا اور اس مسودے کی ورق گردانی کرتا جو اُن دنوں انہوں نے تیار کیا تھا۔ وہ ہندو فلسفیوں کے ساتھ زبردست اختلافات کرتے تھے۔ ان دنوں انہوں نے ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام تھا ''یوگ سے ماوراء باطنی تعلیم'' (The Hidden Teaching beyond Yoga)۔ ان کا خیال ہے کہ وجود کی منزل مقصود انسان ہے۔ ہندوؤں کا خیال ہے کہ وجود نفی سکھاتا ہے اور اِس کلئے سے پال صاحب کو سراسر اختلاف تھا۔ اسی اختلاف نے ان کو The Hidden Teaching beyond Yoga لکھنے پر اُکسایا۔ انہوں نے مجھے ''ماورائی نفس کا شعور'' The Wisdom of Overself کے چند باب بھی دکھائے۔ ''ہندوستان میں اسرار کی تلاش'' (A Search in Secret India) اور ''مصر میں اسرار کی تلاش'' (A Search in Secret Egypt) سے انہیں زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ موخرالذکر میں اسلام پر دو بہت اچھے باب لکھے گئے ہیں اور الازہر کے شیخ المراغی (Shaikh-ul-Maraghi) سے ملاقات کا بھی ذکر ہے۔ پال صاحب کو راما مہاریشی کے ساتھ کافی تعلقات تھے۔ اسی کی وجہ سے وہ ہندوستان آئے تھے۔ ارونا چل کے اس ریشی پر انہوں نے ''ارونا چل کا پیغام رساں'' (Messenger from Arunachal) کتاب بھی لکھی ہے۔

میں تقریباً پندرہ دن پال برنٹن کے پاس ٹھہرا۔ ان کے پاس تین نوکر تھے۔ ایک کا نام کرشن، دوسرے کا رام اور تیسرے کا گوپال تھا۔ وہ ان کے ساتھ نہایت نرم لہجے میں بات کرتے تھے۔ پال صاحب سبزیاں اور کیلے کھاتے تھے۔ جنوبی ہند میں چھوٹے چھوٹے کیلے کافی پیدا ہوتے ہیں۔ وہ دلیا (Porridge) میں کیلے اور شہد ڈالتے اور اُبلی ہوئی غذا کھاتے

تھے۔ میرے معیار کے مطابق ان کی غذا ناکافی ہوتی تھی مگر میں اس کا ذکر اُن سے بالکل نہیں کرتا تھا۔ واپس آنے کیلئے میرے پاس پیسے نہیں تھے۔ میں بنگلور چلا گیا اور ایک دوست کی تلاش کی جو فوج میں بھرتی ہونے کیلئے تربیت پا رہا تھا۔ وہ پہاڑی کی سیر کرنے کیلئے گیا تھا۔ واپس آ گیا تو میں نے اس سے کچھ قرضہ لے لیا۔ دو دن دو رات ریل میں سفر کرنے کے بعد دلّی پہنچا۔ میرا خیال ہے کہ مجھے ریل کے سفر کیلئے صرف بیس روپے دینے پڑے۔

علی گڈھ کا قیام تعصب سے مبرّا تھا۔ سرسید مرحوم عصبیت اور مذہبی جنون کی مذمت کرتے تھے۔ ان کے سامنے جدید تقاضوں کے مطابق آگے بڑھنے کا بہت بڑا منصوبہ تھا۔ اس کیلئے وہ علمی، ادبی اور ثقافتی ترقی لازمی سمجھتے تھے۔ علی گڈھ نے جو پہلا گریجویٹ پیدا کیا تھا، وہ مسلمان نہیں ہندو تھا۔ مگر لیگ کانفرنس نے ۱۹۳۷ کے بعد اس راہ سے ہٹ کر فرقہ واریت کو ہوا دی اور دو قومی نظریے کی آبیاری کی۔ حالانکہ اس نظریے کے موجد اعلیٰ محمد علی جناح مرحوم کانگریس کے جنرل سیکریٹری تھے۔ سروجنی نائیڈو نے اُنہیں ہندو مسلم اتحاد کا سفیر قرار دیا تھا۔ وہ خود بھی مذہبی نزاع سخت ناپسند کرتے تھے اور قطعاً سیکولر مسلمان تھے۔ چونکہ نامور قانون دان تھے، غیر معمولی قابلیت کے مالک تھے، انہیں معلوم ہوا تھا کہ ان کی باتوں کو سنجیدگی سے سمجھنے کی کوشش نہیں کی جا رہی ہے اور ان کی انا کو ٹھیس پہنچائی جا رہی ہے اس لئے انہوں نے الگ راستہ اختیار کیا مگر اس کا سب سے برا اثر اگر کسی پر پڑا تو وہ مسلمانوں پر پڑا۔ جب اُنہوں نے تقسیم ہند اُس صورت میں ہوتے دیکھی جس صورت میں یہ واقع ہوئی تو اُنہیں صدمہ ہوا۔ فرمایا کہ اُنہیں یہ کرمِ خوردہ اور پارہ پارہ پاکستان نہیں چاہیے[1]۔ لازماً وہ ایک غم زدہ انسان کی حیثیت سے وفات پا گئے!

تقسیم کے بعد جو حالات پیدا ہو گئے اُن سے مہاتما گاندھی شہید تو ہوئے ہی مگر ذاکر صاحب جیسے مثالی انسان بھی بچ نہ سکے۔ میں نے علی گڈھ میں پروفیسر رشید احمد صدیقی

1 I do not want this moth eaten and trunkated Pakistan. M.A. Jinnah

سے ڈاکٹر ذاکر حسین کے اکیس خطبے حاصل کئے تھے۔ میں اُن کا مطالعہ کر رہا تھا مگر اس خیال سے کہ ان کی تالیف کروں۔ ان میں سے دو خطبے ذاکر صاحب نے آگرہ سٹوڈنٹس فیڈریشن اور کراچی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں دئے تھے۔ ان میں بہت حیرت انگیز باتیں تھیں۔ مگر بہت ساری باتیں دہرائی گئی تھیں۔ اس لئے میں نے ذاکر صاحب سے مشورہ کیا۔ اُنہوں نے فرمایا کہ یہ سارے خطبات ان کے پاس بھیج دئے جائیں تاکہ وہ ان پر نظر ڈال کر صحیح مشورہ دیں۔ میں نے یہ اکیس خطبے بھیج تو دئے مگر اپنا آٹوگراف بک بھی بھیج دیا تاکہ ذاکر صاحب اس پر بھی کچھ لکھیں۔ اس بک میں پال برنٹن نے بھی کچھ لکھا تھا۔ ذاکر صاحب نے اپنی ناساز طبیعت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ کشمیر آنا چاہتے ہیں اور یہاں بیس اکیس دن شور وغل کے بغیر گزارنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ۲۷ دسمبر ۱۹۴۷ء کو وہ اپنے خادم منظور کے ساتھ ریل میں کشمیر کیلئے روانہ ہوئے۔ جالندھر میں کچھ بلوائی ان کے ڈبّے میں گھس گئے اور اُن کا سارا سامان اُتار لیا یہ کہتے ہوئے کہ یہ ریل آگے نہیں جاسکتی ہے۔ منظور نے ان کے ساتھ بحث شروع کی۔ بلوائیوں نے اسے مارا پیٹا اور اسے اپنے ساتھ لے لیا۔ ذاکر صاحب کرتہ پائجامہ پہن کر خود بھی پلیٹ فارم پر اُتر آئے۔ بلوائیوں کو کہا کہ ان کے خادم کو چھوڑ دیا جائے۔ خوش قسمتی سے کیپٹن گوردیال ملک پلیٹ فارم پر ٹہل رہے تھے۔ انہوں نے ذاکر صاحب کو پہچانا اور فوراً اپنا پستول نکال کر بلوائیوں کو دکھایا اور اس طرح ذاکر صاحب کو قطعی موت سے بچالیا۔ ذاکر صاحب کو ویٹنگ روم میں رکھا گیا جب تک انہوں نے شاید راجندر سنگھ بیدی کے برادر کے ساتھ فون پر بات کی۔ بیدی صاحب اس علاقے کے کمشنر تھے۔ اس طرح ذاکر صاحب کو واپس بھیج دیا گیا مگر وہ کشمیر نہ آسکے۔ ذاکر صاحب جب دلّی پہنچتے تو پنڈت جی کو ساری روئیداد سنائی۔ فرمایا کہ جب وہ ویٹنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے اور کھڑکی کی طرف دیکھتے تھے تو بلوائی غصّے سے اُن پر جملے کس رہے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ "باہر آجاؤ، ہم تم کو مار ڈالیں گے"۔ پنڈت جی نے کہا۔ "آپ

کھڑکی کی طرف کیوں دیکھتے تھے؟'' خیر، جب میں نے تاریں بھیجیں، فون کیا تو انہوں نے سارا ماجرا سنایا۔ کہا کہ میری ساری چیزیں، جن میں میرے جمع کئے ہوئے خطبے تھے اور آٹوگراف بک، بلوائیوں نے لے لیں۔ اس آٹوگراف بک میں مجیب صاحب نے چار مختلف زبانوں میں لکھا تھا اور پال برنٹن کی ۱۹۴۲ء کی یہ عبارت بھی لکھی ہوئی تھی:

''اپنے ضمیر کے ساتھ وفا کرو۔ اس کی رہنمائی پر ایمان رکھو اور عمل پر اکسانے والے اس کے اشارے پر لبیک کہو اس کے باوجود کہ دنیا اسے سمجھ نہیں سکتی اور اس لئے غلط فہمی کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس پر عمل کرو تو حقیقتاً تجھے شادمانی اور کامیابی حاصل ہوگی۔ گھسی پٹی راہ پر چلنے سے نہ اتنی مسرت حاصل ہوگی اور نہ کامیابی۔[1]

میں نے ذاکر صاحب کے خطبات کے بہت اقتباسات حفظ کئے تھے۔ چنانچہ جب پروفیسر مجیب صاحب ذاکر صاحب کی سوانح لکھ رہے تھے تو میں نے مجیب صاحب کو بھی ایک اقتباس سنایا تھا۔ یہ اقتباس اس خطبے سے لیا گیا تھا جو ۱۹۴۱ء میں ذاکر صاحب نے آل سندھ ایجوکیشنل کانفرنس کراچی میں دیا تھا۔ اس کا تعلق اکثریت کی حکومت جمہوریت کے ساتھ تھا۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ فرقوں کے ساتھ منسوب سکولوں میں کوئی نقص نہیں اور نہ ان کے اغراض و مقاصد میں۔ اگرچہ ایسے سکولوں کی مخالفت بھی ہوتی ہے تب بھی ان کو برقرار رکھنا چاہیے اور اُن میں جان پیدا کرنی چاہیے۔

میں نے ۱۹۴۴ء میں ایم اے ہسٹری کا امتحان دیا۔ میرا اندازہ تھا کہ انقلاب فرانس پر میرا مضمون اچھا نہ ہوا۔ اس لئے میں نے امتحان بیچ میں ہی چھوڑ دیا۔ ۱۹۴۵ میں جب میں نے پھر امتحان دیا تو پاس ہوا۔ تین نمبروں کی کمی کی وجہ سے فسٹ ڈویژن ہاتھ سے گیا مگر

1 Be loyal to your innermost self, trust its guidance and obey its prompting even though the world cannot understand and therefore misunderstands. Do this and you will be more truly happy and more truly successful than by following the conventional road."

میں فسٹ آیا اور اس طرح موری سن میڈل حاصل کیا۔[1] اس سال کوئی بھی طالب علم فسٹ ڈویژن میں پاس نہ ہوا۔ شمشاد احمد کے بغیر کسی کو بھی سولہ سال میں فسٹ ڈویژن نہیں ملا تھا۔ شمشاد نہ بحث ومباحث میں حصہ لیتا تھا نہ آپسی گفتگو میں۔ کتاب کی ضرورت ہوتی تو اپنے بھائی کو لائبریری سے لانے کو کہتا تھا۔ اس کا ذہن صاف تھا ایسا کہ آکسفورڈ میں بھی اپنا لوہا منوا سکتا تھا۔ میرا حال تھا کہ امتحان سے چند روز پہلے ڈیڈرو (Diderot) کی کتاب ''ایک راہبہ کی سرگذشت'' (Memoirs of a Nun) پڑھ رہا تھا۔ یہ بھی کہ لائبریری میں کوئی کتاب دیکھی تو اس میں کھو گیا۔ یاد ہی نہیں رہا کہ امتحان کے دن ہیں۔ میں امتحان کیلئے اسباق پڑھنے میں اپنے ذہن کو کسی بھی صورت میں مرتکز (Concentrate) نہیں کر سکتا تھا۔ میں اپنی گزری ہوئی زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو دکھائی دیتا ہے کہ میرا ذہن کبھی منضبط (disciplined) نہیں تھا۔ جب میں نے علی گڈھ کو الوداع کیا تو اپنا ذہن جامعہ اور ذاکر صاحب پر مرتکز کر دیا۔

غالباً ۱۹۴۹ء میں شیخ محمد عبداللہ نے مجھے پیغام بھیجا کہ وہ علی گڈھ جا رہے ہیں، اس لئے میں بھی ان کے ساتھ جاؤں۔ امام الہند مولانا آزاد کو ذاکر صاحب کے ہاتھوں ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری ملنے والی تھی۔ علی گڈھ کا ماحول ابھی بھی دانشمندانہ نہیں تھا۔ وہاں مسلمان ابھی بھی سوچتے تھے کہ تمام دنیائے اسلام کا مرکز علی گڈھ یونیورسٹی تھا۔ مولانا کی

۱۔ دو سال میں نے شاندار طریقے پر گزارے۔ مباحثوں میں حصہ لیا اور خاصا امتیاز حاصل کیا۔ ٹروفی جیت لی اور لاہور میں، لکھنو میں، آگرہ میں انعامات حاصل کئے، میں نے علی گڈھ میں اپنے بھائیوں سے کہیں زیادہ امتیاز حاصل کیا۔ اس کا ثبوت ایک دن یہاں کشمیر میں حبیب صاحب نے دیا۔ فیضی صاحب نے Governing Classes of Medieval India پر توسیعی لیکچر دینے کیلئے ان کو مدعو کیا تھا۔ تمام شاگردوں نے جن میں خواجہ غلام محمد صادق مرحوم اور میرے بڑے برادر آغا ناصر صاحب بھی تھے، حبیب صاحب کے اعزاز میں چائے کا انتظام کیا۔ یہ ۱۹۵۹ء کا زمانہ تھا۔ جب گروپ فوٹو کھنچوانے کا موقع آیا تو حبیب صاحب نے مجھے اس طرح بٹھایا کہ وہ میری ایک طرف اور ان کی بیگم دوسری طرف تھی۔ آغا ناصر صاحب ڈپٹی کمشنر سرینگر کھڑے تھے۔

ریلوے اسٹیشن پر تضحیک کی گئی تھی۔ مولانا جب آئے تو گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرنے سے انکار کیا۔ اس میں لارڈ کرزن جیسے لوگ ٹھہرتے تھے۔ علی گڈھ کی روایت تھی کہ ایسے موقعوں پر مہمانانِ خصوصی کو کلاہِ لالہ رنگ پہنائی جاتی تھی۔ مگر انہوں نے یہ ٹوپی (کلاہِ لالہ رنگ) پہننے سے بھی انکار کیا۔ تقریب شروع ہوئی تو ذاکر صاحب نے اپنے عالمانہ رنگ میں تقریر کی۔ مولانا آزاد کے بارے میں فرمایا کہ ان کی زبان میں عربی کا کس، فارسی کا رَس اور ہندوستانی کا لوچ رچا ہوا ہے۔ اس کے بعد مولانا آزاد نے خطاب فرمایا۔ کہا کہ سرسید مرحوم کی خدمات بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کو مغربی تعلیم و تہذیب سے روشناس کیا اور انہیں جدید زندگی کا راستہ دکھایا۔ یہ تو ان کا اہم اور بنیادی کارنامہ تھا۔ مگر سیاسی اعتبار سے ان کا وہ مشورہ غلط ثابت ہوا جو انہوں نے ہندی مسلمانوں کو دیا۔ لوگوں نے ایسی تقریر ہی نہ سنی تھی جس میں سرسید کی شخصیت پر حرف لایا گیا ہو۔ دوسرے دن آزاد کو یونین کا ممبر بنایا گیا اور چھت سے گُل پاشی کی گئی۔ دوسرے دن ہی یونین کے صدر نے جو طالب علم ہوا کرتا تھا اپنی تقریر میں مولانا کا تعارف کرتے کرتے کہا۔ ''ابوالکلام کے صاحب کلام ہونے میں کس کو کلام ہے مگر ہمارے لئے کلام اللہ کافی ہے۔'' مولانا نے اپنی تقریر میں فرمایا ''قرآن کو جنون کیلئے استعمال کرنا اس کی بدترین توہین ہے مگر اس کی تعبیر کرے تو کون کرے۔''[1]

ذاکر صاحب اور شیخ صاحب شام کے وقت کھانا کھا رہے تھے۔ ذاکر صاحب نے الگ مجھ سے کہا۔ ''پروفیسر محمد حبیب کے پاس جایئے اور ان سے کہہ دیجئے کل شیخ صاحب بولنے والے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آئے جیسے آج آیا۔ اس سے کافی نقصان ہوگا۔ بات یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد بہت سارے مسلمان سوچنے لگے تھے کہ شیخ عبداللہ بہت بڑی دولت ہیں۔ دلّی اور آس پاس کے علاقوں میں قتل اور جائیداد کی تباہی

۱۔ الفاظ جو مولانا نے استعمال کئے ان میں ع غ کا فرق ہوسکتا ہے مگر مطلب صاف ہے۔

نے لوگوں کو بہت مشتعل بنایا تھا۔ لوگ نہ گاندھی جی کی بات سنتے تھے اور نہ پنڈت نہرو کی۔ شیخ عبداللہ نے رام لیلا گراؤنڈ میں تقریر کی تھی۔ بقول ذاکر صاحب جو انہی دنوں سرینگر سے واپس آئے تھے، شیخ صاحب نے رام لیلا گراؤنڈ میں وہ باتیں کیں جو ہندوستان کا کوئی لیڈر نہیں کرسکتا ہے۔ شیخ صاحب نے کہا کہ اگر ہندوستان کے لوگ چاہتے ہیں کہ کشمیر اُن کے ساتھ رہے تو ان کو پٹیالہ، کپورتھلہ اور سب پنجاب ریاستوں میں قتلِ عام بند کرنا ہوگا۔ تعجب ہے کہ انہوں نے شیخ صاحب کی بات سنی تھی۔ اس سے پہلے گاندھی جی نے صاف کہہ دیا تھا کہ انہیں کشمیر میں سورج کی کرن دکھائی دیتی ہے۔ رام لیلا گراؤنڈ میں شیر کشمیر نے یقیناً اپنا جلال دکھایا تھا۔ یہ جلال تاریخ میں سنہری حروف سے لکھا گیا ہے۔ بہرکیف شیخ عبداللہ نے تقریر کی مگر پہلے قرآن پاک سے چند آیات پڑھیں اور ان کا ترجمہ سنایا۔ ''مسلمانوں کو خدا نے منافقوں، دغابازوں..... سے بچایا۔'' ایک طالب علم نے ''غداروں سے'' بڑھایا۔ مطلب یہ کہ شیخ نے کشمیر کا الحاق پاکستان کے ساتھ نہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ ''میں غدار کی حیثیت سے آپ کے سامنے کھڑا ہوں اور آپ کو کشمیر کی کہانی سنانا چاہتا ہوں۔ ہم نے جب تحریک شروع کی تو دیکھا کہ جاگیردار کاشتکاروں کے ساتھ استحصالی سلوک کررہے تھے۔ اکثر جاگیردار اگرچہ ہندو تھے مگر کچھ مسلمان بھی تھے۔ ان کا استحصال ایک جیسا تھا۔ ہماری لڑائی معاشی تھی، مذہبی نہیں۔ اس لڑائی میں ٹکراؤ جاگیردار اور کاشتکار کے درمیان تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ شیخ صاحب کی تقریر سے لوگ بہت متاثر ہوئے تھے یہاں تک کہ جب میں باہر نکلا تو دو لڑکے آپس میں باتیں کررہے تھے۔ ''یار یہ (شیخ عبداللہ) مولانا سے بھی بڑے تیز نکلے''۔ ایک لڑکا دوسرے لڑکے کو کہہ رہا تھا۔

ہندوستان کے مسلمانوں کو صحیح راستہ دکھانے میں مولانا آزاد نے بہت گرانقدر خدمات انجام دیں۔ انہوں نے نہ کبھی قائداعظم جناح کا نام لیا اور نہ پاکستان کا۔ ہمیشہ یہ کہا کہ سب نردوش ہیں۔ مگر بوجھ ان کے کاندھوں پر ہے کہ وہ مسلمانوں کو خودکشی کرنے سے روک نہ سکے۔ یہ بات ان کے بارے میں ایک انگریز سوانح نگار نے بھی لکھی ہے۔

اس کا بھی خیال ہے کہ ہندوستان کی تقسیم خودکشی کے مترادف تھی۔ غبار خاطر میں مولانا نے تو صاف صاف کہہ دیا ہے کہ وہ جسے حق سمجھتے ہیں، اسے قبول کرتے ہیں۔ اس پر ڈٹ کر رہتے ہیں اور اس سے ذرہ بھر بھی نہیں ہٹتے۔ کوئی پرواہ نہیں کرتے کہ ان کی بات کوئی سنتا ہے کہ نہیں یا اُن کا نظریہ قبول کرتا ہے کہ ٹھکراتا ہے۔[1] مولانا کو اللہ نے دانش کی خود مختاری اور سرداری بخشی تھی۔ ان کا کانگریس کے ساتھ جانا نہ کوئی جبر تھا اور نہ عوام کے ساتھ ہاں میں ہاں ملانے کی مجبوری۔ نہرو صحیح کہتے تھے کہ آزاد روشن دماغ تھے جو مسئلے کی تہہ تک پہنچ جاتے تھے۔ اس کا تانا بانا الگ کر دکھاتے تھے اور اس کی کھلی نقاب کشائی کرتے تھے۔ جو بھی اُن سے ملتا، ان کی باتیں سنتا تو یقیناً بول اٹھتا کہ آزاد موثر شخصیت ہیں جو تحریک آزادی میں عوام کے سامنے سیدھے کھڑے ہیں۔ آزاد اس زمانے میں پیدا ہوئے تھے جس زمانے میں اُن جیسے لوگ ناپید تھے۔ وہ عظیم پرانی چیزوں کو پھر سے قوت بخشتے تھے۔ مخزنِ علم میں احیائے علم کرتے کرتے خود قاموس (Encyclopaedia) بن جاتے تھے۔

۱۔ بازار میں ہمیشہ وہی جنس رکھی جاتی ہے، جس کی مانگ ہوتی ہے۔ اور چونکہ مانگ ہوتی ہے، اس لئے ہر ہاتھ اس کی طرف بڑھتا ہے اور ہر آنکھ اسے قبول کرتی ہے۔ مگر میرا معاملہ اس سے بالکل الٹا رہا۔ جس جنس کی بھی عام مانگ ہوئی، میری دکان میں جگہ نہ پا سکی۔ لوگ زمانہ کے روز بازار میں ایسی چیزیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر لائیں گے، جن کا رواج عام ہو۔ میں نے ہمیشہ ایسی جنس ڈھونڈ ڈھونڈ کر جمع کی جس کا کہیں رواج نہ ہو۔ اوروں کیلئے پسند و انتخاب کی جو علت ہوئی، وہی میرے لئے ترک و اعراض کی علت بن گئی۔ انہوں نے دکانوں میں ایسا سامان سجایا جس کیلئے سب کے ہاتھ بڑھیں۔ میں نے کوئی چیز ایسی رکھی ہی نہیں جس کیلئے سب کے ہاتھ بڑھ سکیں!

.....

لوگ بازار میں دکان لگاتے ہیں تو ایسی جگہ ڈھونڈ کر لگاتے ہیں جہاں خریداروں کی بھیڑ لگتی ہو۔ میں نے جس دن اپنی دکان لگائی، تو ایسی جگہ ڈھونڈ کر لگائی جہاں کم سے کم گاہکوں کا گزر ہو سکے!

.....

مذہب میں، ادب میں، سیاست میں، فکر و نظر کی عام راہوں میں جس طرف بھی نکلنا پڑا، اکیلا ہی نکلنا پڑا، کسی راہ میں بھی وقت کے قافلوں کا ساتھ نہ دے سکا۔

(غبار خاطر، خط نمبر (۱۱)

اب میں کینٹول سمتھ (Cantwell Smith) کی طرف متوجہ ہوجاؤں گا[1]۔ جس کی دیدۂ بینا نے ''ہندوستان میں عصر جدید کا اسلام'' (Modern Islam in India) کتاب لکھی۔ اس کتاب میں علی گڈھ پر مکمل باب ہے اور جامعہ پر بھی بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ سمتھ نے لکھا ہے کہ لیگ کی طرف سے علی گڈھ کی پیش قدمی جذباتی عمل تھا نہ کہ فکری۔ یہ بدقسمت رجحان تھا۔ پروفیسر مجیب نے دی انڈین مسلمز میں اقبال اور آزاد پر جو بحث کی ہے۔ اس سے اقبال کی رومانوی شخصیت کا پتہ لگتا ہی ہے مگر اس وقت کے علی گڑھ کے حالات کا بھی اشارہ ملتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ہندی مسلمانوں نے دو بڑے لیڈر پیدا کئے، علامہ اقبال اور مولانا آزاد۔ ان دونوں میں صلاحیت تھی کہ مسلمانوں کے عمل صالح کی نشاندہی کریں۔ ایک نے یہ کام کیا نہیں یعنی اقبال[2]۔ دوسرے نے کر دکھایا مگر تنہا رہ گئے۔

۱۔ میں سمتھ سے کئی بار ملا ہوں۔

۲۔ شاعر مشرق کی وفات پر مجیب صاحب نے ریڈیو پر جو تقریر کی تھی اس میں سچ مچ مجیب صاحب نے دریا کو کوزے میں بند کیا تھا۔ میں نے یہ تقریر ''دعوت فکر'' میں شوق سے چھاپی ہے۔ یہ تقریر مجیب صاحب کی فکری اڑان کا نادر نمونہ ہے۔ اس تقریر سے کچھ حصے:

''لوگوں نے انہیں سیات میں اُلجھایا، اُن کی بات نہیں سمجھے۔ ان کی زبان سے اپنی بات کہلوانے کی فکر میں لگے رہے۔ ان کی بڑی غرض کو اپنی حقیر اغراض کا روپ دیکر اسے رسوا کیا۔ ان کے بڑے کام کے بہانے سے اپنا چھوٹا کام نکال کر انہیں اور ساری دنیا کو دھوکا دیا۔''

..... ''ڈاکٹر اقبال کا بڑا دل چھوٹے کاموں میں لگ ہی نہ سکتا تھا اور کوئی مانے یا نہ مانے ان کا دل بڑا کام کر بھی گیا..... جس عمل کو وہ سچا عمل سمجھتے تھے وہ غور کیجئے تو ان کے اپنے کارناموں کا بس دوسرا رُخ ہے''.....

..... ''چھوٹی شخصیتیں سمندر کی کشتیوں کی طرح چاہتی ہیں کہ احتیاط کا لنگر ہو، ہر دل عزیزی کا بادبان ہو، قومی جذبات کی ہوا موافق ہو اور چلتی رہے۔ ستانے اور پناہ لینے کیلئے ذاتی زندگی اور معاملات کا ساحل قریب رہے تب کہیں وہ اپنی چال دکھا سکتی ہیں اور منزل تک پہنچانے کا حوصلہ کر سکتی ہیں۔ وہ موج تو چیز ہی اور ہوتی ہے جو سمندر کی تھاہ لیتی ہے کہ گہرائی کافی ہے یا نہیں، ہوا کو للکارتی ہے کہ دم ہو تو ذرا اپنا زور دکھا۔ آسمان سے کہتی ہے کہ ذرا اور اونچا ہو سکتے ہو تو ہو جا۔ اسے ساحل سے عداوت ہوتی ہے۔ وہ آپ اپنی منزل ہوتی ہے، اسے کہیں جانا نہیں ہوتا۔ اس کے لئے اُٹھنا اور تڑپنا بس ہے۔ ڈاکٹر اقبال کی شخصیت ایسی ہی ایک موج تھی اور اس کا سمندر عالم اسلام تھا۔

یعنی آزاد۔ یہ مجیب صاحب کے مشاہدے کا نچوڑ ہے۔ تاریخ ہمارے سامنے رفتہ رفتہ اپنا نقاب کھول رہی ہے۔ ہم دیکھیں گے کہ وقت کے بہتے ہوئے دھارے سے مولانا آزاد کا نظریہ حق بجانب ثابت ہوتا ہے یا اقبال کا اور ہر شخص تاریخ کا خود مشاہدہ کرسکتا ہے۔ پروفیسر حبیب نے جو علی گڈھ میں تاریخ کے عظیم پروفیسر تھے۔ ۱۹۵۹ء میں سرینگر میں صاف کہدیا کہ ''دس سال کے مختصر عرصے میں محمد علی جناح نے اسلام کو وہاں پہنچانے میں کامیابی حاصل کی جہاں ۷۱۲ء میں محمد بن قاسم نے اس کی شروعات کی تھیں۔ یہ صحیح تھا یا غلط، مجھے معلوم نہیں!'' حبیب صاحب کے یہ الفاظ حسب معمول انفی اصوات کی چھلنی سے نکل آئے تھے۔

جامعہ جانے سے پہلے خود جامعہ کے بارے میں چند سطور لکھوں تو مناسب ہوگا۔ ۱۹، اکتوبر ۱۹۲۰ء کو جامعہ وجود میں آیا۔ مرحوم مولانا محمد علی علی گڈھ تشریف لائے اور علی گڈھ یونین میں تقریر کی۔ جذبات اور عقل وفکر کو جھنجھوڑنے والی یہ تقریر سنہری حروف سے لکھی گئی ہے۔ ذاکر صاحب کی آنکھوں میں بھی سُنتے سُنتے آنسو چھلک اُٹھے۔ بس اُسی دن سڑک کے اس پار جامعہ ملیہ اسلامیہ خیموں میں وجود میں آیا۔ جن لوگوں نے ذاکر صاحب کی پیٹھ ٹھونکی تھی ان کا جوش رفتہ رفتہ سرد مہری ایام اور زمانے کی گردش سے ٹھنڈا پڑ گیا۔ ذاکر صاحب ۱۹۲۲ء میں پی، ایچ، ڈی کے لئے جرمنی گئے تھے۔ حکیم اجمل خان مرحوم اور ڈاکٹر مختار انصاری مرحوم نے ان کو اطلاع دی کہ جامعہ کے بند ہونے کے امکانات بڑھ رہے ہیں۔ ذاکر صاحب نے دونوں کو مشورہ دیا کہ جامعہ بند نہ کیا جائے کیونکہ وہ خود آرہے ہیں اور نامساعد حالات کے ہوتے ہوئے بھی جامعہ کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ چنانچہ ۱۹۲۶ء میں ذاکر صاحب، مجیب صاحب اور عابد حسین صاحب واپس آگئے۔ جامعہ کو ہاتھ میں لے لیا۔ مگر حکیم اجمل خان صاحب نے اسے علی گڈھ سے چھڑا کر قرولباغ دلی میں چالو کیا۔ کچھ مکان اس غرض کیلئے کرائے پر لئے گئے۔ ساتھ ہی جامعہ ملیہ اسلامی سوسائٹی کا قیام عمل

میں لایا گیا۔ ذاکر صاحب وغیرہ ہم نے استادوں کا ایک جتھہ اپنے ساتھ کام کرنے کیلئے تیار کیا۔ سبوں نے حلف اٹھایا کہ وہ قومی خدمت انجام دینگے اور سو روپے ماہانہ کم اُجرت لیں گے، تاحیات یا بیس پچیس سال تک کام کرتے رہیں گے۔ اس طرح ہاتھ سے ہاتھ ملا کر سب لوگ ہمت سے کام کرنے لگے۔ قریباً دس سال کے عرصے میں اوکھلا میں زمین خریدی گئی اور دھیرے دھیرے ۱۹۳۶ء، ۱۹۳۹ء اور ۱۹۴۱ء میں جامعہ قرولباغ سے اوکھلا منتقل ہوا۔ مکانات بنتے گئے اور کبھی نشیب کبھی فراز سے گزرتے ہوئے جامعہ وہاں پہنچا جہاں آج ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ جس طرح علی گڈھ کا پہلا گریجویٹ ہندو تھا، اسی طرح جامعہ ملیہ اسلامیہ کا پہلا گریجویٹ بھی ہندو تھا، پنڈت کیلاش ناتھ کول صاحب جو علم نباتات میں ماہر تو تھا ہی مگر اپنی ہمہ گیر قابلیت اور اہلیت کی وجہ سے مشہور و معروف تھا۔ یہاں کشمیر میں اس نے پارکس اینڈ گارڈنز (Parks and Gardens) میں گرانقدر خدمات انجام دیں۔ ایک ایک کشمیری اس کی لیاقت کی داد دیتا ہے۔ آج کے کشمیر میں بھی جب اُن کے تعمیری کام پر نظر پڑتی ہے تو تحسین بھرے کلمات زبان پر چڑھتے ہیں۔ ان کاموں میں چشمہ شاہی کے نیچے تقریباً جھیل ڈل کے کنارے اُن کا باغ نباتات (Botanical Garden) دیکھنے کی چیز ہے۔ کول صاحب پنڈت جواہر لال کا برادر نسبتی تھا، اس لئے کشمیری اس کو ماما جی کے نام سے پیار سے پکارتے ہیں!

میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ علی گڈھ میں تعلیم ختم کرنے کے بعد میں نے ایم۔اے کا امتحان ۱۹۴۴ء میں دیا۔ انقلاب فرانس پر میرا مضمون اچھا نہ ہوا اس لئے میں نے امتحان ادھورا چھوڑا اور میں سیدھا دلّی پہنچا۔[1] اس وقت میری جیب میں پانچ روپے چار آنے

۱۔ اگرچہ میں ۱۹۴۴ء میں ہی جامعہ آیا مگر میری ثانوی درجے کے استاد کی حیثیت سے تقرری ۱۹۴۵ء میں 65-2½-45 گریڈ میں ہوئی مگر میری تنخواہ اسی گریڈ میں پچپن روپے ماہوار سے شروع ہوئی۔ دس سال کی سالانہ ترقی یعنی دس روپے مجھے پہلے ہی دی گئی۔

تھے۔ تانگے پر سارا ساماں لاد کر میں دلّی سے اوکھلا روانہ ہوا۔ اوکھلا پہنچا تو تانگے والے کو پانچ روپے دیئے۔ جیب میں پھر وہی چار آنے رہ گئے۔ تیرہ اپریل ۱۹۴۴ء کو میں جامعہ پہنچا۔ اس دن وہاں قومی دن منایا جا رہا تھا۔ یہ دن ہر سال جلیانوالہ باغ کی یاد میں منایا جاتا تھا۔ اس دن چوتھے درجے کے سب ملازموں کو چھٹی دی جاتی تھی۔ طلباء اور اساتذہ جامعہ کے پاخانے، ہوسٹل، ہال اور کمرے صاف کرتے تھے اور مرکزی مطبخ میں کھانا پکاتے تھے۔ پھر چوتھے درجے کے ملازمین کو مہمانوں کی حیثیت سے کھانا کھلایا جاتا تھا۔ طلباء اور اساتذہ انہیں کھانا کھلانے میں خوشی محسوس کرتے تھے۔ اس طرح دیگر امور کی طرح جامعہ میں بہترین روایات قائم کرتے تھے۔ جامعہ کی انسانی برادری دیکھ کر میں کتنی مُسرّت حاصل کرتا تھا اور اپنے مستقبل کے تانے بانے تیار کرتا تھا۔[1] گو کہ میں ان دنوں بنیادی طور پر امتحان کی تیاری کر رہا تھا تاہم ذاکر صاحب کے انگریزی خطبات بھی جمع کر رہا تھا۔ میں نے سترہ اٹھارہ خطبے جمع کئے تھے۔ اس کے علاوہ ان کی ریڈیو پر کی گئی دو تین تقریریں بھی جمع کی تھیں۔ ذاکر صاحب نے جرمنی کے فلسفیوں اور ماہرین نفسیات سے تعلیمی فلسفہ حاصل کیا تھا۔ میں انہیں نزدیک سے دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

۱۔ یہ دنیا ہی عجیب تھی اور مختلف۔ اس میں سرے ہی سے پیسے نہیں تھے۔ انسان عام رسوئی میں جاتا تھا اور کھانا کھاتا تھا۔ دونوں وقت دال روٹی۔ یہ بے غم اور آزادانہ زندگی کے ایام تھے۔ ذاکر صاحب گاہے گاہے خود بھی تشریف لاتے اور چند استادوں کے ساتھ ہمکلام ہو جاتے۔ برلن میں اقتصادیات کے پروفیسر ورنر سومبرٹ (Werner Sombart) اور پروفیسر شپلانگر کے حوالے سے گفتگو کرتے۔ اس طرح اپنے تجربات اور بڑے لوگوں کے ساتھ اپنے مصاحبت کے ذائقے اپنے رفیقوں کے ساتھ بانٹتے تھے۔ برلن میں ذاکر صاحب، مجیب صاحب اور عابد صاحب کا اکٹھے ہونا محض اتفاق تھا یا زمانے کی فیاضانہ روش، میں نہیں سکتا مگر یہ تو صحیح ہے کہ یہ تین اور ان کے ساتھ مرحوم شفیق الرحمٰن قدوائی جامعہ کے چار ستون تھے۔ یہ چاروں یک جان و چار قالب تھے۔

ذاکر صاحب نے اپنی ایک ریڈیائی تقریر میں شخصیات کی اقسام پر روشنی ڈالی تھی۔ یہ اقسام دراصل سپلانگر کی ایک کتاب سے ماخوذ ہیں جو اس فاضل پروفیسر نے نفسیاتی زاوئیہ نگاہ سے لکھی تھی۔ یہ چھ اقسام کچھ اس طرح ہیں:

(۱) مثالی انسان جو تلاش حق میں مصروف رہتا ہے۔ (۲) مذہبی انسان جو نجات کا راستہ تلاش کرتا ہے اور جس کی آرزو بھی نجات ہی ہوتی ہے۔ (۳) اقتصادکا گرویدہ جو صرف نفع کے پیچھے لگا رہتا ہے۔ (۴) جمالی انسان جس کا ہدف حسن و جمال ہے۔ جو اندرونی جمال کثرت اشیاء میں مشاہدہ کرتا ہے۔ (۵) سیاسی انسان جس کا مدّعا صرف اقتدار ہے۔ (۶) مجلسی انسان جو عشق کا طالب ہے۔ گو کہ انسان اپنے ذاتی مزاج یا اپنی سیرت کی بنیاد پر اپنا کردار بنانے کی سعی کرتا ہے تاہم عام طور پر ملا جلا رنگ اختیار کرتا ہے۔ مگر ملے جلے رنگ میں بھی چھ میں سے ایک رنگ بنیادی طور پر جھلکتا نظر آتا ہے۔ اگر بچے کا رجحان دریافت ہو جائے تو اس کے لئے ایسی تہذیبی خصائل مہیّا کی جائیں جو اُس رنگ کے کسی شخص نے اپنے اندر پیدا کی ہوں۔ اُستاد اپنے آپ کو مجلسی رنگ میں رنگ لیتا ہے۔ وہ خود نرمل ہوتا ہے اس لئے بچے کی پنپتی نرملتا اُسے بھلی لگتی ہے۔ شپلانگر پھر کلّی تہذیب کا کلیہ اختیار کرتا ہے یہ دکھانے کیلئے کہ یہ سب رنگ آخر پر کلّی تہذیب میں ملتے ہیں۔ راستے اگرچہ الگ ہیں مگر ان کی منزل ایک ہی ہے جسے ہم کلّی تہذیب یا معروضی تہذیب کہتے ہیں۔ جرمنی کے تعلیم نظام میں تعلیم کے معانی ہیں فرد کا پھر سے معروضی تہذیب میں شامل ہونا۔ ذاکر صاحب کہتے ہیں کہ ہر تہذیب کے دو بنیادی عناصر ہوتے ہیں، ایمان اور ربط و ضبط۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ تہذیب اصل میں کردار (Character) ہے۔

ذاکر صاحب اپنے تخلیقی کارپردازوں، رفیقوں اور استادوں کو سیاست کے گرد و غبار میں اٹا ہوا نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کی ۱۹۴۱ء، ۱۹۴۶ء کی تقریروں میں بڑے بڑے

سیاسی راہنما حصہ لیتے تھے۔[1] انہوں نے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ تعلیمی سیاست کے منفی اثرات کیا ہوتے ہیں خاص کر ہمارے ملک میں جہاں سیاست ایک جھرنے کی طرح پہاڑوں سے نکل کر بہتی ہے مگر دوسرے ہی دن سوکھ جاتی ہے۔ برعکس اس کے تعلیم دھیرے دھیرے بہنے والی ندیا ہے جو سردیوں میں ہی پانی سے بھری نہیں ہوتی بلکہ گرمیوں میں جھومتی بل کھاتی ہوئی بہتی ہے۔ جب پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف پگھلتی ہے۔ تعلیم میں وقت کی ضرورت ہے، جوش کی نہیں۔ جوش سیاست کا طرّہ ہے۔ یہ بات اس نے جناح اور نہرو کو بھی ان الفاظ میں بتائی تھی۔ ''سیاست شدت چاہتی ہے، تعلیم مدت''۔[2] تعلیم کا کارنامہ پروفیسر عابد حسین ہے جس نے گاندھی اور نہرو کی خودنوشتہ سوانح

۱۔ ۱۹۴۱ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں بیسک ایجوکیشن کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کی صدارت ڈاکٹر راجندر پرشاد نے کی۔ ذاکر صاحب نے استقبالیہ ایڈرس میں فرمایا ''ہم کب تک اس سیاسی ریگستان میں ہل چلائیں، ہم کب تک اس ڈر سے تھرّاتے رہیں کہ ہماری عمر بھر کی محبت، عمر بھر کے کام کو کوئی ایک سیاسی ضد، کوئی ایک سیاسی حماقت بھسم کر دے گی۔ ہمارا کام بھی کوئی پھولوں کی سیج تو ہے نہیں۔ اس میں بھی بہت مایوسیاں ہوتی ہیں اور اکثر دل ٹوٹتا ہے۔ پھر جب ہمارے قدم ڈگمگائیں تو ہم کہاں سہارا ڈھونڈھیں۔ اسی دیس میں جہاں بھائی بھائی ایک دل نظر نہیں آتے، جہاں کوئی قدر آخری قدر معلوم نہیں ہوتی۔ کوئی گیت نہیں جسے سب مل کر گائیں، کوئی شادی نہیں جسے سب مل کر رچائیں، کوئی تہوار نہیں جسے سب مل کر منائیں۔ کوئی دکھ نہیں جسے سب بٹائیں۔ ہماری مشکل دور کیجئے۔ اور دیر نہ جانے کیا دن دکھائے۔

۲۔ ۱۹۴۶ء میں نومبر کے مہینے میں جامعہ ملیہ اسلامیہ نے سلور جبلی منائی۔ اس تقریب پر محمد علی جناح، لیاقت علی خان، مولانا آزاد، پنڈت نہرو، عاصف علی اور شری راج گوپال اچاریہ موجود تھے۔ ذاکر صاحب نے فرمایا کہ خدا کے واسطے اس ملک کی سیاست کو سدھاریئے۔ یہ وقت اس تحقیق کا نہیں ہے کہ آگ کس نے لگائی، کیسے لگی۔ یہ وقت آگ بجھانے کا ہے۔ خدارا اس ملک کی تہذیبی بنیادوں کو اس طرح نہ کھنڈلنے دیں۔

سیاست خصوصاً ہمارے ملک میں ایک پہاڑی نالہ ہے۔ آناً فاناً چڑھتا ہے اور دیکھتے دیکھتے اُتر جاتا ہے۔ تعلیم ایک دھیمے دھیمے بہتے ہوئے میدانی دریا کی طرح ہے جو برسات ہی میں نہیں بہتا، گرمیوں میں بھی پہاڑوں کے برف جیسے دل کو پگھلا کر اپنی روانی کا سامان پیدا کرتا ہے۔ سیاست استحکام وجود قومی کی تمنّا ہے، فطرتاً بے تاب۔ تعلیم اقدارِ مطلقہ کی عاشق (باقی اگلے صفحے پر)

عمریوں کا ہی نہیں، مشہور زمانہ فلسفی امینول کانٹ کی کتاب Critique of Pure Reason کا ترجمہ بھی اُردو میں کیا ہے۔ ذاکر صاحب خود فرماتے تھے کہ عابد حسین کا ترجمہ کرٹیک کے انگریزی ترجمے سے بہتر ہے حالانکہ جرمن زبان کے لمبے لمبے جملوں کا اردو زبان میں ترجمہ کرنا آسان نہیں۔ ذاکر صاحب کے یہ بول عابد صاحب کی قابلیت اور اہلیت کی سند ہیں۔

۱۹۴۵، ۱۹۴۶ء کا زمانہ تھا۔ جامعہ معاشی اعتبار سے مشکل حالات سے گزر رہا تھا۔ ذاکر صاحب چندے کیلئے حیدر آباد چلے گئے اور وہاں سے سلور جُبلی کیلئے پیسہ لیکر آئے۔ بقول ذاکر صاحب ''جامعہ غریب ہے مگر غربت ہی اس کا افتخار ہے اور اس کی شان''۔ حقیقتاً وہاں حقیقی عزت تھی۔ زندگی سادی تھی مگر پاکیزہ۔ خوراک مطبخ سے آتی تھی جو ایسی خدمات انجام دیتا تھا جیسے کوئی مذہبی لنگر۔ دال روٹی اور سبزیاں ہفتے میں دو بار اور پھر گوشت۔ میرا خیال ہے کہ لائبریری اچھی تھی۔ کچھ کتابیں مل ہی جاتی تھیں۔ اگر مجھے اور کتابوں کی ضرورت پڑتی تو میں علی گڈھ جاتا اور وہاں سے لاتا۔ میں نے جو کتابیں جامعہ سے اٹھائی تھیں اور جو رشید احمد صدیقی صاحب کی وساطت سے علی گڈھ سے ادھار لی تھیں۔ میرے ایک ساتھی کے ذریعے ۱۹۴۷ء میں لائی جارہی تھیں مگر راولپنڈی میں رہ گئیں۔ ذاکر صاحب کے پرائیویٹ سیکریٹری مجتبیٰ صاحب زیدی راولپنڈی چلے گئے۔ وہاں اُن دو لڑکوں کے پاس چلے گئے جو یہاں جامعہ میں پڑھتے تھے۔ ان دو لڑکوں نے کتابوں کے صندوق حاجی طلا محمد صاحب کے پاس رکھ چھوڑے تھے۔ مجتبیٰ صاحب نے یہ صندوق کھول دئے اور میری جامعہ اور علی گڑھ والی کتابیں نکال دیں۔ باقی کتابوں کو صندوقوں میں رہنے

(گذشتہ سے پیوستہ) ہے، لازماً صبر طلب۔ سیاست شدت چاہتی ہے، تعلیم مدت۔ سیاست کے پروگرام آئے دن بدلتے رہتے ہیں۔ تعلیم کا پہلا منصوبہ ہی اتنا عالمگیر ہے کہ ختم نہیں ہوتا۔

ملالِ عالمیاں دم بدم دگرگوں است منم کہ مدتِ عمرم بیک ملال گذشت

دیا۔ مجتبیٰ صاحب نے وہ دس کتابیں لاکر میرے حوالے کیں۔ مجتبیٰ صاحب کا ایثار جامعہ کا ایثار تھا۔ اب سرحد پار کی کہانی! جناب خان بہادر نظام الدّین صاحب پاکستان ریلوے کے جنرل منیجر تھے۔ وہ میرے برادر آغا شوکت علی کے سُسر تھے۔ میں نے منیجر صاحب سے درخواست کی کہ وہ میری باقی ماندہ کتابیں بھجوانے میں مدد کریں۔ انہوں نے صاف کہہ دیا کہ انہیں سوچنا پڑے گا کہ پاکستان کی ملی جائیداد دوسرے ملک میں بھیجی جاسکتی ہے کہ نہیں۔ اس کہانی سے تقسیم ہند سے پیدا شدہ درد بھری نفسیات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ میری اپنی کتابیں جن کی تعداد سو سے زیادہ نہیں تھی، پسماندہ جائیداد میں شامل کی جارہی تھیں۔ یہ وہ دن تھے جب مرحوم لیاقت علی خان نے فرمایا تھا کہ ان کے (پاکستان) پاس قلم، کاغذ، دوات نہیں۔ لیاقت علی خان صاحب اس قسم کی غزل خوانی کرتے تھے مگر نظام الدین صاحب کی بات سُن کر میں رُک سا گیا تھا۔ وہ کتابیں مجھے کبھی نہیں ملیں۔

جامعہ کے دنوں کی ایک اور کہانی ایک تخت پوش کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد میں ایک مکان میں رہنے لگا جس میں عبیداللہ سندھی مرحوم رہتے تھے۔[1] اس گھر میں سیاہ ٹیک سے بنا ہوا تخت پوش تھا جو ذاکر صاحب نے گرڈا فلپس بورن (Gerda Philipsborn) کیلئے اصل میں بنوایا تھا۔ گرڈا یہودن رقاصہ تھی جسے غالباً ذاکر صاحب نے فریفتہ کیا تھا۔ وہ برلن میں اپنا سارا کام چھوڑ کر یہاں جامعہ میں کام کرنے آئی تھی۔ جامعہ میں اس نے کنڈرگارڈن کا کام سنبھالا تھا۔ اس نے جامعہ میں بہت وقت گزارا اور

۱۔ عبیداللہ سندھی مرحوم کا کیا کہنا۔ عالم و فاضل شخص تھے۔ جامعہ کا ہر شخص ان کے گُن گاتا تھا۔ ۱۹۴۴ء میں جب میں جامعہ پہنچا تو وہ رحلت فرما گئے۔ پچھتر چھہتر سال کی عمر میں دلی سے پیدل سفر کرتے اور اس طرح چھ آنے بچاتے۔ وہ بیت الحکمت بنانا چاہتے تھے۔ ہاروں اور مامون نے بھی بیت الحکمت بنایا تھا تاکہ اسلام کو اُس زمانے کے ساتھ ہم آہنگ کیا جائے۔ سندھی صاحب کی بھی آرزو تھی کہ اسلام کو عصر جدید کے ساتھ جوڑ دیا جائے۔

وقت نے اسے سرطان کے حوالے کیا۔ وہ دو کمروں والی ایک کٹیا میں رہتی تھی جسے اب بھی غریب خانہ کہتے ہیں۔ تعلیم خطبات اسی گرڈافلپس کے نام منسوب ہے۔ بیگم عابد حسین نے ایک ناول لکھا ہے جس میں غالباً اسی گرڈا کی کہانی چھپی ہوئی ہے۔ خود مجیب صاحب نے مجھے بتایا کہ جرمنی میں تربیس لڑکیاں پی ایچ ڈی کرتی تھیں۔ وہ ہمیشہ ذاکر صاحب کی آنکھوں کی طرف دیکھتی رہتی تھیں۔ لگتا ہے کہ ذاکر کو آنکھ لگ گئی تھی اور ان کی ایک آنکھ گلوکوما کا شکار ہوگئی تھی۔ بہرحال میں جب انگلستان چلا گیا مجھے ذاکر صاحب، عابد صاحب اور مجیب صاحب کی گھر والیوں نے نوکروں کے ذریعے پیغام بھیجے کہ تخت پوش اُن کا ہے۔ اس لئے ان کے حوالے کیا جائے۔ میں شش و پنج میں پڑ گیا کہ تخت پوش کس کے حوالے کروں۔ میں خود بھی ذاکر صاحب کی وجہ سے اسے رکھنا چاہتا تھا مگر مجیب صاحب کی محبت غالب آئی اس لئے میں نے تخت پوش ان کی بیگم کے پاس بھیجد یا۔ وقت گزرتا گیا، جامعہ کی حالت بھی بدل گئی۔ اس کی غربت کا زوال آ گیا۔ جامعہ کی مالی حالت بہت سدھر گئی اور مجیب صاحب کے جدید طرز کے سادہ مکان میں بھی سامان آ گیا اور اس نے زیادہ خوبصورت رنگ اختیار کرلیا۔ بیگم مجیب نے تخت پوش میری ساس کے گھر واپس بھیج دیا۔ پھر جب ہمارا سامان سرینگر آ گیا تو اس کے ساتھ تخت پوش بھی آ گیا۔ آجکل گرڈا کیلئے بنایا گیا یہ تخت پوش میرے سونے کے کمرے میں ہے اور ہر روز اُن سنہرے ایام کی یاد دلاتا ہے۔ ذاکر صاحب کی خصوصاً!

ہندوستان کا بٹوارہ ہوا تھا۔ مجیب صاحب ہمیں چونکا دیتے تھے یہ کہتے کہتے کہ وہ اب زیادہ خوش ہیں اس لئے کہ تقسیم کے بعد اب ان کا رجحان زیادہ فطری ہوگا۔ دیہات کے رہنے والے ریفوجی کیمپ میں رکھے گئے تھے۔ مجیب صاحب نے ایک دن ذاکر صاحب سے کہا ''کوئی کام نہیں، اب میں کیا کروں؟'' ذاکر صاحب نے جواب دیا کہ انکے گلابوں کو کٹائی کی ضرورت نہیں ہے؟ اگر بلوائی بھی آئیں اور جامعہ پر دھاوا بول دیں، پھر بھی وہ

(ذاکر صاحب) چاہتے ہیں کہ ہر چیز صاف ہو اور شفاف۔ ذاکر صاحب کا یہ انداز مسلّم اور فکر انگیز مگر میں نے اس دوران فیصلہ کیا کہ سرینگر جاؤں۔ میں سرینگر تو پہنچا مگر واپس دلی جانے میں مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ میری والدہ اپنے ورنڈے پر روتے روتے مجھے کوسنے لگی کہ لوگ دلّی میں قتل کئے جا رہے ہیں اور میں اسی قتل گاہ میں واپس جانا چاہتا ہوں۔ میں نے اسے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ جامعہ میرا میدانِ عمل ہے اور مجھے وہاں جانا ہے، بس! مجھے معلوم نہیں میرے علی گڈھ کے ساتھی خواجہ غلام محمد شاہ کو شیخ محمد عبداللہ مرحوم نے کون سا کام دیا تھا مگر وہ ایک چھوٹے کمرے میں بیٹھا تھا اور لوگوں کو دلّی جانے کا ہوائی پرمٹ دیتا تھا۔ یہ نومبر ۱۹۴۷ء کے ابتدائی ایام تھے۔ میں نے بھی پرمٹ حاصل کیا اور دلّی واپس جانے کا پروگرام طے ہوا۔ مظفر آباد سے کچھ لوگ آئے تھے۔ ان میں سکھوں کی خاصی بڑی تعداد تھی۔ وہ ہوائی اڈے پر رو رو کے ماتم کر رہے تھے۔ ہوائی جہاز دن میں دو دفعہ جاتا تھا۔ سردار پٹیل خود ہوائی اڈے پر موجود تھا۔ اپنی آنکھوں سے حالات کا مشاہدہ کرنے آیا تھا۔ اس کے گرد لوگ جمع ہو گئے اور کہنے لگے "باپو، ہمیں ہندوستان لے چلو"۔ اُس نے بہت بھاری آواز میں جواب دیا "یہ بھی تو ہندوستان ہی ہے"۔ یہ تھی صورت حال! شام کے وقت میں جامعہ پہنچا۔ میں نے اپنے ساتھ سیب کی پیٹی اٹھائی تھی، صرف پانچ روپے میں۔ میں نے ذاکر صاحب اور مجیب صاحب سے کہا کہ میں نے سرینگر سے سیب لائے ہیں۔ مجیب صاحب فوراً اُٹھے اور پیٹی کھول کر سیب نکالا۔ اُس نے سیب کے اندر دانت داغ دئے۔ ذاکر صاحب بول اُٹھے "یہ کیا بدمذاقی ہے۔ یہ خوبصورت شے دیکھنے کی چیز ہے۔ اسے آپ زخم لگاتے ہیں؟" دو دن کے اندر اندر مجھے رفیع احمد قدوائی مرحوم کے دفتر سے ایک اور ٹکٹ ملا اور میں اپنی گھر والی کو لانے کیلئے پھر سرینگر چلا گیا۔ مگر اُسی روز علی الصباح ذاکر صاحب سے ملنے گیا۔ اس کا خیال تھا کہ میں ناموافق حالات سے بھاگ رہا ہوں اور یہ کہ سفر پُرخطر ہے۔ میں سرینگر پہنچا اور گھر والی کو ساتھ اٹھا لایا۔ پھر میری والدہ واویلا کر رہی

تھیں مگر میں نے کتابوں سے بھرا ایک صندوق اٹھایا اور چل پڑا۔ ایک پارسی ہوا باز کے ساتھ میں نے دوستی کر لی تھی اور اس کو بتایا تھا کہ واپسی پر پھر ملاقات ہوگی۔ جب میں ہوائی اڈے پر پہنچا تو وہاں ایک دیوار کھڑی کر دی گئی تھی۔ کسی کو اندر جانے کی اجازت ہی نہیں تھی مگر میں اندر گھس ہی گیا اور میرا بکس بھی میرے ساتھ۔ میں نے پارسی ہوا باز کے بارے میں دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ وہ وہاں تھا ہی نہیں۔ میری گھر والی ماں بننے والی تھی۔ ہماری پہلی بیٹی پاروآنیوالی تھی۔ شام ہوگئی۔ ہم ڈر سے گئے۔ اتنے میں وہ نیک انسان جس کا نام بخشی غلام محمد (مرحوم) تھا، نمودار ہوا اور مجھ سے دریافت کیا کہ میں وہاں کیا کر رہا تھا۔ میں نے کہا دلّی جانا ہے۔ مرحوم نے واہ رے واہ کس طرح میرے لئے دو ٹکٹیں حاصل کیں۔ بخشی صاحب پرانی سٹیشن ویگن میں آئے تھے اور بڈگام کا دورہ کر رہے تھے کہ کیا ہو رہا تھا وہاں۔ ہم اسی ویگن میں ائرپورٹ کے اندر داخل ہوئے۔ مسٹر بنرجی نے جو بسکو سکول میں اُستاد تھے، بمبئی جا رہے تھے، میرا صندوق ویگن کی چھت پر رکھا۔ پھر میں نے پارسی ہوا باز کو بھی دیکھا۔ شام دیر تک ہم دلّی پہنچ گئے۔ ذاکر صاحب ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ ان کی خواہش تھی ہم واپس آئیں۔ سفر تو مہم جویانہ تھا اور ایام بھی، مہم جوئی کے عین مطابق تھے۔ کیا معلوم مسلمانوں نے تقسیم کے بعد ان ایّام سے کیا تصوّر لیا۔ کچھ دنوں کے بعد جب جامعہ سرمائی تعطیلات کے سلسلے میں بند ہوا تو ہم لکھنو چلے گئے۔ وہاں میں نے گھر والی کیلئے ہسپتال وغیرہ کا انتظام کیا اور میں واپس دلّی آیا۔[1]

جامعہ میں پروفیسر مجیب سے ملنا میری اتنی ہی خوش نصیبی تھی جتنی کہ اس کے برادر

۱۔ دونوں جانب سفر مشکل تھا اور پُرخطر۔ لکھنو جانے کیلئے ہمیں مویشیوں کی طرح گاڑی میں بھر دیا گیا۔ گاڑی کی حفاظت کیلئے صرف دو پولیس والے موجود تھے۔ گاڑی میں صرف مسلمان سفر کر رہے تھے۔ میں جب لکھنو سے واپس آیا تو میرے ساتھ کچھ دوست اور کمیونسٹ لیڈر ڈاکٹر اشرف بھی تھے۔ میرے دوست عتیق صاحب بھی تھے جو جامعہ میں میرے ساتھ کام کر رہے (باقی اگلے صفحے پر)

پروفیسر محمد حبیب سے بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ۔ میری زندگی پر سب سے زیادہ اثر اگر کسی کا پڑا ہے تو وہ محمد مجیب کا۔ مجیب صاحب نے آکسفورڈ یونیورسٹی میں تاریخ میں آنرز کی ڈگری حاصل کی تھی۔ آکسفورڈ میں مجیب صاحب کے ساتھ پی ایس مینن جیسے لوگ تھے۔ مینن نے اپنی کتاب ''کثیر عالم'' (Many Worlds) میں لکھا ہے کہ مجیب صاحب سب سے زیادہ عالی ظرف اور شریف النفس[1] تھے۔ یہاں ہندوستان میں بہت سارے لوگ اس کتاب کے بہت گرویدہ ہو گئے تھے۔ بہت دفعہ حیدر آباد کی محفلوں میں اور دوسری جگہوں پر لوگ مجھ سے مجیب صاحب کے بارے میں اور اور جاننے کی فرمائش کرتے رہے۔ میں حتی المقدور مجیب صاحب کے کردار اور شخصیت پر اپنا خیال ظاہر کرتا رہا۔ میں پروفیسر حبیب کے بارے میں پہلے ہی کچھ باتیں لکھ چکا ہوں۔ یہاں یہ کہنا ضروری ہے کہ پروفیسر مجیب اپنے بڑے بھائی سے بھی زیادہ فکری اور ذہنی ربط وضبط کے لحاظ سے آگے بڑھ چکے تھے۔ ''دنیا کی کہانی'' پڑھیے، ''ادبیات روسیہ'' کی گہرائیوں میں جایئے یا ''دی انڈین مسلمز'' کے رموز جاننے کی کوشش کیجئے۔ آپ کو دکھائی دیگا کہ مجیب صاحب فکری لحاظ سے کتنے گہرے اور پکّے ہیں۔ یہی حال ان کی ریڈیائی تقریروں کا ہے۔ علاّمہ اقبال کی وفات پر ان کے اُچھال کا حوالہ دیا جاچکا ہے۔ صرف وہ تقریر کافی ہے محبان علم وفن اور پرستارانِ لوح وقلم کیلئے اگر وہ مجیب صاحب کی فکری اڑانیں، جذباتی گہرایاں، لسانی وادبی ریکھائیں مشاہدہ کرنا چاہتے ہوں۔ مجیب صاحب جب پرواز شروع کرتے ہیں تو یکا یک تاریخ کا بوجھ کاندھوں پر اُٹھائے نہ جانے کن کن بلندیوں کو چھوتے ہیں۔ میں نے بارہا

(گذشتہ سے پیوستہ) تھے۔ جب ہم کانپور پہنچے تو ہماری گاڑی کا رخ بدل دیا گیا اور ہمیں بارہ گھنٹے یارڈ میں رکھا گیا۔ ہم سوچنے لگے کہ شاید ہمارا آخری وقت آن پہنچا۔ عتیق صاحب نے ایک مرتبان نکالا جس میں شلغم، سرخ مرچ اور گڈ (براؤن رنگ کا کھانڈ) کا اچار تھا جو پنجاب اور یوپی میں خاص مشہور ہے۔ ہم نے اچار کھایا۔ پھر ہمیں دلّی پہنچایا گیا۔

1. "Majeeb, the noblest of us all", Menon

ان کے ساتھ اڑنے کی کوشش کی اور ہر بار سمجھ میں آیا کہ شہباز آخر شہباز ہے۔ طائرانِ دانہ ودام کا ان کے ساتھ کیا مقابلہ! مجیب صاحب کا سحر جن لوگوں پر چھایا ہے، اُن میں صرف میں ہی نہیں، کتنے اور بھی پروانے ہیں۔ پروفیسر گنگولی جو دلّی یونیورسٹی میں اپنا لوہا منوا چکے ہیں، میرے فاضل دوست پی این در کے ساتھ بیٹھتے تو کہتے کہ انسان کو مجیب صاحب سمجھنے کیلئے اپنی ذہنی سطح لازماً بلند کرنا پڑتی ہے۔ مجیب صاحب درویشانہ طبیعت کے فاضل تھے۔[1] اس لئے دوستوں کی طرف ان کا جھکاؤ ذہن میں آسکتا ہے۔ ذاکر صاحب اور عابد صاحب مجیب صاحب کے بارے میں بات کرتے تو کہتے کہ وہ دوستوفسکی کو سنبھالیں گے۔ جارج سٹائی نر (George Steiner) نے اپنی کتاب میں دوستوفسکی اور ٹالسٹائی کا موازنہ کیا ہے۔ یہ کتاب پین گن نے چھاپی ہے۔ میں نے ۱۹۶۰ء کے قریب اسے امریکہ میں پڑھا۔ سٹائی نر کہتے ہیں کہ آپ دوستوفسکی کو پسند کرتے ہیں یا ٹالسٹائی کو، اس کا دارومدار آپ کی سرشت پر ہے۔ مجیب صاحب یقیناً اپنی سرشت (nature)، اپنے مزاج اور اپنی داخلی ہئیت کی وجہ سے دوستوفسکی کے شیدائی تھے۔ میں نے جب بھی ''جنگ اور امن'' اور ''انا کرینینا (Anna Karenina) پڑھیں تو مجھے ''برادرانِ کرد موزاف'' اور ''ایک مضحک کا خواب'' (The dreams of a ridiculous man) کا زیادہ اثر ہوا اور مجھے دوستوفسکی نے مجیب صاحب کی طرح موہ لیا۔ مگر اسکے باوجود مجھے ٹالسٹائی کی وسعتِ فکر وفن کا احساس ہے اور اعتراف!

۱۔ ان کے والد بہت امیر تھے۔ اس لئے چاہتے تھے کہ مجیب صاحب تحصیل علم اور تکنیکی مہارت کے بعد لکھنو میں اپنا پرنٹنگ پریس کھولیں مگر مجیب صاحب نے آکسفورڈ سے فراغت حاصل کی تو برلن گئے۔ وہاں ایک روسی خاتون کے ساتھ ان کی ملاقات ہوئی۔ اس خاتون نے ترکِ وطن کیا تھا۔ مجیب صاحب نے اس سے روسی زبان سیکھی۔ وہ تو دوستوفسکی کے شائق تھے اس لئے انہوں نے ایک تو دوستوفسکی کا مطالعہ کیا دوسرے روسی ادب پر سینکڑوں کتابیں حاصل کرکے History of Russian Literature اُردو میں لکھی۔ فرانس میں ایک دو سال ٹھہرنے کے بعد انہوں نے فرانسیسی بھی سیکھی تھی۔ جرمنی میں پرنٹنگ کا بھی کچھ کام کیا۔

مجیب صاحب کی عالمانہ شخصیت اور ان کی نفاستِ طبع مسلّمہ مگر جامعہ کا ماحول تب تک نامکمل جب تک ایسی ہی بڑی شخصیت ڈاکٹر عابد حسین کا تذکرہ نہ کیا جائے اور انہیں جامعہ کے حوالے سے نہ سمجھا جائے۔ وہ بھوپال کے ایک معزز شریف گھرانے میں پیدا ہوئے مگر والدین کی سفید پوشی نے اُنہیں محنت کرنے اور اچھی طرح سے پڑھنے پر اُکسایا ہوگا۔ انہوں نے الہ آباد یونیورسٹی میں فسٹ کلاس فسٹ کے امتیاز سے امتحان پاس کیا۔ اُن دنوں یوپی کے سارے کالج الہ آباد یونیورسٹی کے ساتھ منسلک تھے۔ ان کا امتیاز دیکھ کر بھوپال کے نواب نے انہیں آکسفورڈ جانے کیلئے وظیفہ عطا کیا۔ وہ آکسفورڈ چلے گئے مگر وہاں پہنچ کر آکسفورڈ کے علمی فلسفے سے زیادہ متاثر نہ ہوئے۔ دس بیس دن میں ہی برلن پہنچ گئے۔ وہاں کی للکاران کے مزاج کو زیادہ راس آئی اور وہ جرمنی کے علمی ماحول کے ساتھ جڑ گئے۔ ایڈورڈ شپلا نگران کے بھی استاد بن گئے۔ شپلا نگر کلچر کے پروفیسر تھے۔ جرمنی کے پروفیسروں کی مالی حالت جن دنوں کمزور تھی، شپلا نگر بھی ہاتھ کی تنگی محسوس کرنے لگے۔ عابد صاحب انگلستان کے پونڈوں میں پیسے کا انتظام کرتے تھے اور شپلا نگر کو دیتے تھے۔ خود راجماش کی سبزی اور ٹوسٹ پر گزارہ کرتے تھے اور اس طرح پیسہ بچاتے تھے۔ شپلا نگر نے اُنہیں کانٹ کی کتاب ''تنقید عقل محض'' (Critique of Pure Reason) سمجھنے میں دستگیری کی۔ اس سے عابد صاحب کو جرمن زبان اچھی طرح سے سیکھنے کا بھی موقع ملا۔ پھر عابد صاحب نے کرٹیک کا بھی ترجمہ کیا اور وولف گانگ گوئٹے کے ''فواسٹ'' کا بھی۔ تمہید میں عابد صاحب نے مفصل طور پر دکھایا ہے کہ جرمن ادب میں ''فواسٹ'' کا تصور کن مراحل اور تدریجی منازل سے گزرا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے گائٹے کا شاہکار ''فورسٹ'' اچھی طرح سمجھا تھا۔ عابد صاحب نے ولہلم مائسٹر کا بھی ترجمہ کیا اور The Sorrows of Young Werther کا بھی۔ مگر جرمن ادب اور فلسفہ ہی اُن کے زورِ قلم سے اُردو میں نہ آیا بلکہ گاندھی جی کی خودنوشتہ سوانح عمری میں بھی انہوں نے ترجمے کے

فن اور قلم کاری کا نمونہ دکھایا۔ گاندھی جی نے جب اپنی سوانح عمری کا ایک باب عابد صاحب سے سنا تو کہا "ایسا لگتا ہے کہ میں نے خود اردو میں لکھا ہے" ترجمہ کار کی حیثیت سے ان کی صلاحیت اور ان کی سنجیدگی اس بات سے جھلکتی ہے کہ وہ پنڈت نہرو کا کملا کے نام انتساب (Dedication) کا ترجمہ تین دن تک نہ کر سکے۔ تین دن وہ بجلی اور پنکھے کے بغیر بائیں ہاتھ کی دوسری انگلی انگوٹھے کے ساتھ ملتے رہے تا کہ ان کی توجہ میں رخنہ پیدا نہ ہو جائے۔ تین دن کے بعد "جان ہار کملا کے نام" وضع ہو گیا۔

عابد حسین کی طبیعت جوشیلی نہیں تھی۔ وہ ٹھنڈے دل سے سوچتے اور کام کرتے۔ جب جامعہ کی سلور جبلی منائی جا رہی تھی اس وقت ہندو مسلم کچھاؤ نے بہت ہی برے حالات پیدا کئے تھے۔ مذہبی فسادات شروع ہو گئے تھے۔ کچھ طلباء آئے اور عابد صاحب سے کہنے لگے۔ "یہ جامعہ کس لئے ہے۔ آپ نے پچیس سال میں کیا حاصل کیا ہے؟ علی گڈھ نے ذاکر حسین صاحب کو پیدا کیا، آپ نے کیا تیر مارا ہے؟" عابد صاحب نے ٹھنڈے دل و دماغ سے کام لیکر ان کی بولتی بند کی۔ فرمایا "یہ کہنا کہ ذاکر حسین علی گڈھ کی پیداوار ہیں، ایسی ہی بات ہے جیسا کہ یہ کہنا کہ محمدؐ عرب جاہلیت کی پیداوار ہیں"۔ عابد صاحب نے دور رس فکر سے کام لیتے ہوئے میرے برادر آغا شوکت علی کو مشورہ دیا تھا کہ اگر سیاست میں جانا ہی ہے تو محمد علی جناح کے بجائے شیخ عبداللہ کے ساتھ مل جاؤ۔ ان کا خیال تھا کہ جموں ایک دن پاکستان کے ساتھ جائیگا مگر کشمیر شیخ محمد عبداللہ کا ساتھ دیگا۔[1] عابد صاحب کی وجہ سے ہی میں شیلانگر کی جھولی میں پڑ گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ جب میں نے ولایت میں اپنی تعلیم ختم کی تو شیخ عبداللہ نے مجھے ایم، اے کرنے کے بجائے دوسرا سال یورپ میں گذارنے کا مشورہ

۱۔ عابد صاحب نے نرم لہجے میں اس سے کہا تھا کہ اگر مستقبل میں ہندوستان اور پاکستان کا نزاع کبھی حل ہوگا تو جموں صوبے کے لوگ جو پنجاب کے ساتھ کچھ تہذیبی میل رکھتے ہیں، پاکستان کے ساتھ جانا پسند کریں گے مگر کشمیر کے لوگ ایسا کرنے سے گریز کریں گے۔

دیا۔ یہ اس لئے کہ میں یورپ کی تعلیم کا جائزہ لے سکوں اور کشمیر کیلئے زیادہ سودمند تجربات حاصل کرسکوں۔ چنانچہ میں فرانس، سوئزرلینڈ، ڈنمارک، سویڈن، جرمنی چلا گیا۔ جب میں جرمنی میں تھا تو کسی انگریزی جاننے والے سے میں نے "شپلانگر" کا ذکر چھیڑا۔ میں چونک بڑا جب اس نے کہا کہ وہ زندہ ہے اور ٹیوبن جن (Tubingin) یونیورسٹی میں ہے۔ میں رک گیا اور اس شخص نے مجھے شپلانگر کے فلیٹ میں پہنچادیا۔ وہ ڈائننگ ٹیبل (Dinning Table) کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اور کھانا کھانے کی تیاری کررہے تھے۔ شپلانگر کے بال بالکل سفید تھے اور وہ کرسی پر بالکل سیدھے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی گھر والی کمرے میں چلی آئی۔ میں نے شپلانگر کے ساتھ جامعہ ملیہ، ذاکر صاحب اور عابد صاحب کے متعلق گفتگو شروع کی اور کہا کہ عابد صاحب نے Psychology of Adolescence کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ میں نے کہا وہ آج کل کوئی کتاب لکھ رہے ہیں۔ ان کی گھر والی نے جواب دیا کہ وہ سال میں ایک کتاب لکھ ہی ڈالتے ہیں۔ شپلانگر انگریزی نہیں بولتے تھے۔ مگر ان کی گھر والی بولتی تھی۔ اس نے دل کو چھونے والی ایک بات کہی۔ کہا جب روسی برلن میں داخل ہوئے تو وہ دونوں برلن سے بھاگ گئے مگر شپلانگر نے عابد صاحب کی دی ہوئی خاکستردانی (Ash Tray) اپنے ساتھ اٹھائی۔ پھر کہا کہ یہ بات عابد صاحب کو بتائیں۔ یہ خاکستردانی کوئی قیمتی چیز نہیں تھی۔ وہ تو پیتل کی بنی ہوئی تھی، صرف۔ میں جب واپس آ گیا تو ذاکر صاحب اور عابد صاحب کو سارا ماجرا سنایا۔ انہوں نے کہا یقین نہیں آتا کہ شپلانگر ابھی زندہ ہونگے۔ جب عابد صاحب کو فورڈ گرانٹ (Ford Grant) ملا تو انہوں نے "ہندوستانی قومیت اور قومی تہذیب" (Indian Nationality and National

(Culture) تین جلدوں میں لکھی۔ پھر اس کتاب کو مختصر کر کے انگریزی میں ایک جلد میں لایا۔ جائیکو والوں نے اس کتاب کو ''نیشنل کلچر آف انڈیا'' عنوان کے تحت چھاپ دیا۔ اس کتاب کا پیش لفظ مشہور ہندوستانی فلسفی ڈاکٹر رادھا کرشنن نے لکھا۔ یہ کارنامہ بھی قابل تحسین ہے۔ عابد صاحب نے اس کتاب کے شائع ہونے کے بعد گاڑی خریدی اور کچھ عرصے کے لئے استعمال کی۔

کتابیں لکھ لکھ کر علم وادب کے چراغ جلانا اور اس طرح اپنے لئے بھی کچھ آنہ پیسہ کمانا جامعہ کے کلچر میں شامل تھا۔ جب ذاکر صاحب کی صاحبزادی کی شادی ہونے والی تھی[1] تو انہوں نے فریدرک لسٹ کی کتاب قومی اقتصاد National Economy کا ترجمہ کیا۔ لسٹ جرمن ماہر اقتصاد تھا جس نے اپنی کتاب میں مقامی صنعت کے بچاؤ کیلئے ٹیکس لاگو کرنے کی حمایت کی تھی تاکہ جرمنی کی صنعت آگے بڑھ سکے۔ ۱۹۴۴ء۔۴۵ء میں کوئی شخص ذاکر صاحب کے پاس آیا اور اس کتاب کا ترجمہ پانچ ہزار روپے کے معاوضے کے عوض ان سے حاصل کیا۔ جس دن صاحبزادی کا نکاح ہوا، ذاکر صاحب نے مٹی کے برتنوں میں سرکے میں ایک ضیافت بنوائی تھی۔ پروفیسر محمد مجیب کی شادی ہونے والی تھی تو انہوں نے تاریخ فلسفہ سیاسیات History of Political Philosophy لکھی۔ ہندوستانی اکیڈمی نے اس کتاب کو خریدا۔ اُنہوں نے اسے چھاپ دیا۔ مجیب صاحب نے اکیڈمی سے پانچ ہزار روپے معاوضہ حاصل کیا اور اپنے ماہِ عسل (Honeymoon) پر صرف کیا۔ یہ ایام انہوں نے کشمیر میں گزارے۔ چند روز وجاہت حسین کے ساتھ گذارے ہوں گے۔ باقی ایام صحت افزا مقامات میں اپنی گھر والی کے ساتھ گزارے اور اس طرح ماہِ عسل

۱۔ ہم ان کی صاحبزادی کے نکاح پر قائم گنج گئے جو اُن کا گاؤں ہے۔ کچھ دن ٹھہرے۔ اُنہوں نے اپنی صاحبزادی کو جو چیزیں دی تھیں وہ حیرت میں ڈالتی ہیں۔ یوسف حسین خان صاحب نے قریباً ایک سو کتابیں جمع کیں۔ اُن پر خوب صورت جلدیں چڑھادیں اور اُن صاحب زادی کے حوالے کیں۔ اُن کا نکاح ایک پٹھان خورشید عالم کے ساتھ ہوا تھا۔

میں کشمیر کے قدرتی نظاروں سے بھی لطف اندوز ہوتے رہے۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہ لوگ گاؤں میں اپنی زمینیں بیچتے تھے اور جامعہ میں زمین خرید کر چھوٹے چھوٹے مکان بناتے تھے۔ ذاکر صاحب کا مکان چھوٹا تھا مگر مجیب صاحب کا بڑا۔ عابد صاحب کا مکان بھی چھوٹا تھا اور شفیق الرحمٰن قدوائی کا بھی۔ ان چار ہستیوں نے میرے ذہن پر اپنی چھاپ ڈالدی ہے۔

جامعہ کا یہ تذکرہ تب تک نامکمل ہے جب تک مہاتما گاندھی کی جامعہ میں تشریف آوری کا ذکر نہ چھیڑا جائے۔ ۱۹۴۶ء میں مجھے خیال آیا کہ ہم مہاتما گاندھی سے ملیں گے اور اُنہیں جامعہ آنے کی دعوت دینگے۔ مہاتما کستور با آشرم میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ہم جامعہ کے چار اُستاد آٹھ بجے شام آشرم چلے گئے۔ گاندھی جی کچھ جوان بیواؤں کے ساتھ بیچ میں بیٹھے ہوئے اُن سے باتیں کر رہے تھے۔ انہوں نے ہماری طرف دیکھا اور دریافت کیا کہ ہم کون ہیں۔ میں نے کہا باپو ہم جامعہ میں کام کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ ابھی ہمارے ساتھ جائیں گے۔ قریباً آٹھ بجے شام اپنی کھلی گاڑی میں بیٹھ گئے اور روانہ ہوئے۔ جامعہ تک قریباً ایک میل کا فاصلہ تھا۔ ہم ان کی کار کے پیچھے پیچھے دوڑ رہے تھے تا کہ ہم بھی اُنہی کے ساتھ جامعہ پہنچ جائیں۔ اُنہوں نے ہمیں دیکھا اور موٹر رکوادی۔ نیچے اُترے اور ہمارے ساتھ قریباً آدھ کلومیٹر چلے۔ میں نے ان کی صحت مند مگر سڈول ٹانگیں دیکھیں[1]۔ ہم ان کے ساتھ چلتے چلتے جامعہ پہنچ گئے۔ میں پہلی دفعہ مہاتما گاندھی کے ساتھ آمنے سامنے ملاقات کر رہا تھا۔ یہ میرے لئے بڑی انوکھی ملاقات تھی، وہ بیٹھ گئے اور ہندوستانی میں فرمایا۔ ''میں شک کے بغیر سختی سے کہتا ہوں کہ جامعہ کے بنانے میں میرا بھی ہاتھ ہے۔''[2] یہ بات صحیح ہے کہ جب جامعہ کی تعمیر شروع ہوئی تھی، انہوں نے ہائی اسکول کے طلباء سے کہا تھا۔ ''ذاکر صاحب مجھے سے ملنے وارد ھا آتے ہیں۔ ہم اکٹھے بیٹھتے ہیں،

۱۔ وہ اپنی ٹانگوں کو صحت مند رکھنے کیلئے مالش کراتے تھے۔

۲۔ یہ بول قریباً وہی ہیں جو ان کی زبان سے نکلے تھے۔

کھاتے ہیں اور گفتگو کرتے ہیں"[1]۔ پھر انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور جانے لگے۔ مجیب صاحب اور عابد صاحب وہاں ہی بیٹھتے تھے۔ ذاکر صاحب بہاول پورہ کنووکیشن (Convocation) ایڈریس کیلئے چلے گئے تھے۔ میرے ذہن میں فوراً خیال آیا کہ ہمیں اس موقعے سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ میں نے چھٹی جماعت کے ایک چھوٹے لڑکے جاوید منٹو[2] سے اشارہ کیا کہ وہ سوال پوچھے۔ اس نے پوچھا "ایک مسلمان لڑکا ہندو مسلم اتحاد کیلئے کیا کرسکتا ہے؟" گاندھی جی نے فوراً جواب دیا۔ "پیارے بچے! میں آپ کو آج کیا کہوں؟ جو بات سالہا سال سے کہتا آیا ہوں، وہی دہراؤں گا۔ اگر کوئی ہندو تجھ کو پیٹنا چاہتا ہو یا گالی دینا چاہتا ہو، یا مارنا بھی چاہتا ہو اور اس کے لئے آگے بھی بڑھے، تمہیں اسے پھر بھی اپنا بھائی سمجھنا چاہیے۔ اب دیکھو اپنے آپ کو نادان نہ بنانا یہ سوچ کر میں یہ بات جامعہ میں ہی تجھ کو بتاتا ہوں۔ یہ تو ہندوؤں کو بھی کہتا ہوں جب میں اُن سے ملتا ہوں۔ اگر ہندو میری بات سنتے تو مسلمانوں کو سُننے کی ضرورت نہ پڑتی۔ اگر مسلمان سُنتے تو ہندوؤں کو سُننے کی ضرورت نہ ہوتی۔ بدقسمتی سے آج یہ بات نہ وہ سُنتا ہے نہ یہ۔ قرولباغ کے لوگ میرے پاس آئے اور کہا کہ مسلمان تلواریں اور کارتوس جمع کر رہے ہیں۔ باپو یہ بات کتنی مشکل ہے۔ میں نے کہا اگر وہ تم کو مارنا چاہیں تو ٹھیک ہے۔ تم کو گھبراہٹ کیوں ہے؟ یہ سارا بھارت ہندوؤں سے بھرا ہوا ہے۔ وہ کتنے ہندوؤں کو ماریں گے۔ ہر انسان کے دل میں انسانیت چھپی ہوتی ہے۔ خدا قاتل کا ہاتھ روکتا ہے۔"[3] اُٹھتے اُٹھتے اُنہیں یاد آیا کہ ایک زمانے کے کانگریسی صدر ڈاکٹر انصاری وہاں ہی کہیں دفن ہیں۔ انہوں نے ان کی قبر پر جانے کی خواہش کی۔ ہم نے انہیں وہاں پہنچادیا۔ مجھے اُس وقت یاد آتا ہے کہ اُس وقت وہاں کیا سماں بندھا تھا۔ گاندھی جی ڈاکٹر انصاری کی مرمریں قبر پر بیٹھ گئے جو گیس لیمپ کی

۱۔ یہ بول بھی تقریباً وہی ہیں جو ان کی زبان سے نکلے تھے۔

۲۔ جاوید منٹو سعادت حسن منٹو کا بھانجا تھا۔ اب وہ مشہور و معروف معالج ہے آنکھوں کا۔

۳۔ یہ بھی ع غ گاندھی جی کے ہی بول ہیں۔

روشنی میں چمک رہی تھی۔ کاش میرے ساتھ کیمرہ ہوتا تو میں نے گاندھی جی کا سنجیدہ مُوڈ کیمرے کی آنکھ سے محفوظ کرلیا ہوتا اور وہ لمحات بھی جو گاندھی جی نے مرحوم انصاری کی قبر پر گزارے تھے۔ مہاتما گو چلے گئے مگر اس وقت کسے معلوم تھا کہ گاندھی اور سردار پٹیل کے درمیان اختلافات شروع ہوگئے ہیں، نہ یہ کہ ان کے اغراض اور مقاصد کیا تھے۔ پیارے لال نے گاندھی جی پر جو کتاب لکھی ہے، اس کے اخیر پر بہت سی جگہیں ہیں جہاں ان اختلافات کا پتہ چلتا ہے۔ میں نے ایک دن اپنے ذاتی خیالات کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک جاپانی ڈیلی گیشن کیلئے کچھ لکھا تھا جس میں یہ دو باتیں درج تھیں۔ (۱) سردار پٹیل نے ایک دن ورکنگ کمیٹی میں بہت گرم گفتاری سے کام لیا۔ گاندھی جی نے اس کو یہ نوٹ لکھ بھیج ڈالا۔ ''عزیزم سردار صاحب! بالآخر آپ نے ورکنگ کمیٹی میں کافی گرم گفتاری سے بولنا شروع کیا ہے۔ میں یہ نوٹ شکایت کے طور پر نہیں لکھ رہا ہوں مگر میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ ہم دو مختلف سمتوں میں جا رہے ہیں۔'' (۲) گاندھی جی نواکھلی میں مقیم تھے اور وہاں کے حالات اچھی طرح سمجھ لئے تھے۔ انہوں نے مہاجنوں کو بتایا تھا کہ اگر وہ اپنی ساری دولت غریب لوگوں کو دیدیں تو وہ (غریب لوگ) نہ اُن کو پیٹیں گے اور نہ ماریں گے۔ کچھ مہاجن سردار پٹیل کے پاس چلے گئے جو اس وقت عبوری حکومت میں وزیر داخلہ تھے۔ انہوں نے شکایت کی۔ اس لئے پٹیل نے گاندھی کو خط لکھا۔ پٹیل کا رویہ خاص برطانوی منسٹر کا سا تھا۔ گاندھی جی نے جواب لکھا۔ ''ڈیر سردار، آپ کے نوٹ کا شکریہ! آپ نے ان کو کیوں نہ بتایا کہ آپ کو بھی مہاتما کے زیر اثر تربیت ملی ہے؟ تاہم اب آپ گورنمنٹ آف انڈیا کے ذمہ دار منسٹر ہیں۔ آپ کا فرض ہے کہ آپ کی ان کی مدد مجھے یک طرف چھوڑ کر بھی کریں۔ کیا ایسا کام کرنا بھی میں نے آپ کو سکھایا نہیں ہے؟''[1] مگر پنڈت جواہر لال نہرو

1. Dear Sardar, thank you for your note. Why didn't you tell them that you had also been trained under the great Mahatma? But now you are a responsible Minister of the Govt: of India. And you have the duty of offering them redress even over me, for is that also not what I have taught you?"

کا نوا کھلی جانا اور پھر مہاتما گاندھی کو اپنے منفرد انداز میں یہ کہنا انسان کو چونک دیتا ہے۔
''باپو! اس جہاں میں کتنے لوگ آپ کے سخت قانون پر چل سکتے ہیں؟'' گاندھی جی کا واپسی تیر۔ ''اسی لئے تو مجھے اس راہ پر چلنا چاہیے[1]۔''

اب میں مہاتما گاندھی کے ساتھ ارتباط کا ایک اور واقعہ سناؤں گا۔ آشا آر یہ نائیکم[2] مجھے اور میرزی گھر والی کو گاندھی جی کے پاس لے گئی۔ وہ قرولباغ دہلی کے نزدیک ہری جن آشرم میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ پٹیل اور نہرو عبوری حکومت کے منسٹر بنے تھے۔ وہ چار پانچ بجے صبح گاندھی جی سے ملنے آئے تھے۔ گاندھی جی نے پوجا کی تھی اور وہ سو گئے تھے مگر انہوں نے اُن کے لئے ایک پیغام لکھ کے رکھا تھا، صرف پانچ مختصر باتیں مگر ایک ایک بات ایک ایک دفتر:[3]

۱) نمک کا ٹیکس ختم کرو۔
۲) چھوت چھات ختم کرو۔
۳) ڈانڈی مارچ یاد رکھو۔
۴) ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد کرو۔
۵) کھادی پہنو۔

میں نے یہ باتیں پیارے لال کی کتاب ''آخری مرحلہ'' میں بھی بعد میں پڑھیں۔

میں ۱۹۴۷ء کے قہر الٰہی کے بارے میں پھر بات کروں گا۔ گاندھی جی پھر جامعہ تشریف لائے اور ان لوگوں سے بات چیت کرنے جنہوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کو اُڑانا پسند کیا ہوتا اور وہ بھی ذاتی مفاد کیلئے۔ شفیق الرحمٰن قدوائی نے اُنہیں ایک جگہ سے دوسری

---

1. All the more reason why I should"

۱۔ اس کے بچی نے ایک دن مولانا آزاد کے سامنے تن کر کھڑا رہنے اور انہیں تعلیم کے بارے میں مشورہ دینے کی کوشش کی تھی۔ مگر آزاد کا آہنی قصد اور ان کی حتمی رائے کام آئی تھی۔

3. Abolish the Salt Tax. Remember the Dandi March. Remove untouchability. Unite Hindus and Muslims. Take to Khadi.

جگہ لیا۔ جامعہ کی پردہ نشیں خواتین ایک کونے میں کھڑی تھیں۔ وہاں جو گفتگو ہوئی اُسے کن حروف میں تاریخ میں لکھا جانا چاہیے مجھے معلوم نہیں۔ جب گاندھی جی نزدیک پہنچے تو شفیق صاحب نے انہیں بیگم ذاکر حسین کے پاس لیا جو بھی برقعہ پہنے ہوئے تھی۔ گاندھی ذاتی تعلقات کی بناء پر بیگم صاحب سے یوں مخاطب ہوئے۔ ''مجھ سے کوئی پردہ نہیں کرتا''۔ باپو اُن سے پیار سے پیش آنا چاہتے تھے۔ اُنہیں معلوم تھا کہ ایسے موقعوں پر کس طرح بات کرنی چاہیے۔ فرمایا ''یہ تمہارا ذاکر بڑا خراب آدمی ہے''۔ بیگم نے سمجھ لیا کہ وہ مذاق کر رہے ہیں۔ پھر گاندھی جی کے لافانی الفاظ: ''میں تمہیں بتانے آیا ہوں کہ تمہیں یہاں سے نہیں جانا چاہیے چاہے کچھ بھی ہو! اگر تم پاکستان بھی جاؤ گی تو بھی مرجاؤ گی۔ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ فتح شانتی کی ہوتی ہے۔ اگر میں مار دھاڑ نہیں روک سکتا تب مجھے بھی اس کا نشانہ بننا چاہیے۔ میں اس آگ کو بجھانے آیا ہوں۔ اگر بجھا نہیں سکتا تو اس میں جل جاؤں گا''۔ گاندھی جی نے یہ کہا اور چل دیئے۔

میں اب سٹیٹسمین کے ایڈیٹوریل کا حوالہ دوں گا۔ اس کا عنوان ہے، ہنگامہ خیز پنڈت (Tempestuous Pandit)۔ لیڈی مونٹ بیٹن اورنگ زیب روڈ ہاؤس میں سردار پٹیل کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔ اس ہاؤس میں سردار پٹیل عبوری حکومت کے دوراں رہتا تھا۔ پنڈت نہرو پاس میں یاک روڈ ہاؤس (York Road House) میں رہتے تھے۔ انہوں نے سنا کہ جامعہ پر حملہ ہوا ہے۔ وہ کار میں بیٹھ گئے اور جامعہ چلے گئے۔ سردار پٹیل اور لیڈی مونٹ بیٹن ان کے پیچھے چلے۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ جذبات میں آکر ان دنوں کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ نہرو جامعہ پہنچ کر ایک چارپائی پر بیٹھ گئے اور سر جھکا کے بیٹھے رہے۔ پٹیل اور لیڈی یہ دیکھ کر چلے گئے۔ پھر کریا پا مدراس کی ایک بٹالین کے ساتھ آ گیا۔ یہ بٹالین مذہبی تعصّبات سے بری تھی۔ ایک چھوٹی کمپنی جامعہ بھیج دی گئی تا کہ جامعہ کے لوگوں کو بچایا جائے۔ جامعہ میں ٹھہرنا اور یہ تماشا دیکھنا کتنا دل چسپ تھا۔ آج ۱۹۴۷ء کے گاندھی

نہرو ڈھول بہت دور سے بجتے ہیں اور سہانے لگتے ہیں مگر ہم نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ہم نے گھر بار چھوڑا تھا۔ سب کچھ چھوڑا تھا۔ جامعہ آئے تھے مگر ہندوستان کا بٹوارہ ہم سب کیلئے، وطن کے ساتھ پیار کرنے والوں کیلئے ایک دغا تھا۔ وقت گزرتا گیا۔ میری آنکھوں نے جو کچھ دیکھا وہ لب پر آ سکتا نہیں۔ میں البتہ وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے سب کچھ ہوا میں سونگا تھا۔ میری نظروں میں اور بھی صاحبانِ عزت ہیں مگر میں سمجھتا ہوں کہ آزاد صدمے سے جاں بحق ہو گئے۔ رہا سوال موہن چند کرم داس گاندھی کا، یہ مہاتما مسلمانوں کی خاطر بھارت دیس میں شہید ہوئے!

مولانا آزاد کے بارے میں مجھے ذاکر صاحب، مجیب صاحب اور عابد حسین صاحب نے کچھ اہم باتیں بتائی ہیں۔ آزاد ۱۹۴۷ء کے بعد کسی سے ملنا نہیں چاہتے تھے۔ اتنے مایوس ہو چکے تھے اور تنہا رہ گئے تھے وہ! مجیب صاحب نے کہا ایک دفعہ عید کے دن وہ ان ہی شخصیات کے ہمراہ مولانا کی رہائش گاہ پر گئے۔ مولانا کو بتایا گیا کہ ہم تین آ گئے ہیں۔ کمرہ بڑا تھا وہ کمرے کے سرے پر کرسی پر کتابیں اور پنسلیں لئے بیٹھے تھے۔ ہم باہر کے دروازے پر تھے۔ جونہی ہم داخل ہوئے، ہم نے کہا "آداب!" اُنہوں نے مدبّرانہ انداز میں کہا۔ "فرمایئے"! ہم نے کہا ہم عید مبارک دینے آئے ہیں۔ وہاں کمرے کے دوسرے سرے سے انہوں نے اونچی آواز دی، ذرا اونچی۔ "شکریہ!" بس ہم مُڑ گئے اور چلے گئے۔ آزاد اس قسم کی خوش آئند چیزوں اور ایسے تعلقات سے بھی کتراتے تھے۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد جمہوریہ ہند کے صدر تھے۔ انہوں نے اپنے فوجی سیکریٹری سے کہا کہ وہ مولانا سے کہہ دیں کہ وہ (صدر مملکت) عید مبارک کیلئے آنا چاہتے ہیں۔ مولانا نے سیکریٹری سے کہا سمجھ لیجئے، عید مبارک ہو گیا (Consider it done)۔ یہ کہتے ہی مولانا نے فون چھوڑ دیا۔ ایک دن شام کے وقت نہرو نے فون کیا تھا اور مولانا سے ملاقات کی خواہش کی تھی۔ مولانا کے سیکریٹری اجمل خان صاحب نے نا کہنا نامناسب سمجھا۔ اس لئے مولانا کے پاس گئے

اور اُن سے کہا کہ پنڈت جی ملنا چاہتے ہیں۔ آزاد نے کہا وہ اُن سے اِس وقت ملنا نہیں چاہتے۔ پنڈت جی وہ شخص تھے جنہوں نے مولانا آزاد کو کابینہ میں لایا تھا اس کے باوجود کہ مہاتما گاندھی اور سردار پٹیل نے نہرو کو بتایا تھا کہ وہ مولانا کو کابینہ میں نہ لائیں۔[1] ایک دفعہ مولانا سرینگر تشریف لائے اور چشمہ شاہی گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرے۔ شیخ محمد عبداللہ اُن دنوں ریاست کے وزیراعظم تھے اور ماشاءاللہ شیر کی طرح دھاڑتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ کشمیر کے لوگ اُنہیں اپنا عظیم لیڈر سمجھتے تھے۔ شیخ صاحب ساڑھے سات بجے شام اُن سے ملنے چشمہ شاہی چلے گئے مگر وہاں مولانا آزاد کے خادم نے کہا کہ مولانا تخلیے میں ہیں اور اس حالت میں کسی سے ملنا نہیں چاہتے۔ شیخ صاحب نے خادم سے کہا کہ انہیں کہدو کہ شیخ عبداللہ آیا ہے۔ خادم نے کہا جناب آپ اندر جاسکتے ہیں مگر ساڑھے سات بجے کے بعد اُن سے کوئی شخص مل نہیں سکتا۔ شیخ صاحب چپ چاپ واپس سدھارے! بی، پی، ایل بیدی صاحب مولانا آزاد سے ایک دفعہ آزادی کے بعد ملنے لگے۔ جب اُن سے خیر خیریت دریافت کی تو انہوں نے نہایت جامع الفاظ میں جواب دیا۔ ''گذر رہا ہوں''، اس ''گذر رہا ہوں'' میں مولانا کی ساری کہانی ہے۔

۱۔ اے، جی نورانی بحوالہ فرنٹ لائن (Frontline)۔

شیخ محمد عبداللہ اور آزادیٔ کشمیر

شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ نے ریاست جموں و کشمیر میں تحریک آزادی شروع کی تھی۔ مسلم کانفرنس نیشنل کانفرنس میں تبدیل ہو چکی تھی مگر سرینگر کے تاجر لوگوں کا ایک طبقہ اس تبدیلی سے ناخوش تھا اور بے زار۔ اس طبقے کا مرکز اندرونِ شہر سرینگر کا وہ علاقہ ہے جہاں جہانگیر گنج میں تجارتی منڈی تھی اور جہاں میر واعظ خاندان سکونت کرتا تھا۔ یہ تحریک ۱۹۴۲، ۴۳ تک پہنچ چکی تھی۔ میں نے اسی دوران علی گڑھ میں ایک خطبہ سُنا تھا جو مشہور و معروف خطیب نواب بہادر جنگ جو مولانا بہادر خان کے نام سے جانے جاتے تھے، نے دیا تھا۔ نواب صاحب شعلہ بیان تھے۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ شیخ محمد عبداللہ سرینگر کے کوچہ و بازار میں اور دی بنڈ سے (The Bund) چھوٹے چھوٹے تاجروں اور دوکانداروں سے ہاکی کا بلّہ ہاتھ میں لئے چندہ جمع کرتے ہیں۔ یہ تاجر شیخ صاحب کے جلال سے ڈرتے ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ شیخ صاحب مسلم لیگ سیاست سے متاثر نہیں ہیں اور اُن کا زبردست جھکاؤ مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد کی طرف ہے۔ شیخ صاحب کوشش تو کرتے ہیں کہ یہ تاجر طبقہ اُن کے خیال کو سمجھنے کی کوشش کرے اور اس لئے ان کے ہاتھ میں آئے مگر ایسا لگتا ہے کہ وہ اس کوشش میں تقریباً ناکام ہو رہے ہیں۔ میں نے بھی ۱۹۴۲، ۴۳ میں دیکھا تھا کہ شیخ صاحب تو پیسہ جمع کرتے ہیں مگر ہاکی کا بلّہ ان کے جلال کا علامتی روپ ہے۔

۱۹۴۴ء میں گوپال سوامی آینگر شیخ صاحب کو ہر طریقے سے منوانے کی کوشش کر رہے

تھے کہ وہ مہاراجہ ہری سنگھ کی حکومت میں شامل ہو جائیں۔ آینگر صاحب بڑے ذہین اور شائستہ افسر تھے۔ ان کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ کیپٹن گنگا رام اور مرزا محمد افضل بیگ منسٹر بنائے گئے تھے۔ میرے ماموں آغا سید احمد نے ان کے اعزاز میں پارٹی کا انتظام کیا تھا۔ شیخ محمد عبداللہ خود تشریف لائے تھے۔ میرے نانا بھی وہاں موجود تھے۔ وہ ان کی زندگی کا آخری سال تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ پارٹی میں آرام سے نہیں بیٹھے تھے۔ وہ جاگیردارانہ نظام کا ایک اہم حصہ تھے۔ ہوم اینڈ جوڈیشل منسٹر رہ چکے تھے۔ پھر یہ کہ وہ جب اننت ناگ کے وزیر وزارت تھے تو مرزا محمد افضل بیگ کے والد مرحوم ان کے ماتحت چپراسی کا کام کرتے تھے۔ اس پس منظر میں ان کی بے چینی سمجھ میں آنے والی کیفیت تھی۔ قطع نظر اس کے اسی سال قائد اعظم محمد علی جناح بھی کشمیر آئے تھے اور شیر کشمیر نے اُن کا پرتپاک استقبال کیا تھا۔ خود جناح صاحب نے فرمایا تھا کہ اس جیسے استقبال کا بادشاہوں کو بھی فخر ہو سکتا ہے۔ مگر خدا کی مرضی کہیے، زمانے کی گردش کہیے، شیخ صاحب قائد اعظم کی گفتگو سے مطمئن نہ ہو سکے اور نہ ان کے نکتہ نظر پر آمادہ۔ شاید اس کی بڑی وجہ قائد اعظم کا طریقۂ کلام اور ان کی ادا تھی۔ ادھر شیخ صاحب بھی ماشاءاللہ کچھ متحمل مزاج اور غیر جذباتی شخص تو تھے نہیں۔ جناح صاحب کے طرزِ کلام اور ان کی ضد سے رنجیدہ ہوئے۔ شیخ صاحب نے اس وقت تک پنڈت جواہر لال نہرو اور مہاتما گاندھی سے مجلس آرائی کی تھی اور ان کی میٹھی زبان، دور اندیش طریقۂ کار سے بھی حظ اُٹھایا ہوگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جناح اور شیخ کے درمیان ٹھن گئی، اتنی کہ جب قائد اعظم واپس گئے تو بارہمولہ میں محمد مقبول شیروانی نے ان کے ساتھ غیر مہذبانہ سلوک کیا۔

قائد اعظم جب سرینگر میں مقیم تھے تو آغا شوکت علی نے ان کو مدعو کیا تھا۔ وہ کانونٹ سکول کے پاس بالکل بنڈ کے نزدیک سر مراتب علی شاہ مرحوم کے سفید ہاؤس بوٹ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں باہر نکلا کہ اُن کا استقبال کروں۔ وہ اپنی ہمشیرہ کے ہمراہ آ رہے تھے۔ جب مجھے دیکھا تو فرمایا ''تم شوکت کے بھائی ہو جو۔۔۔ اس جگہ کا نام کیا ہے۔۔۔

جامعہ ملیہ"۔ میں آداب بجالا چکا تھا مگر ان کے سوال کا جواب دیا۔ "ہاں جو جامعہ ملیہ میں ہے"۔ اتنے میں وہ چلتے چلتے اس مکان کے نزدیک پہنچے جہاں اُنہیں ضیافت کھانی تھی، جہاں آغا شوکت صاحب ٹھہرے ہوئے تھے۔ جونہی وہ گھر میں داخل ہوئے تو ہم سے مخاطب ہوئے۔ "کیا وہ۔۔۔" میں نے کہا جناب ذاکر حسین"۔ اُنہوں نے فرمایا "کیا وہ اب بھی جامعہ ملیہ کا سربراہ ہے؟" اتنے میں وہ کمرے میں داخل ہوئے اور فرمایا "میں نے جامعہ کو باہر سے دیکھا ہے"۔ میں سمجھ نہیں پاتا تھا کہ وہ اس انداز سے کیوں بول رہے تھے۔ کھانا کھا کے میں نے اُن سے کچھ سوالات پوچھے۔ اُنہوں نے ایک طرف مربیانہ اور دوسری طرف ہتک آمیز انداز میں فرمایا "گاندھی آپ کو دھوکہ دینا چاہتا ہے اور آپ کو سمجھ میں نہیں آتا"۔ تقریباً ۴۵ منٹ تک سلسلۂ کلام چلتا رہا۔ انہوں نے کانگریس کی روئیداد سنائی یہ کہتے ہوئے کہ وہ اس کا اندرون جانتے ہیں اور اس فریب کو بھی جو کانگریسیوں نے ان کو دیا۔ میں نے پروفیسر حبیب کے ساتھ دو سال گزارے تھے، ذاکر صاحب کو غور سے دیکھا تھا، اس لئے قائداعظم کے الفاظ مجھے ہضم نہیں ہوئے۔ اس وقت عہد رفتہ کی یہ یادیں میرے دماغ میں بالکل اسی طرح گھوم رہی ہیں جس طرح اس وقت میرے دماغ کو چکرا گئی تھیں۔ علی گڈھ سے جامعہ پہنچتے پہنچتے میں سوچنے لگا تھا کہ نیشنل کانفرنس بنیادی مسئلے کا حل صحیح رنگ میں تلاش نہیں کر رہی تھی۔ اگرچہ وہ ابھی یاسیت کا شکار بھی نہیں ہوئی تھی۔ یہ وہی ایام تھے جب ڈاکٹر عابد حسین صاحب نے میرے بردار آغا شوکت علی کو مشورہ دیا تھا کہ اگر اُنہیں سیاست میں ہی کام کرنا ہے تو اُنہیں شیخ عبداللہ کے ساتھ کام کرنا چاہیے۔ مگر شوکت صاحب جتاح صاحب کے زبردست شیدائی تھے۔

۱۹۴۵ء میں شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ نے سرینگر میں دریائے جہلم پر دریائی جلوس کا اہتمام کیا تھا۔ اس جلوس میں سینکڑوں کشتیوں نے حصہ لیا تھا۔ ان کشتیوں کو کشمیری زبان میں پرندہ کہتے ہیں۔ یہ سجی سجائی کشتیاں ساتویں پُل سے شروع ہوئی تھیں اور پہلے پُل پر

ختم۔ اس جلوس میں پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، رفیع احمد قدوائی اور مسز اندرا گاندھی نے حصہ لیا تھا۔ میں پنڈت درگا پرشاد در کے ساتھ پرانے سیکریٹریٹ کے پاس کھڑا تماشا دیکھ رہا تھا۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں ضیافت خانہ ہے۔ جلوس ہمارے سامنے سے گزر گیا۔ ہم نے اسی وقت سنا کہ چوتھے پل کے پاس جہاں شیخ مخالف طبقے کا مرکز تھا، کچھ لوگوں نے بہت ہی نازیبا سطح پر اُتر کر بدتمیزی کا مظاہرہ کیا۔ یہ لوگ مسلم لیگی تھے جو اس علاقے میں اب بھی رہتے ہیں۔ یہ لوگ مولوی یوسف شاہ صاحب مرحوم کے حمایتی تھے اور انہیں کشمیر میں "بکرہ" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ ان کی اس بدتمیزی پر بعد میں ڈاکٹر ذاکر حسین نے نہایت ہی طنز آمیز الفاظ میں تبصرہ کیا تھا جب میری زبان سے انہوں نے دریائی جلوس کی روئیداد سُنی تھی۔ اُسی دن حضوری باغ سرینگر میں خان عبدالغفار خان مرحوم اور مولانا آزاد نے خطاب فرمایا تھا۔ مولانا احمد نگر جیل سے رہا کئے گئے تھے جہاں انہوں نے معرکتہ الآرا کتاب "غبار خاطر" لکھی تھی۔ ان کی صحت بالکل ٹھیک نہیں تھی۔ ان کی شریک حیات فوت ہو چکی تھی۔ انہوں نے پچتالیس پونڈ وزن بھی کھو دیا تھا۔ بادشاہ خان نے فرمایا "جب میں چھوٹا لڑکا تھا اور یہاں کشمیر آتا تھا، کشمیری سیاح کو دیکھ کر بھاگ جاتا تھا۔ میں بہت خوش ہوں اور شیخ صاحب کو مبارکباد دیتا ہوں کہ کشمیریوں نے اب چھوٹے چھوٹے کنکر پھینکنا سیکھ لیا ہے۔" مولانا آزاد نے اس سے بھی زیادہ جھنجھوڑنے والی بات کہی۔ فرمایا "ایک آواز وہ ہوتی ہے جو آپ کی زبان سے نکلتی ہے اور کان تک پہنچتی ہے اور ایک آواز وہ ہے جو دل سے نکلتی ہے اور دل میں گھر کرتی ہے۔ آپ کی یہ آواز میں برابر سنتا رہا"۔ درمیانی طبقے کے مزاج سے واقف ہوتے ہوئے بھی شیخ صاحب نے "کشمیر چھوڑ دو" کی تحریک ۱۹۴۶ء میں چلائی۔ مہاراج کشن در نے، جو اس وقت کمشنر تھے، پنڈت جواہر لال نہرو کو ریاست میں آنے نہ دیا اور انہیں دو میل سے ہی واپس جانا پڑا۔

یہ سب اپنی جگہ پر ٹھیک مگر ۱۹۴۷ء میں مذہبی تعصّبات کی آگ میں شیر کشمیر شیخ محمد

عبداللہ کا کردار روشنی کا مینار ہے جس پر اور کشمیریوں کی طرح، جنہیں خدا نے عقلی سُدھ بُدھ دی ہے، مجھے بھی زبردست فخر ہے۔ ہندوستان کا بٹوارہ ہوا، سڑکیں بند ہوگئیں، ہر جگہ قتل وغارت کا بازار گرم ہوگیا۔ انسان انسان کو کھانے لگا۔ میں اُن دنوں سرینگر میں بیٹھا تھا۔ یہاں کشمیر میں جامعہ کے دو افریقی طالب علم سیاحت کیلئے آئے تھے۔ ہم نے انہیں آخری بسوں میں راولپنڈی کے راستے واپس بھیج دیا۔ پھر ہم خود اس حملے میں پھنس گئے جسے قبائلی حملہ کہتے ہیں۔ پاکستان نے حملہ آوروں کے ذریعے کشمیر پر دھاوا بول دیا۔ میں اپنے ماموں کے ساتھ شام کے وقت بیٹھا ہوا تھا۔ وہ دربار سے آئے تھے۔ دربار کیا تھا کہ جاگیردارانہ نظام کے بڑے بڑے کارندے جاگیردارانہ لباس پہن کر مہاراجہ سے ملنے جاتے، زربفت کی شیروانیاں، پگڑیاں پہن کر جاتے اور بغل میں تلواریں لٹکاتے۔ مہاراجہ کے حضور اپنی مقدور کے مطابق ایک یا دو پونڈ نذرانے کے طور پر پیش کرتے۔ شام کے سات بج گئے۔ اچانک بجلی بند ہوگئی۔ میں نے ماموں سے کہا کہ پاور ہوس ختم۔ مہاراجہ کو دیر نہ لگی اپنا بوریا بستر گول کرنے میں، چالیس ٹرکوں کا سامان لادنے میں (جو کچھ سامان لادا جاسکا)۔ راتوں رات مہاراجہ ہری سنگھ بھاگ گیا۔[1] شیخ عبداللہ کی اہلیت تھی کہ وہ اس وقت وادیٔ کشمیر کا نظام سنبھال سکے۔ حالانکہ وادی کی انتظامی لگام بالکل ٹوٹ چکی تھی۔ لا اینڈ آرڈر کا کوئی انتظام نہ تھا۔ کوئی لیڈر شپ نہیں تھی۔ شیخ نے انتظام سنبھال لیا۔ لوگوں میں جوش بھر دیا اور نیشنل کانفرنس کا آرڈر لاگو کیا۔ مشہور دانشور پروفیسر اپورب سومناتھ نے ایک ۳۰۳ بندوق کاندھے پر اٹھائی اور مارچ کرنے لگے۔ مجھے معلوم نہیں یہ چند بندوقیں کہاں سے آئیں۔ مرحوم مولانا محمد سعید مسعودی بہت قابل اور ذہین شخص تھے۔ انہوں نے

۱۔ ایک دن میں پروفیسر جیالال کول کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ بڑے عالم وفاضل شخص تھے اور میرے دوست۔ انہوں نے باتوں باتوں میں مجھ سے کہا کہ مہاراجہ ہری سنگھ کی فوج میں اتنی سکت ہے کہ وہ حملہ آوروں کی کسی کوشش کا مقابلہ کم سے کم ڈھائی سال تک کرسکتی ہے۔ حقیقت میں یہ کوشش ڈھائی گھنٹے سے زیادہ آگے نہ بڑھ سکتی تھی۔

چند نعرے وضع کئے۔ ''شیر کشمیر کا کیا ارشاد ہندو مسلم سکھ اتحاد۔ حملہ آور خبردار، ہم کشمیری ہیں تیار''۔ ہم اس نہایت ہی جوشیلے ماحول میں کھلی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ میں چشم دید گواہ ہوں کہ مائسمہ بازار میں شیخ صاحب ایک سترہ سیٹ والی بس پر چڑھ گئے۔ پنڈت جیالال کلم ان کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ پاکستان اور ہندوستان خون خوار موڈ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی گردنیں کاٹ رہے تھے۔ شیخ صاحب نے بس کی چھت پر بہ آواز بلند فرمایا۔ ''اگر جیالال کلم کا خون مائسمہ کی اس نالی میں بہے گا تو میرا خون بھی اُسی کے ساتھ بہے گا۔'' مائسمہ میں اُن دنوں نہ بڈشاہ پُل تھا اور نہ کچھ۔ سرینگر شہر کا یہ کونہ کوئی بڑا مقام بھی نہ تھا۔ میں نے یہ آواز اپنے کانوں سے سُنی اور پھر یہ دیکھا کہ ہندوستانی فوج کے آنے سے پہلے ہی سات آٹھ دن میں کشمیر میں امن بحال کیا گیا۔ ایک واحد واقعہ ایسا پیش نہیں آیا جس سے پتہ چلتا کہ ہندوؤں کو لوٹ لیا گیا، اُن کا قتل ہوا یا ان کے ساتھ کسی نے بدتمیزی کی۔ میں نے خود اس مہم میں چھلانگ ماری تھی اور اپنے بڑے برادر آغا ناصر صاحب کو ششدر کر دیا تھا۔ ہماری ہمسائیگی میں ایک ہیلتھ آفیسر تھے جو بعد میں جیل کے سپرانٹنڈنٹ ہوگئے۔ ان کی پانچ یا چھ بیٹیاں تھیں اور ایک لڑکا جو بعد میں جواں مرگ ہوگیا۔ وہ یہ جان کر بہت ڈر گئے تھے کہ پانچ چھ گھنٹوں کے اندر ہی قبائلی سرینگر شہر میں داخل ہو رہے ہیں۔ مجھے کوئی اختیار نہیں تھا مگر میں نے ایک ڈونگہ کرایے پر لیا۔ اُن لڑکیوں کو ماں کے سمیت اس ڈونگے میں رکھا۔ ان کو سرینگر سے دریائے جہلم کے راستے پلوامہ پہنچایا۔ وہاں میرے برادر تحصیلدار تھے۔ میں جامعہ کے مُوڈ میں تھا۔ مجھے کیا معلوم کہ میرے برادر مجھ سے حد سے زیادہ ناراض ہو جائیں گے۔ اُس نے ان کے لئے کچھ انتظام تو کیا تھا مگر چند دن کے بعد اُن کو پھر سرینگر واپس بھجوا دیا۔ دوسری کہانی ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر کے ساتھ وابستہ ہے۔ وہ بہت اچھے پروفیسر تھے۔ سیدین صاحب نے اُنہیں پرنسپل ایس پی کالج بنایا تھا۔ انہوں نے کیمبرج میں ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری پائی تھی۔ وہ شاعر بھی

تھے اور ہمارے گھرانے کے ساتھ ان کے تعلقات بھی تھے۔ تاثیر صاحب چھٹی پر تھے۔ اُنہوں نے راجباغ کا میرا مکان گرمیوں کیلئے چھ مہینے کیلئے کرایے پر لے لیا تھا۔ وہ اپنی بیگم اور بچوں کے ہمراہ وہاں رہتے تھے۔ کمرے میں ٹائپ رائٹر لیکے چٹھیاں لکھتے تھے اور ''کشمیر ٹائمز'' کو بھیجتے تھے۔ ستمبر میں فیض احمد فیض اور اللہ داد خان اُن سے ملنے آئے تھے اور اُن کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ جب میں اُن کے پاس پہنچا، وہ تینوں آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ میں جامعہ میں اتنا کھویا تھا کہ سمجھ نہ سکا وہ کیا باتیں کر رہے تھے۔ میری بھی ان کے ساتھ ملاقات ہوئی مگر تاثیر صاحب نے اس لئے بلایا تھا کہ میں پچاس ساٹھ روپے لے لوں اور سردار ابراہیم خان کے حوالے کروں اور یہ کہتے ہوئے کہ وہ فوراً پونچھ چلے جائیں۔ میں آبی گذر چلا گیا، روپے ان کے حوالے کئے اور اُنہیں پونچھ روانہ کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہمارے دوستوں نے، جن میں افندی صاحب بھی شامل تھے، مہاراجہ ہری سنگھ کے ساتھ اچھے تعلقات قائم کئے تھے۔ سید حمید علی تاج جو امتیاز علی تاج لاہور کے برادر تھے اور قیوم خان صاحب بہادر جو میرے نانا کے ساتھی تھے، اپنے گھر والوں کے سمیت رخصت ہو گئے اور وہ بھی آخری بسوں میں جو کشمیر سے روانہ ہوئیں۔ یہ لوگ جانے سے پہلے ہم سے ملنے آئے۔ مگر سب سے اہم بات یہ ہے کہ جو پنجابی سیاح یہاں آتے تھے، حملہ آوروں کی وجہ سے حواس باختہ ہو گئے تھے۔ شیر کشمیر نے ان کے لئے تقریباً بارہ ٹانگوں کا انتظام کیا۔ مرد اور عورتیں جموں تک دو سو میل کا سفر طے کرنے کے لئے ٹانگوں پر روانہ ہوئے۔ بانہال روڈ کے تقریباً اٹھارہ میل بہت ہی ناموافق تھے مگر اس کے باوجود بھی سفر جاری رہا۔ جموں میں اُن دنوں حالات بہت ہی خراب تھے۔ جب یہ سیاح ٹانگوں پر نگروٹہ پہنچ گئے تو بارہ میں سے گیارہ ٹانگہ والوں کو بے دردانہ قتل کر دیا گیا۔ حالانکہ انہوں نے ہندوؤں کو جموں پہنچایا تھا۔ ایک ٹانگے والا جو بچا، بھاگ گیا اور افتان و خیزان سرینگر پہنچ گیا۔ پہاڑوں کے اوپر سے سفر کرنا اور وہ بھی پیدل اُس بے چارے کیلئے کتنا دشوار ثابت

ہوا ہوگا خاص کر جبکہ اس کی روح گیارہ ساتھیوں کے مارے جانے اور خوف و ہراس سے شدید مجروح ہوگئی تھی۔ یہ شخص جو بچ نکلا، لائیڈز بنک سرینگر کے پاس اپنا ٹانگہ کھڑا کرتا تھا۔ یہ ٹانگے والا جو پندرہ دن لگاتار پیدل سفر کرتے کرتے سرینگر آ پہنچا تھا، کون تھا؟ کشمیر کے امیر ترین لوگوں میں سے ایک شخص گپکار کے پاس رہتا تھا اور نو مکانوں کا مالک تھا۔ اس کا نام جعفر خان تھا۔ اس کا گھرانہ بھی جاگیردارانہ نظام کے ساتھ وابستہ تھا۔ یہ بڑا کنجوس تاجر تھا جو قالین کی تجارت کرتا تھا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کے بیٹے نے اپنی ساری جائیداد کم ہی عرصے میں ختم کر ڈالی تھی۔ پہلی بیوی سے اس کا ایک بیٹا تھا جسے اُس نے جائیداد سے محروم کر دیا تھا۔ یہ نامراد بچہ اپنا پیٹ پالنے کیلئے اب تانگہ چلاتا تھا۔ اس کی بیٹی میری ممانی نے گود لی تھی اس لئے کہ اس کا کئی بار اسقاط حمل ہوا تھا۔

شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ کی قد آور شخصیت اس طوفانی دور میں توجہ کا مرکز بن گئی تھی۔ اس کی ایک جھلک! مسٹر صنم نربو اسسٹنٹ انجینئر، بڑے شریف، دل والے اور قابل آدمی تھے۔ بعد میں شیخ صاحب کی کابینہ میں وزیر رہے۔ جنرل پوسٹ آفس سرینگر کے قریب چار کمروں والی ان کی قیام گاہ تھی۔ پنڈت ڈی، پی در ایک شام وہاں بیٹھے ہوئے تھے اور سکاچ پی رہے تھے۔ ہندوستانی فوج ابھی کشمیر میں وارد نہیں ہوئی تھی۔ ''شیر کشمیر کا کیا ارشاد'' گونج رہا تھا دفعتاً یہ بول در صاحب کی زبان سے نکلے۔ ''میں حیران ہوں کہ شیخ محمد عبداللہ کی جبروت اور ایمان کا ماخذ کیا ہے''۔ (I Wonder what is the source of his strength and conviction) ہندوستان اور پاکستان کے حالات کیا تھے۔ ان حالات کے پیش نظر یہاں کشمیر میں شیخ صاحب کا عمل کیا تھا۔ در صاحب اس عمل کو دیکھ کر حیران و ششدر ہو گئے تھے اور کیف و سرور کی حالت میں بھی اپنی حیرانگی ظاہر کر رہے تھے۔ شیخ صاحب کو اُن دِنوں پوجا جاتا تھا۔ کشمیری پنڈت اس میں پیش پیش ہوتے تھے۔ وہ اُن کا بچاؤ کرتے تھے۔ کئی ایک جلسوں میں میں نے اپنے کانوں سے اُنہیں کہتے سنا کہ شیخ محمد

عبداللہ لارڈ کرشنا ہیں۔

ہندوستان کا بٹوارہ ہونے والا تھا۔ جون جولائی ۱۹۴۷ء کا زمانہ تھا۔ مہاتما گاندھی سرینگر تشریف لائے تھے اور کستوری لال کے گھر میں ٹھہرتے ہوئے تھے۔ کستوری لال تاجر تھے۔ مکاں کرایے پر لیا گیا تھا۔ بادشاہ خان کے فرزند ولی خان صاحب اور ان کے بہنوئی بھی تشریف لائے تھے۔ میری والدہ آغا شوکت کی چھوٹی بیٹی تہمینہ کے ساتھ گاندھی جی سے ملنے گئی تھی۔ شوکت صاحب جیل میں تھے۔ میری والدہ باپو سے درخواست کرنا چاہتی تھی کہ وہ مداخلت کریں اور شوکت کو رہا کرائیں۔ شوکت صاحب، محمد علی جناح کی تحریک میں شامل ہوئے تھے اور جنرل سیکریٹری کی حیثیت سے مسلم کانفرنس میں کام کررہے تھے۔ اُنہوں نے جموں وکشمیر گورنمنٹ کی سول سروس سے استعفیٰ دیا تھا اور جناح صاحب کے ساتھ مل گئے تھے۔ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ دلّی میں عابد حسین نے اُنہیں مشورہ دیا تھا کہ اگر وہ سیاست میں ہی کام کرنا چاہتے ہیں تو اُنہیں شیخ عبداللہ کے ساتھ ملنا چاہیے۔ شوکت صاحب نے عابد صاحب کا مشورہ رد کیا تھا۔ تقسیم کے بعد شیخ صاحب نے شوکت صاحب کو کہ جو اُس وقت جیل میں تھے، برگیڈیر گنسا رام کے عوض پاکستان دھکیل دیا۔ یہ تبادلہ کا معاملہ تھا مگر شوکت صاحب پاکستان نہیں جانا چاہتے تھے۔ بعد میں جب وہ پاکستان چلے گئے تو اُنہیں وہاں بہت المناک زندگی گزارنی پڑی۔ بہرکیف، میری والدہ نے تہمینہ کا آٹوگراف بک اُٹھایا اور اس کے ساتھ دس روپے کا نوٹ رکھ کر گاندھی جی کے پاس لے لیا۔ گاندھی جی تہمینہ کے ہاتھ بہت پیار سے چھو رہے تھے، اتنے پیار سے کہ میں کبھی بھول نہیں سکتا۔ وہ شاید امیروں کی فیاضی دیکھنے کیلئے دس روپے کا نوٹ مانگتے تھے۔ شاذ ہی کوئی دس روپے سے زیادہ دیتا تھا۔ پھر یہ باور کرنے کیلئے کہ نوٹ ایک ہی ہے یا ایک سے زیادہ۔ وہ اسے بار بار اس طرح مروڑتے کہ دیکھنے والا سمجھتا کہ نوٹ پھاڑ دیا گیا۔ پھر وہ اسے پھینک دیتے تھے۔ جب مہاتما میری بھتیجی کے چہرے کو چھو رہے تھے تو والدہ نے

کہا۔ ''میرا بیٹا، اس بیٹی کا باپ، آغا شوکت جیل میں ہے۔ میں کھدر پہنے ہوئے تھا۔ ولی خان صاحب نے گاندھی جی کو کہا کہ میں جامعہ میں کام کرتا ہوں۔ گاندھی جی نے ہاتھ ہلا دیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کہنا چاہتے تھے کہ میں اگر جامعہ میں کام کر رہا ہوں تو پھر سرینگر میں میری موجودگی کا مطلب کیا۔ میں نے کہا میں سرینگر میں ہوں اس لئے کہ آج کل جامعہ میں چھٹیاں ہیں۔ اُنہیں یقین آیا[1]۔ اُنہی دنوں وہ مہاراجہ ہری سنگھ سے ملے اور یہ ملن ایک تاریخی واقعہ ہے۔ جب گاندھی جی اپنے خاص مُوڈ میں ہوتے تھے تو بقول عابد حسین ان کی سادگی دیکھنے کی چیز ہوتی تھی۔ ایسی سادگی نہ نہرو میں دیکھی جا سکتی تھی اور نہ سردار پٹیل میں۔ جب مہاتما مہاراجہ ہری سنگھ سے سٹیشن ویگن میں ملنے گئے تو اُنہوں نے اپنی بکری ساتھ اٹھائی۔ انہوں نے مہاراجہ سے کہا کہ وہ اپنی ہی بکری کا دودھ پیتے ہیں۔ اس کے پرائیویٹ سیکریٹری کا کہنا ہے کہ گاندھی جی نے یہ جملے مہاراجہ سے کہے۔ ''میں یہاں لوگوں سے ملا ہوں۔ وہ آپ کے بارے میں بہت اچھی باتیں کرتے ہیں۔ ان کے خیالوں میں بھی آپ کی اچھائی رچی ہے۔ مگر حضور والا، وہ آپ کے وزیر اعظم کو پسند نہیں کرتے''۔ یہ کہہ کر انہوں نے بکری کا دودھ لیا اور چل پڑے۔ دوسرے دن رام چند کاک سبکدوش کئے گئے۔ اس کے کچھ وقت بعد قبائلی حملہ شروع ہوا۔ مہاراجہ بھاگ گیا اور شیر کشمیر نے انتظام سنبھالا۔

۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۳ء تک اور اس کے بعد کشمیر کی تاریخ میں جو سیلاب آئے، اُن سے قطع نظر ہم اس دن کا ذکر کریں گے جب ۱۹۵۸ء میں شیخ محمد عبداللہ کو رہا کیا گیا۔ اُن دنوں میرے پاس موٹر نہیں تھی۔ ہم نے سُنا کہ شیخ صاحب سرینگر آ رہے ہیں اور راستے میں اُن کا استقبال کیا جا رہا ہے۔ میں اپنے اہل و عیال کے سمیت لائیڈز بنک کے پاس دریا پار کر کے لالہ شیخ کی دُکان کے سامنے کھڑا رہا۔ میں نے دیکھا قالینوں کے بڑے تاجر محی الدین اینڈ سنز کی پہلی منزل پر کشمیر کے دو مشہور و معروف ڈاکٹر ایک کھڑکی سے چوری چوری

۱۔ گاندھی جی نے اس دن مون بھرت (Silence Day) رکھا تھا جو ہفتے میں ایک دن لازم تھا۔

جھانک رہے تھے، ڈاکٹر علی محمد جان مرحوم اور ڈاکٹر حفیظ اللہ مرحوم۔ کھڑکی سے پردہ ذرا سا ہٹا کر یہ دونوں ڈاکٹر دیکھ رہے تھے۔ یہ دو معالج بڑے خوش اور پرجوش نظر آرہے تھے۔ ہم گھنٹوں انتظار کرتے گئے کیونکہ شیر کشمیر بہت دیر سے سرینگر پہنچ گئے۔ شیر کو جنوری میں رہا کیا گیا تھا۔ بخشی صاحب کو اس رہائش کے تلخ نتیجوں اور مشکلوں کا نہ کوئی اندازہ تھا اور نہ یقین۔ کھلی دھوپ تھی۔ اودھم پور سے جگہ جگہ لوگوں نے شیر کا پرجوش استقبال کیا اور روک روک کے چھوڑا۔ وہ کھلی جیپ میں اچکن پہنے ہوئے تھے اور عصا (لاٹھی) ہاتھ میں لئے ہوئے لوگوں کو مار رہے تھے، ہنس ہنس کر۔ ان کی موٹر تیز تیز دوڑ رہی تھی مگر ہزاروں لوگ اس کے پیچھے دوڑ رہے تھے اور اُنہیں روک رہے تھے۔ جو بھی شخص ڈنڈے کا مزہ چکھتا، پکار اٹھتا۔ ''میری ریح کی بیماری ختم''۔ کیا نظارہ تھا شیخ کی اودھم پور سے واپسی کا۔ کمیونسٹ لیڈر موتی لال مصری اُسی دن کچھ دیر کے بعد مجھ سے ملے اور کہا۔ ''آپ نے شیر کشمیر کو دیکھا؟[1]'' اس کے بولوں سے مٹھاس اور محبت ٹپک رہی تھی۔ استقبالی جلوس مجاہد منزل سرینگر میں شام کی نماز کے ساتھ ساتھ ختم ہوا۔ شیخ صاحب نے خود بھی نماز پڑھی اور نماز کے بعد ہی دیہات سے آئے ہوئے لاتعداد لوگوں کو رخصت کیا۔ سارا کشمیر خوشیوں سے بتیاں جلا جلا کر جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ اُس وقت کنگس لے مارٹن (Kingslay Martin) نے شیخ عبداللہ کی گرفتاری کے بارے میں نیو سٹیٹس مین لندن میں لکھا تھا کہ نہرو کی شہرت پر دھبا لگ گیا، اُس انداز سے جس سے شیخ کی گرفتاری عمل میں لائی گئی۔ اُس نے لکھا تھا کہ پنڈت نہرو جیسے شخص کیلئے ایسا کرنا افسوس ناک تھا۔ پانچ سال تک ہندوستانیوں نے کشمیریوں کا دل جیتنے کی کوشش کی مگر وہ جس چیز کو دل سمجھ بیٹھے وہ تو معدہ تھا۔ مارٹن کی نظر میں ہندوستان اس کوشش میں ناکام رہا!

اس المیے (Tragedy) کا ایک اور منظر! میں جب امریکہ سے پی ایچ ڈی کر کے

۱۔ مصری صاحب آنجہانی نے ''پادرسہہ'' لفظ استعمال کیا تھا یعنی شیر ببر۔

واپس آ گیا تو وادی کشمیر موئے مقدس صلّی اللہ علیہ وسلم کی چوری کے افسانوں میں محو تھی۔ پروفیسر جیالال کول میرے قریبی دوست تھے۔ انہوں نے مجھے جو مدّت کے بعد دیکھا تو باغ باغ ہو گئے۔ موئے مقدس کی چوری اور بازیابی کے ساتھ ساتھ کشمیری مسلمان کے خون کے اُبال کی داستان انہوں نے سلیقے اور جوشیلے انداز میں سُنائی۔ کہا ہندو، مسلمان، سکھ حضوری باغ میں اکٹھے نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک سردار صاحب سجدے کی ہی حالت میں رہے جبکہ باقی سب قیام کیلئے اُٹھے۔ سردار صاحب کو کیا معلوم تھا کہ نماز میں سجدہ ہی نہیں، قیام اور رکوع بھی ہوتے ہیں۔ پھر کول صاحب نے کہا ایسا پُرامن اور کامیاب انقلاب انہوں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اُنہوں نے کہا کہ وہ تحریک اول سے لیکر آخر تک یقیناً شاندار تھی! کول صاحب کے مشاہدات مسلّم مگر میں نے دوسرے لوگوں سے بھی سنا کہ تحریک کے دوران لوگوں نے ایسے غیر معمولی برتاؤ کا مظاہرہ کیا کہ تاریخ میں اس کی مثال نہیں۔ لوگ ہزاروں کی تعداد میں دیہات سے روز آتے تھے، سرینگر میں جلسوں جلوسوں میں حصہ لیتے تھے مگر اُن کے کھانے پینے کا انتظام ہوتا تھا۔ ایسا کہ لگتا تھا کہ اس روزانہ انتظام میں مافوق الانسان مخلوقات (superhuman creatures) حصہ لیتی تھیں۔ شہر کے لوگ صبح سے شام تک گھروں سے باہر رہتے تھے۔ صرف وہ جو معذور ہوتے تھے یا جو کمسن بچوں کی دیکھ بال کرتے تھے، گھر پر رہتے تھے۔ سب لوگ مجنونانہ جذبات سے شرابور موئے مقدسؐ کی بازیابی کیلئے نمازیں پڑھتے تھے، دعا مانگتے تھے اور جلسوں جلوسوں میں حصہ لیتے تھے۔ اُن ایام کی ابتدا میں ہی بخشی عبدالرشید کے متکبّرانہ کلمات کا لوگوں نے دندان شکن جواب دیا تھا جب کانگڑیاں اس کے اوپر پھینک دی تھیں۔

میں ۱۹۶۵ء میں کشمیر یونیورسٹی چلا گیا۔ میں نے شعبہ تعلیم کھولا اور اس کی سربراہی ہاتھ میں لی۔ چند مہینوں کے بعد وید مہتا جی نمودار ہوئے۔ اُنہیں انگریزی کے شعبے نے جگہ نہیں دی تھی اور اس لئے مایوس کر دیا تھا۔ مہتا صاحب امریکہ میں اندھوں کے سکول میں

کام کر رہے تھے۔ نیویارک سے سرینگر آئے تھے۔ میں نے جو سنا تو انہیں اپنے شعبے میں لایا اور اپنے کلاس میں۔ اُنہیں کرسی پر بٹھایا اور ان کے ساتھ گفتگو شروع کی۔ میں نے اُن سے کشمیر آنے کی وجہ پوچھی۔ وہ کہنے لگے کہ وہ موئے مُقدسؐ کی داستان کے بارے میں تحقیق کرنے آئے ہیں۔ اگرچہ تھوڑا سا خوف و ہراس ماحول پر چھایا ہوا تھا جس وجہ سے انگریزی ڈیپارٹمنٹ میں مہتا صاحب کو جگہ نہیں ملی تھی، میں نے اُنہیں اپنے شاگردوں کے ساتھ متعارف کرایا۔ میرے شاگردوں نے ان کے ساتھ باتیں کیں۔ اس وقت تک مہتا صاحب موئے مُقدس کے بارے میں خالی الذہن تھے۔ مہتا صاحب کی مدد کرنا آسان نہ تھا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ ہوئی تھی۔ ماحول صاف نہیں تھا۔ لوگ خوف زدہ تھے۔ انتظامیہ میں بھی تذبذب تھا۔ میرے ڈیپارٹمنٹ میں بھی پتلے پتلے ایک کشمیری پنڈت کو بھیج دیا گیا تھا۔ وہ سپرانٹنڈنٹ تھا اور یونیورسٹی نے اُسے ہدایت دی تھی کہ حالات پر نظر رکھے اور ہمارے اور ہمارے شعبے کے بارے میں رپورٹ پیش کرے۔ میں نے اِن پنڈت جی سے التماس کیا وہ اپنی صحت کا خیال رکھیں اور دوسری بار میرے شعبے میں تشریف لانے کی تکلیف نہ اُٹھائیں۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ یونیورسٹی اور قمار خانے میں فرق جاننے کیلئے وہ اپنے افسروں سے مدد حاصل کریں۔ وہ تو چلا گیا مگر مجھے مہتا صاحب کے ساتھ پیدا شدہ نفسیاتی کیفیت میں ہم کلام ہونا پڑا۔ مہتا صاحب بولے۔ ''میں پیسے خرچ کروں گا اگر آپ کے شاگرد اُس وقت کے اخبارات مہیا کریں گے جب موئے مُقدسؐ اُٹھایا گیا تھا۔ میں اُن کا انگریزی ترجمہ بھی چاہوں گا۔'' میں نے دو تین شاگردوں کو اس کام پر لگایا۔ اُنہوں نے اخبارات مہیا کئے اور ان کا انگریزی ترجمہ بھی مہتا صاحب کیلئے کر کے لایا۔ پھر نیویارکر (New Yorker) میں موئے مُقدسؐ کے بارے میں ایک لمبا مضمون چھپ گیا۔ مہتا صاحب نے یہ مضمون سرینگر میں ہفتہ بھر ٹھہرنے کے بعد لکھا تھا۔ وہ روز میرے گھر کھانے پینے کیلئے آتے تھے۔ اگر انہیں کوئی شخص میرے پاس

آنے سے روکتا، وہ اُسے بہت سخت الفاظ میں ڈانٹتے۔ وہ واپس تو چلے گئے مگر میرے مرحوم فرزند آغا شاہد علی سے ملتے رہے اور اُسے داستانِ کشمیر سناتے رہے۔

کشمیر میں موئے مُقدس کی بازیابی کے بعد وہی پرانی اداسی، وہی مایوسی، وہی انتشار قائم رہا جو اس بدقسمت ریاست کی تقدیر میں لکھا ہوا ہے۔ اس کے دوراں لوگوں کو اُمید تھی کہ کچھ نہ کچھ فیصلہ ہو جائے گا اور ان کی تقدیر بدل جائے گی۔ ایک حوصلہ افزا بات سامنے آئی تھی کہ شیر کشمیر اپنے دو ساتھیوں مولانا محمد سعید مسعودی اور مرزا محمد افضل بیگ کے ہمراہ پاکستان چلے گئے تھے۔ وہاں جنرل ایوب خان اور خاص کر ذوالفقار علی بھٹو حکومت کر رہے تھے۔ مگر وقت نے ساتھ نہ دیا۔ پنڈت جی بیمار ہو گئے اور ان کی وفات ہوئی اور ساری امیدیں زمیں بوس ہو گئیں۔ شیخ صاحب حج کے دوران بڑے بڑے لوگوں سے بھی ملے تھے مگر نتیجہ وہی ہندوستانی کلاسیکل موسیقی کا جو کبھی مُدھر دھن بن نہیں سکتی۔

ایک کشمیر پنڈت میرا دوست تھا۔ اُس نے اپنی کتاب میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ شیخ محمد عبداللہ ایڈلائی سٹی ون سن (Adlai Stevenson) سے اس لئے ملے تھے کہ وہ کشمیر کو آزاد ریاست بنانا چاہتے تھے۔ یہ ایک سازش تھی جس سے کشمیر کو ہندوستان سے الگ کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ مگر میں اس بات کی تصدیق کرنا چاہتا ہوں کہ شیخ صاحب نیا کشمیر کا پروگرام چلانے کی فکر میں ہمہ تن مصروف تھے۔ ایسا ہی پروگرام کانگریس کا ہندوستان بھر کیلئے تھا۔ شاید اس وجہ سے بھی کانگریس اور نیشنل کانفرنس یا گاندھی، نہرو اور شیخ صاحب کے درمیان خط مستقیم بن گیا تھا۔ کانگریس نے زمین کاشتکار کو نہ دی۔ یہ ان کی مجبوریاں تھیں یا اور کوئی معاملہ اس میں حائل تھا۔ مگر ایسا لگتا ہے کہ سردار پٹیل کے زمانے سے ہی شیخ کے پاؤں اُکھاڑنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے کشمیر کے چیف منسٹر دلّی کی مشین میں بنائے جانے لگے۔ مگر اس سارے ڈرامے کی جڑ ''زمین کاشتکار کو دو'' (Land to the Tiller) میں پیوستہ تھی۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ شیر کشمیر پر

حکومت کرنا ناممکن تھا اور یہ کہ اس کے ہوتے ہوئے پرائیویٹ پراپرٹی کا تحفظ ناممکن تھا خاص کر کشمیری مڈل کلاس کیلئے۔ اس لئے شیخ صاحب کو ہٹانا اگرچہ ناممکن دکھائی دیتا تھا مگر اسے ممکن بنادیا گیا۔ مثلاً مجھے معلوم ہے کہ شودر جُو کا چرواپنے بیٹے ڈی، این، کا چرو سے بہت ناراض تھے۔ ڈی، این کو اچھی خاصی موٹر دی گئی تھی کہ وہ دلّی کی باتیں شیخ صاحب تک پہنچائے اور شیخ صاحب کے جواب دلّی تک تاکہ شیخ کی جذباتی کیفیت کے ساتھ ساتھ اس کے من کی باتیں معلوم ہوسکیں اور لگاتار۔ اس منافقانہ رول سے زخموں پر نمک پاشی ہوتی رہی۔ جولائی ۵۳ء کے مہینے میں مجھے معلوم نہیں میں ایک عشائیے (dinner) میں کیسے شریک تھا۔ جس میں شیخ صاحب بھی موجود تھے۔ شیخ صاحب نے کہا نہرو کی سوچ ترقی پسند ہے مگر ان کا عمل رجعت پرست۔ ایسی ہی باتیں دلّی تک پہنچائی جاتی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نہرو اور شیخ صاحب کے درمیان خلیج پیدا کردی گئی۔ بدقسمتی سے شیخ صاحب نے دانشمندی سے کام نہ لیا بلکہ ہوم منسٹری کے اردگرد ناچنے والوں کیلئے موقع فراہم کیا کہ وہ اگست کی ایک نیم شب کو شب خون مار کر کشمیر کی تاریخ میں سیاہ ترین داغ لگادیں۔ ہندوستان کے ساتھ کشمیر کا ناطہ بڑا نازک تھا۔ اس کی کوئی بنیادی چیز ٹوٹ گئی۔ یوں کہیے کہ اس کی شہ رگ پھٹ گئی۔ حالات اور واقعات کو چھچھورے پن اور سفلگی سے ہاتھ میں لیا گیا۔ میں نہیں کہتا شیخ عبداللہ صحیح تھے یا پنڈت نہرو غلط۔ میں یہ بھی نہیں کہتا کہ رفیع احمد قدوائی کا وتیرہ عام مسلمانوں کی طرح عامیانہ تھا۔ مگر ایک کنکر کے گرنے کے ساتھ ساتھ برف جمع ہوتی گئی، ہوتی گئی یہاں تک کہ برف کا بہت بڑا تودہ جمع ہوگیا۔ اُس نے پگل پگل کر آج تک بہت طغیانیاں لائی ہیں مگر خود ہے کہ ابھی تک جما ہوا بیٹھا ہے۔ میں نے ہر وقت، ہر جگہ، سکولوں، کالجوں، پبلک میٹنگوں میں لوگوں کے ساتھ باتیں کی ہیں۔ ہر جگہ جواب ملتا رہا ہے۔ ''کس طرح ہم ہندوؤں کی بھاری اکثریت پر بھروسہ کریں گے جبکہ تقسیم ہند کے بعد یکے بعد دیگرے سارے حالات بزبانِ حال کہہ رہے ہیں کہ کیا ہوا اور کیا ہو رہا

ہے"۔ میرے پاس لوگوں کی زبان بند کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ مجھے کشمیری پنڈتوں نے وقتاً فوقتاً کہا ہے کہ اگر کشمیر ہندوستان سے جدا ہوا تو یہاں خون کی ندیاں بہہ جائیں گی۔ یہ خوف و ہراس کشمیر پر کالی گھٹاؤں کی طرح منڈلا رہا ہے۔ نہرو ہر وقت ہندوستان کے مسلمانوں کی بات کرتا تھا اور دیانت داری سے، خاص کر تقسیم ہند کے بعد وہ ہندوؤں کو بتانا چاہتا تھا کہ اگر مسلمانوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو گے تو ریاست جموں و کشمیر کے سارے مسلمان تمہارے گلے لگ جائیں گے اور تمہارے ساتھ مل جائیں گے مگر شیخ صاحب کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر سارا معاملہ جٹ پٹ خراب کر دیا۔ مثلاً سٹیٹ بنک آف انڈیا اور انڈین ائر لائنز میں مسلمانوں کی تقرری۔ حالانکہ اس معاملے کی بہت اہمیت ہے۔ مجھے یاد ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک دن جگ جیون رام کو خط لکھا تھا کہ اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ جموں و کشمیر میں پوسٹس اینڈ ٹیلی گراف ڈیپارٹمنٹ میں مسلمانوں کو جگہ نہیں مل رہی ہے۔ صرف غیر مسلموں کو لیا جا رہا ہے۔ ہم مسلمانوں کو کیا کہیں گے اگر ان کو برضا و رغبت ہندوستان کے ساتھ جان ملنا ہے۔ آزاد کا خط میرے پاس موجود ہے۔ موسیٰ رضا صاحب جموں و کشمیر کے چیف سیکریٹری تھے۔ انہوں نے ایک دن دہلی میں یہ مسئلہ اٹھایا کہ مرکزی حکومت کے تحت کسی بھی محکمے میں کشمیر کا کوئی مسلمان کام نہیں کرتا۔ جواب ملا کہ کشمیری اُن امتحانات میں پورے نہیں اُترتے جو سروسز (ملازمتوں) کیلئے لئے جاتے ہیں۔ رضا صاحب نے کہا مگر چپراسی کی اسامیاں پُر کرنے کیلئے تو کوئی امتحان ہی نہیں لیا جاتا۔ اس سے دلّی والوں کی منطق ٹوٹ گئی تھی۔ یہ بات سورج کی طرح کھلی چمکتی ہے کہ ۱۹۵۳ء اور ۱۹۷۵ء تک ہندوستان کی کسی بھی ریاست کا چیف منسٹر یا اس مہان دیس کا کوئی بھی وزیر اعظم کشمیر کی کسی جگہ پر عوام سے خطاب نہ کر سکا، نہ دیہات میں اور نہ سرینگر میں۔

شیر کشمیر گرفتار ہوئے تو سارا کشمیر اُمڈ آیا۔ صبح سے شام تک جگہ جگہ مظاہرے کئے گئے جن میں لوگوں نے جوق در جوق شرکت کی۔ یہ ایک طرح کا رفرنڈم تھا یا رائے شماری جس

سے ثابت ہوا کہ کشمیر عبداللہ کے ساتھ ہے۔ پھر کیا ہوا کہ فوج اور فوج اور فوج نمودار ہوئی اور لوگوں کو دھیرے دھیرے اندر رکھا گیا۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ سنانے کے لائق ہے۔ اُن دنوں میرے بڑے بھائی آغا ناصر صاحب انت ناگ کے ڈپٹی کمشنر تھے۔[1] جب شیخ صاحب گرفتار ہوئے تو ہندوستانی فوج نے کشمیریوں پر لائٹ مشین گن سے فائرنگ کی۔ ایک پارسی برگیڈیر مسٹر بلموریا (Bilmoria) جنوبی ہند کے رہنے والے تھے۔ وہ ناصر صاحب کے پاس آ گئے اور اُنہیں یہ افسوس ناک کہانی سنائی۔ یہ برگیڈیر اتنا ہل گیا تھا کہ اس نے فوج سے استعفیٰ دی اور پاکستان چلے گئے۔ بہرحال یہ تھی فوج کی کہانی مگر اس کے ساتھ ایک اور دور شروع ہو گیا۔ جگہ جگہ غلّہ فراہم کیا گیا اور سستے داموں لوگ شالی اور چاول خریدنے لگے۔ چین سے دھان کے بیج لائے گئے جن سے پیداوار میں کافی اضافہ ہو گیا۔ سڑکوں کا جال بچھایا گیا۔ سکول کھولے جانے لگے اور جگہ جگہ۔ فیس کا نام ونشان بھی پرائمری سکول سے یونیورسٹی تک نہ دیکھا گیا، ملازمتیں فراہم کی گئیں، لوگوں کے معاملات کی شنوائی ہونے لگی، پھٹا پھٹ لوگوں کے مشکلات دور کئے جانے لگے، ہنسی اور کھیل تماشا کا انتظام کیا جانے لگا، جشن کشمیر میں ہندوستانی ایکٹروں اور ایکٹرسوں سے کرکٹ میچ کھلوائے گئے۔ کشمیر ترقی کے نقشے پر آنے لگا۔ شیر کشمیر کے وقت میں ہی ''پیسہ نہیں'' کی آواز دلّی سے آنے لگی تھی مگر بخشی صاحب کے دور میں پانی کی طرح پیسہ بہایا گیا۔ کہا جا سکتا ہے کہ شیخ صاحب کے دور میں اقتصادی پابندیاں (Economic Sanctions) لگا دی گئی تھیں تا کہ لوگ اُن سے متنفر ہو جائیں یا نیا کشمیر کا پروگرام آگے نہ بڑھ سکے۔ میں انسپکٹر سکولز تھا۔ ایک دن شیخ صاحب نے نہایت ہی موثر اور جذباتی انداز میں کہا ''آغا صاحب، جب سارا تعلیمی بجٹ ایک کروڑ ہوگا، ہمارے سارے تعلیمی مسائل دور ہوں گے''۔ اُس وقت جموں وکشمیر کا تعلیمی بجٹ ساری چیزیں ملا کر صرف پچاس لاکھ روپے تھا۔

۱۔ اب انت ناگ کو عام زبان میں اسلام آباد کہا جاتا ہے۔

آج اُس ریاست میں ایک ایک ہائر سکنڈری سکول کا بجٹ ایک کروڑ سے زیادہ ہے۔ شیخ صاحب کے وقت میں استاد کا ماہوار وظیفہ پچاس روپے تھا۔ آج ہائر سکنڈری کا اُستاد کم سے کم بیس ہزار روپے ماہانہ تنخواہ پالیتا ہے۔ اُس وقت دسویں جماعت پاس کرنے کے بعد لکھنے پڑھنے کی صلاحیت نہ ہی طور پر دیکھی جاسکتی تھی، آج یونیورسٹی کے فارغ التحصیل مشکل سے لکھ پڑھ سکتے ہیں۔ مطلب یہ کہ ان کی تحریر بھی ناقص ہے اور اُن کا مطالعہ حد سے زیادہ کمزور۔ آج کوئی کتاب نہیں پڑھتا، کسی کو تعلیم کی فکر نہیں۔ ہم نے اندھا دھند تعلیمی اداروں کا جال پھیلایا ہے۔ استادوں کو آنکھ بند کر کے تعینات کیا جاتا ہے۔ ان کی تعلیمی قابلیت کا حسب ضرورت خیال نہیں رکھا جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص انتظامیہ میں کسی جگہ گھس نہیں سکتا تو اسے مدرسے میں بٹھایا جاتا ہے۔[1] اب رہبر تعلیم کی مسخ شدہ صورت میں ہی سہی۔ جب مفتی محمد سعید تعلیم کے منسٹر بنے تو کہنے لگے، پانچ سو استادوں کی تقرری کرو۔ بخشی تھا یا صادق، میر قاسم تھا یا فاروق عبداللہ، استادوں کو بھرتی کیا گیا۔ اس دوران رشوت کا بازار بھی سج گیا۔ نتیجہ؟ استاد نے وہ عظمت کھوڈالی جو برہمنی دور سے چلی آرہی تھی، جس میں مسلمان حکمرانوں نے بھی شاندار رول ادا کیا تھا۔ اس میں کشمیری پنڈتوں کی قابلیت بھی کام آئی۔ وہ بے دل ہوگئے اور پریشان حال۔ شیخ عبداللہ کی گرفتاری مسلمانوں کا حق بن گئی۔ وہ تو لاڈلوں کی طرح پالے جانے لگے۔ محنت شاقہ، دل چسپی، ذوق و شوق، تعلیم اور تمدن سے ذاتی اور مجلسی زندگی کا نکھار اور اعتبار، سب چیزیں ختم ہوگئیں۔ جب میں ۱۹۶۴ء میں امریکہ سے ڈاکٹوریٹ لیکے واپس آیا، میں نے دیکھا کہ مسلمانوں کا ایک طاقتور فرقہ (طبقہ کہنا زیادہ مناسب نہیں) وجود میں آیا تھا۔ اس نے میڈیکل اور انجینئرنگ تعلیم سے بھی فائدہ اٹھایا اور دیگر تعلیمی و غیر تعلیمی سہولیات سے بھی۔ لگتا ہے کہ

۱۔ ماشاء اللہ دوسرے شعبوں میں جو لوگ گھس گئے وہ ذہنی اور اخلاقی اعتبار سے زیادہ مختلف نہ تھے۔ تاہم استادوں کی بات ہی اور ہے۔ جس قوم کا اُستاد خالی الذہن ہے، اسکی نیا ڈوب گئی۔

کشمیر کو شکم پروری اور شکم پُری سے جیب میں ڈالدیا گیا تھا مگر جب موئے مُقدسؐ کی بازیابی کی تحریک چلی تو لوگ دیوانہ وار سڑکوں پر نکل آئے۔ اس طرح معاملے کی قطعی مختلف صورت حال سامنے آئی!

کشمیر کی رواداری، مذہبی دریا دلی، درویشانہ خصلت اور بھائی چارے کی سرشت کب تک اُن آندھیوں سے محفوظ رہتی جن کا نام تقسیم ہند، ہندوستان پاکستان کا قتل عام، جموں توی کا خونین رنگ اور روادار جدید ریاست کی حیثیت سے پاکستان کی ناکامی ہے۔ ۱۹۵۳ء میں شیخ محمد عبداللہ کی گرفتاری عمل میں لائی گئی۔ اس کے بعد لاقانونیت اور ظلم و جور کا بازار گرم رہا[1]۔ لوگ تنگ آ گئے اور انہوں نے اپنے بارے میں نہ جانے کیا کیا سوچنا شروع کیا۔ ۱۹۷۵ء میں شیخ تو واپس آ گئے تھے مگر لوگ مجروح ہو گئے تھے اور خود شیخ صاحب بھی سرکس کے پنجرے کے شیر بن گئے تھے۔ تاہم کبھی کبھی دھاڑتے تھے مگر نحیف آواز میں۔ اُدھر بھٹو کے قتل کے بعد ایران میں انقلاب آ گیا تھا جس کا اثر کشمیر پر پڑنا لازمی تھا۔ روس افغانستان سے نکل کر پارہ پارہ ہو گیا تھا اور افغانستان سے لیکر عراق تک ہی نہیں، دنیا کی کئی اور اہم جگہوں پر بھی سیاہ ترین بادل چھا گئے تھے۔ یہاں کشمیر کے نوجوانوں میں بھی مذہبی جنون کا شوق پیدا ہونے لگا تھا۔ نئی پود مایوس ہو گئی تھی اور بے زار۔ ان کے پاس سوائے بیکاری، انتشار اور افلاس کچھ نہیں رہا تھا۔ وہ ریاست کی حکومت کے ساتھ ساتھ مرکزی حکومت سے بہت ناراض ہو گئے تھے اور اکثر نالاں تھے۔ ریاستی

۱۔ کشمیر ظلم و جور اور انسانیت سوز مظالم کی ایک لمبی کہانی پیش کر رہا ہے۔ ڈوگرہ شاہی کے ستم اور دل دہلانے والی کہانیاں سر والٹر لارنس کیلئے چونکا دینے والی کہانیں ہیں۔ مگر ۱۹۵۳ء کے بعد کی کہانی کچھ کم نہیں۔ شیخ عبداللہ نے جن لوگوں کو بیدار کیا اور ڈوگرہ شاہی کے پنجے سے آزاد کیا۔ وہی اب ایسا ظلم کر رہے ہیں کہ سہنے کیلئے پتھر جیسا دل اور چیتے کا جگر چاہیے۔ انسان باور نہیں کرتا کہ یہ وادی پیرہ واری تھی۔ اس ظلم میں جو لوگ اپنے ہاتھ رنگتے ہیں وہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں اور اسلام کو بقدر ضرورت سپر کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

حکومت لگاتار پٹھو حکومت تھی۔ نہ اس کا معقول وجود تھا اور نہ کردار۔ جمہوریت کی پامالی کے سامان ہر طرف بکھرے نظر آرہے تھے۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا قانون عام تھا۔ صرف ایک الیکشن اصلی اور عوامی الیکشن ہوا تھا جس میں ۱۹۷۷ء میں شیخ محمد عبداللہ نے اپنی ہر دل عزیزی کا سکّہ بٹھایا تھا۔ اس الیکشن کا رمز (Refrain) ''یی کرہ تی کرہ ببِ کرِہ لولو'' (Shaikh, the Father of fathers is free to do whatever he may like) تھا۔ طرّہ کہ اس کا حقیقی نتیجہ بھی یہی نکلا۔ لوگوں کی صدا نقارۂ خدا ثابت ہوئی۔ امیروں نے ہندوستان کا سہارا لیا اور اُنہوں نے اپنے تحفّظ کا انتظام کرایا۔ مگر عام کشمیری پریشان ہوگئے۔ کشمیر کا مسئلہ از خود رفتگی کا مسئلہ بن گیا۔ اس کے لئے نفسیات کی زبان میں (alienation) کی اصطلاح بہت موزون ہے۔ جب نوجوان کھو گئے، جب ان کے سینے میں دل ہی نہ رہا، جب وہ گرمئ انا اور اعتماد کھو بیٹھے، جب اُن کا درد کسی نے محسوس ہی نہیں کیا، جب گھرانوں میں مالی بدحالی سے مسائل پیدا ہوگئے، جب بھانت بھانت کے فتنوں نے جنم لیا، جب مرد اور عورت ایک دوسرے کو کوسنے اور پیٹنے لگے، جب چولہوں کی جگہ پیٹ جلنے لگے، جب آس پاس تمدنی گھاؤں کے بغیر کچھ دکھائی نہ دیا، جب دل بہلائی اور فرحت وانبساط کے انسانی ذریعے اور طریقے خاک میں مل گئے، تب مذہبی جنوں پیدا ہوا کیونکہ اس جنوں کے پیدا کرنے کیلئے باضابطہ انتظامات کئے گئے تھے۔[1] ہوسکتا ہے کہ کشمیریوں کی درویشانہ سرشت اور صوفیانہ روش جنون زدہ مذہب کاروں نے بدلنا چاہی ہو، خاص کر انہوں نے جو ہندوستان سے باہر بھی باضابطہ طور پر ایک پروگرام کے تحت سرگرم عمل تھے۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ اکثر کشمیری جنونی مذہب کی زد میں نہ آئے اور نہ آنا چاہتے تھے۔ ان کے خون میں رواداری ہے اور صلح کُل۔ وہ وصل کے مزے لوٹنا چاہتے

۱۔ خواب سے بیدار ہوتا ہے کبھی محکوم اگر — پھر سُلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری
جادوئے محمود کی تاثیر سے چشمِ ایاز — دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری

ہیں، فصل کی خون خرابی اور فتنہ انگیزی کے کانٹے بونا نہیں چاہتے۔ میں بہت لوگوں سے ملا ہوں اور ان کی باتوں سے اخذ کر چکا ہوں کہ وہ کشمیری پنڈتوں کے چلے جانے سے ناراض ہیں، مجروح ہیں۔ وہ کشمیر کے مسئلے کو ہندو مسلم لڑائی کے آئینے میں دیکھنا نہیں چاہتے کیونکہ یہ لڑائی کشمیری دینداروں کیلئے غیر فطری ہے اور مصنوعی۔ وہ حق خود ارادیت چاہتے ہیں۔ اس حق کا اعتراف خود ہندوستان نے کیا تھا۔ اسی لئے ہندوستان کے ساتھ عارضی الحاق ہوا تھا۔ اگر شیخ عبداللہ کو گرفتار نہ کیا گیا ہوتا تو ہر طرح سے زندگی کو عروج ملا ہوا ہوتا۔ گاندھی جی کے ہندوستان نے ایسی زندگی بنانے میں ہاتھ بٹایا ہوتا اور کشمیریوں کا دل موہ لیا ہوتا۔ مگر کشمیر میں جمہوری قدروں کی پامالی ہوئی جس طرح پاکستان میں بھی ہوئی۔ لازماً حالات خراب ہوئے۔ جمہوری قدروں کی پامالی کا مسئلہ مسلمان ملکوں میں تقریباً ہر جگہ پیدا ہوا۔ اس سے دولت اونچے طبقے کے ہاتھوں میں جمع ہوئی اور وہ بھی بے رحم اور ناپاک طریقوں سے۔ عام لوگ تعمیری اور تخلیقی کاموں میں حصہ نہ لے سکے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ بے دل ہو گئے۔ پریشان ہو گئے اور اپنی ذات (جسے روح کہئے یا خودی) سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ان کے راستے حکمرانوں اور حکمرانوں کی ریاست نے کاٹ دئے اور وہ مجبور ہو کر مذہب فروشوں کی جھولی میں پڑ گئے۔ مذہب کا بیوپار کرنے والوں نے شرمناک عزائم اور اپنی حرص کو پورا کرنے کیلئے اسلام کی اصل صورت ہی بدل ڈالی[1]۔ تاہم اس وقت بھی کشمیر میں ایسے مذہبی لیڈر موجود ہیں جن کو اگر موقع دیا جائے تو وہ مذہب کا ناجائز استعمال کرنے والوں کا مقابلہ تعمیری اور تخلیقی رنگ میں کر سکتے ہیں۔ ایسے مذہبی لیڈروں میں لچک بھی ہے اور لوچ بھی۔ ان کی باتوں سے نہ مذہبی جنوں ٹپکتا ہے اور نہ خود ساختہ مذہب کی بالادستی۔

اب یہ سوال کہ شیخ صاحب نے جب دوسری دفعہ عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو

۱۔ اسلامی تاریخ میں مذہب فروشوں کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔ کربلا کا خونین ڈرامہ بھی انہی لوگوں نے کھیلا۔ اقبال نے خطبات اور شاعری میں ایسے لوگوں کا پردہ فاش کیا ہے۔

لوگوں کو کیا ملا، ان کی فلاح و بہبود اور معاشی حالت پر کیا مثبت اثر پڑا۔ انہوں نے ہمہ گیر ترقی کا کوئی پروگرام بنایا؟ کیا ان کی حکومت کنبہ پروری اور جماعت پسندی کا شکار نہ ہوئی؟ جماعت پسندی سے مراد نیشنل کانفرنس ہے جس کے کارکنوں کو رنگ رنگ سہولیات دی گئیں اور رعایتیں تا کہ ان کا وہ نقصان پورا ہو سکے جو ۱۹۵۳ء کے بعد اس جماعت نے اٹھایا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شیخ صاحب کی ۱۹۷۷ء میں زبردست عزت افزائی کی گئی۔ لوگوں نے باہر نکل کر اُنہیں ووٹ دیا اور شاندار عقیدت کا مظاہرہ کیا۔ اسی طرح جب وہ اس دُنیا سے رحلت فرما گئے تو اُنہیں عزت واحترام کے ساتھ الوداع کیا گیا۔ تاہم نیشنل کانفرنس کی کنبہ پروری اور اجارہ داری کا کیا کہنا؟ یقیناً وہ ماحول پیدا نہ ہوا جو ۵۳ء سے پہلے تھا۔ یقیناً اس بالادستی اور رشوت ستانی کو بھی بڑھاوا ملا جو ۵۳ء کے بعد کے حالات نے کشمیر میں پیدا کی تھی۔ مگر یقیناً اس کے لئے گورنمنٹ آف انڈیا اور ہندوستان کے وہ لیڈر بھی ذمہ دار ہیں جو حکومت سے باہر جمہوری ہندوستان کی قدروں کے ضامن ہیں۔ شیخ صاحب کی پبلک اور پرائیویٹ زندگی سے بھی دکھائی دیتا تھا کہ جو آگ ان کے سینے میں ایماں کے نور کی طرح روشن تھی، بجھ گئی تھی۔ بائیس سال کے بعد وہ مجلسی زندگی میں پھر گھس گئے تھے۔ بہت سوں کی زبانی میں نے سنا کہ انہوں نے اندرا گاندھی کے ساتھ جو ایکارڈ کیا تھا، وہ بنگلہ دیش کا نتیجہ تھا۔ پاکستان کی ریاست ناکارہ ہو چکی تھی۔ مگر مجھے پھر بھی یقین ہے کہ بخشی صاحب کی پالیسی اور اُس پالیسی کے نتیجے میں ایک طبقے کا پیدا ہونا اس حالت کا اصلی کارن تھا۔ اس حالت نے مذہبی جنون کو ہوا دی اور کشمیری عوام کے سامنے ایک خودغرض اور بے درد جماعت کھڑی کر دی جس کی وجہ سے کشمیر اچانک آگ کے شعلوں میں لپٹ گیا۔ یہ پالیسی ابھی تک چالو ہے۔ اس پالیسی نے یہاں بنیادی تعلیم کو قریب قریب نظرانداز کیا اور سکنڈری اور اعلیٰ تعلیم کی طرف زیادہ توجہ دے دی۔ اسی کی وجہ سے عام تعلیم یافتہ نوجوان، مرد و زن بیکار ہو گئے اور کنبہ پروری کو حیران کن سطح پر فروغ ملا۔ اسی پالیسی نے اشفاق مجید

وانی مرحوم کو چھوڑ دیا اور تھرڈ کلاس آدمیوں کو میڈیکل اور انجینئرنگ کالج پہنچایا۔ کیا کہا جائے؟ نقل سے سارٹیفکیٹ حاصل کرنے والے نقلی نیا کشمیر کے غنڈے اعلیٰ عہدوں پر پہنچ گئے اور نہ صرف سیاسی قدروں کو اپنی زبردست ناقص کارکردگی سے پاؤں تلے روندھا بلکہ یہاں کی انسانی اور روحانی روایات کو جڑ سے اُکھاڑ دیا۔ مجھے پریشانی کی حالت میں یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارا گھر بھی اس دباؤ سے نہ بچ سکا جو منصبوں اور منصوبوں کے ذریعے دولت پیدا کرنے والے امارت پرستوں نے ڈالنا سیکھا۔ ہم تو ہم، خود چیف منسٹر بھی اس دباؤ کی زد میں آ گئے۔ پبلک سروس کمیشن اور کمپی ٹنٹ اتھارٹی (Competent Authority) بھی اُس جماعت کو ٹال نہ سکی جو اپنے منظورِ نظر بچوں اور رشتہ داروں کو عہدوں پر بٹھانے کی ہر ممکن سعی کرتی رہی۔ اگر اس سے کام نہ چلا تو اپنے لاڈلوں کو قزاقستان، ماسکو یا کسی نہ کسی طرح عرب ممالک میں بھیجا جن ممالک سے یورپ اور امریکہ جانے کے دروازے کھلے ہیں۔ شیخ عبداللہ کے دوسری دفعہ آنے سے پہلے اور اس کے بعد اس جماعت نے اپنی بالادستی سے نوکریاں بانٹ دیں اور مختلف ٹیکنیکل شعبوں کیلئے امیدواروں کا انتخاب کیا۔ اس کے نتیجے میں یا تو انقلابی گروپ پیدا ہوا یا وہ جماعت جس نے آیت اللہ خمینی کے طریقہ کار کو خیر باد کہا اور افغانستان سے بندوقوں کو کسی نہ کسی طرح سرینگر پہنچا دیا جو روسیوں کے بھاگ جانے سے بے کار ہو گئی تھیں۔ امریکہ اور برطانیہ ادھر اُدھر سے فارغ ہو گئے تھے۔ کشمیری پہلی دفعہ بندوق اٹھا کر "چھین کر لیں گے آزادی" کہنے لگے اور زور زور سے! اب چھوڑ دیجئے کشمیریوں کا نادر موقعہ بندوق اٹھانے اور گولی داغنے کا، چھوڑ دیجئے کہ افغانستان میں سوویت روس ناکام ہو گیا اور اس کے نتیجے میں امپیریلزم (Imperialism) کی بندوق بے کار ہو گئی، پھر بھی نئے امپیریلزم کا پروگرام ہے کہ بندوق کا بول بالا ہو اور بندوق کی صنعت گھن گرج کے ساتھ خود بخود زندہ باد پکارے۔ بہت اچھا بازار ملے امپیریلزم کو بندوق بیچنے اور بھیجنے کا تو انسان خود ہاتھ پر ہاتھ دھر کر خاموش بیٹھے؟ ناممکن، قیامت بھی برپا

ہوتب بھی ناممکن! پنجابی ہمیں ''ہتو'' کہتے تھے اور بے حس وحرکت لوگ سمجھتے تھے۔ اب اُنہوں نے دیکھا کہ کشمیر میں آگ لگ گئی جو بجھائے نہ بجھے! مجھے یونیورسٹی کے ایک شاگرد پروفیسر جواب سوسیالوجی (Sociology) کے پروفیسر ہیں، نے بتایا کہ مشتاق احمد زرگر صاحب دودو ہاتھوں سے کلاشنکوف چلاتے ہیں۔

اب میں آپ کو دل کی بات بتاؤں؟ ہندو مسلم فساد دراصل طبقاتی فساد ہے۔ ہندوستان میں بمبئی، مدراس اور کلکتہ میں غیر مسلم لوگ پہلے میدان میں اُترے۔ مسلمانوں نے بعد میں جدید تعلیم حاصل کی۔ مکرجی، چٹرجی اور بنرجی جیسے لوگ سبقت حاصل کر چکے تھے۔ مسلمان بیچارے ابھی مغلوں کے زوال پر ماتم کر رہے تھے۔ مُلائیت اُنہیں روک رہی تھی۔ ''مغربی علوم سے اپنا دین کھومت ڈالو۔ انگریزی پڑھ کر بے دینوں کا طریقہ اختیار مت کرو''۔ ان کا مسلم آزار نعرہ تھا۔ ہندو آگے بڑھ رہے تھے۔ تعلیم میں، صنعت میں، حرفت میں، ملازمتوں میں۔ مسلمانوں میں صرف گنتی کے لوگ اس صف میں شامل تھے۔ مثلاً طیب جی، جسٹس محمود، محمد علی جناح اور یہاں کشمیر میں آغا سید حسین۔ عام مسلمان گہری نیند میں خرّاٹے بھر رہے تھے اور ''پدرم سلطان بود'' کے خواب دیکھ رہے تھے۔ اگر اُن میں کوئی جاگ بھی اُٹھا، وہ اپنے حریفوں کے مقابلے میں کچھ کر نہ سکا! سر فضل حسین جس نے تمام زمینداروں کو اکٹھا کیا تھا، بھی زیادہ سے زیادہ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور میں مسلمانوں کیلئے صرف چار نشستیں حاصل کرنے کے علاوہ کچھ اور نہ پا سکے تھے۔ مگر اس سے بھی ہندو اکابرین نے سر گنگا رام میڈیکل کالج لاہور کی بنیاد ڈالی تھی۔ پنجاب میں پچپن فی صد مسلمان رہتے تھے۔ ان کے لئے اسّی میں صرف پانچ کالج تھے۔ پچھتر کالج صرف ہندوؤں کیلئے تھے۔

ہندوستان تقسیم ہوا۔ ہندو مسلم بٹوارہ حقیقت بن گیا۔ اگر کوئی واحد ہاتھ اس کے

خلاف بلند ہوا تو وہی امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کا ہاتھ تھا۔ ہندو مسلم ایکتا کی شہادت بلکہ شہادتوں کی بھرمار برسرِ طاق رکھدی گئی۔ یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ شہادتوں کو یکسر رد کردیا گیا۔ پاکستان وجود میں آیا، غیر مسلم طریقے سے ہی سہی۔ مگر اس کا نام اسلامی مملکت پڑ گیا۔ بے شرم ہندتوا کی بازیابی کو مدد ملی وہ بھی گاندھی، نہرو اور آزاد کے دیس میں۔ اتنی بے رواور ڈھیٹ ہندتوا کہ معصوم لوگ سوچ بھی نہیں سکتے تھے اس بازیابی کے بارے میں۔ شرم کی بات ہے کہ اب کانگریس بھی اسے قبول کرچکی ہے۔ اس حد تک کہ اب چار شنکر اچاریہ سیاسی معاملات کے چار بنیادی ستون ہیں۔ ہندوستان کے سیاست کار اور اب نامور مصنفین گاندھی، نہرو اور پٹیل کی سراہنا کرتے ہیں مگر مولانا آزاد کا نام بھی زبان پر نہیں لاتے، رفیق احمد قدوائی اور ذاکر حسین صاحب تو درکنار۔ اس ماحول میں ہندوستان میں کون سی شہری فیلوشپ پیدا ہوسکتی ہے بجز اس کے کہ بھارتیہ ودیا بھون کی ہسٹری میں اکبر اعظم شاہنشاہ ہندوستان کو یا بہ زور یا بہ زار چودہ پندرہ صفحے ملیں۔ یہ تو ہندوستان کے حسن و جمال میں مسلمان کے حسن کار ہاتھ کو للی پُت بنانے کے مترادف ہے، وہ ہاتھ جس نے ہندوستان کو مزیّن کیا اور اسے مالا مال کرنے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوؤں اور بودھوں نے بھی ہندوستان کی عظمت میں گرانقدر کام کیا مگر مسلمان یقیناً کسی سے پیچھے نہ رہے۔ آج جب تاج محل کا ذکر چھڑتا ہے تو اسے ہندو مسلم یکتائیت کا کارنامہ قرار نہیں دیا جاتا۔ اسے محض ہندو فن تعمیر کا نام دیا جاتا ہے اور بس۔ حالانکہ یہ سراسر غلط ہے۔

ہندوستان کی روح کسی چیز سے اتنی گائیل نہیں ہوتی جتنی دولت جمع کرنے کی آزیا ہوس سے۔ یہ ہوس پارلی منٹ میں گاندھی جی کی تصویر کے بالکل آمنے سامنے ساور کر کی تصویر لگادیتی ہے اور اس طرح ہندوستان کے سپوتوں اور اولوالعزم لیڈروں کے متوالوں کے دلوں کو زخمی کردیتی ہے۔ یہی ہوس سونے چاندی، ہیرے جواہرات کے ڈھیر لگانے پر اُکساتی ہے اور زمینوں، جائیدادوں اور عہدوں کے حصول کیلئے ہر آدرش، ہر اصولِ حُبّ

انسانی کو پامال کردیتی ہے۔ اسی ہوس نے گوالیار، پونا، ناگپور اور جموں میں گاندھی جی کی ہتھیا پر رنگ رلیاں منائیں اور مٹھائیاں بانٹ دیں۔ آج یہی ہوس انسانوں کو ہزاروں کی تعداد میں، اپنے ہی گھروں میں چتا پر چڑھاتی ہے اور اس طرح انسانی بستی کو جس کا نام بھارت دیس ہے، درندوں کی بستی میں تبدیل کرتی ہے۔ یہی ہوس مجرموں کے ہاتھوں میں عنانِ حکومت دیتی ہے اور نت نئے سوانگ رچا رچا کر مستقبل کو تاریکیوں کے حوالے کردیتی ہے۔ اس ہوس نے خوفناک آگ کی صورت اختیار کی ہے اور اب عالمیت (globalization) کی آڑ میں دنیا کی فنا کا انتظام کررہی ہے۔ یہی ہوس ہندوستان کی شاندار روایات اور تقدس کی بے حرمتی کرتے ہوئے اپنا منہ کالا کررہی ہے۔ چالیس پچالیس سال پہلے میں نے ایک انگریز مصنف کی کتاب پڑھی جس کا نام سی، ایم، جوڈ (CM Joad) ہے۔ اس کتاب کا عنوان غالباً Governing classes of England تھا یعنی انگلستان کے ناخواندہ حکمران طبقے۔ اس میں اخلاق پر بحث ہے جو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کرتی ہے۔ دلّی جایئے، حالات کا مشاہدہ کیجئے، آپ کہیں گے کہ جُوڑ دلّی کے امراء کی باتیں کررہے ہیں۔ بڑے ہوٹل اور اس سے بھی بڑے، تیز رفتار موٹریں اور اس سے بھی برق رفتار موٹریں، گرم حمام اور اس سے بھی گرم (زندگی کے سامان ہیں)۔ موٹے سے موٹے مگر ناشائستہ مرد گالف کھیلتے ہیں۔ موٹی سے موٹی مگر ناشائستہ عورتیں کتّوں کو گود میں لئے پھرتی ہیں۔ کاک ٹیل انڈیل دئے جاتے ہیں اور تہذیب پروان چڑھتی ہے۔ عصمت لوٹنے اور لٹانے پر آمادہ کرنے والے نوکدار خط* اور حواس پر قبضہ کرنے والا ننگا پن، بے علم اور ناشائستہ لوگوں کی قدریں ہیں جو انگلستان پر حکومت کرتے

* یہ خط اس لئے نوکدار ہیں کہ انسانی حواس پر تیروں کی طرح چُبھتے ہیں۔ مصوّر اور فوٹو کھینچنے والے جسم کے خاص خاص حصوں کو ان ہی خطوں کے ذریعے اُبھارتے ہیں۔

ہیں۔"[1] اگر ہم امیروں کی اولاد کا مشاہدہ کریں گے اور واضح کریں گے کہ بڑے بڑے شاندار ہوٹلوں اور ریستورانوں میں کس طرح پیسہ لٹاتے ہیں تو ہمیں دنیا کے غریبوں، مفلسوں، بے کاروں، ناداروں، بھوکوں، پیاسوں، سماجی بندھنوں میں جکڑے ہوئے لوگوں کی بے بس زندگی کی اصلی وجوہات سمجھ میں آئیں گی۔ یہی لوگ جب بی، ایم، ڈبلیوز اور مرسڈیز گاڑیوں میں برق رفتاری سے گھر واپس آتے ہیں تو حادثوں کی اصلیت سمجھ میں آتی ہے۔ مگر سڑکوں کے حادثے معمولی قسم کے حادثے ہیں۔ غیر معمولی حادثے اُس تہذیب کو پال رہے ہیں جس سے گھر گھر میں ماتم ہے اور انسانیت دم گزارنے کیلئے سسکیاں لے رہی ہے۔ ہمارا جسم ہی نہیں، ہماری روح بھی بیمار ہوگئی ہے۔ اس بیماری جسم وجان کی تشخیص کیلئے ایم، آر، آئی کیا کرے، صحت کیسے لوٹ آئے اور آرام جان کیسے میسر ہو۔ قتل، خودکشی، طلاق، بے رحمی امریکہ سے یورپ اور یورپ سے ساری دنیا میں پھیل رہی ہے۔ اس کا سیدھا ربط ہے دولت کے ساتھ جو صرف چند لوگوں کے ہاتھوں میں جمع ہوگئی ہے اور ہو رہی ہے۔ غربت اور افلاس نچلے درجے کے لوگوں کو منہ کھولے چبا رہا ہے۔ خود امریکہ میں ان غریب عوام سے ٹیکس وصول کیا جا رہا ہے اور امیر لوگوں کو اس ٹیکس سے زیادہ سے زیادہ فائدے مل رہے ہیں اور پیسے بھی۔ پچھلے دس سال سے وہ امیر لوگ کھرب پتی بن گئے ہیں مگر عوام کا افلاس بڑھ رہا ہے کیونکہ ۴۶ کھرب پتی امریکہ کی پچاس فیصد دولت ہڑپ کر رہے ہیں۔ اس سے پولیس فورس میں حیرت ناک اضافہ ہوا ہے۔ خود ریاست بقول کارل مارکس ایک ایجنٹ ہے جس سے اوپری طبقے کے لوگ لا اینڈ آرڈر قائم رکھتے

1. Large hotels and even larger hotels, fast cars and even faster cars, hot baths and even hotter baths, golf played by even fatter and more vulgar men, lap dogs kept by even fatter and more vulgar women, cocktails and culture, vuluptuous nudity and seductive curves- such are the values of the illiterate governing classes of England.

ہیں۔ وہ اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ جو دولت حرام خوری سے جمع ہوئی ہو، اس کا نقصان نہ ہو۔ اس صورت حال کا منحوس ترین روپ، اگر کشمیر میں نہیں دیکھا جا سکتا تو کہاں؟ کل ہی ایک ہٹا کٹا نوجوان بہت تیز یمہا (Yamaha) موٹر سائیکل پر دوڑ رہا تھا مگر چلا چلا کر کوس رہا تھا مجھے کہ میں آہستہ آہستہ موٹر کیوں چلا رہا ہوں۔ خدا رحم کرے پیدل چلنے والوں پر جن میں مرد، عورتیں اور بچے، بوڑھے شامل ہیں۔ موٹر چلانے والے غیر مہذب اور ناشائستہ لوگ نشے میں چور نہ اِدھر دیکھتے ہیں اور نہ اُدھر۔ البتہ کبھی کبھی اسلام زندہ باد کا نعرہ دیتے ہیں مگر بیچ بیچ میں عربی میں گالیاں دیتے ہیں۔ نیلی نیلی وردیاں پہنے ہوئے پولس والے لاحول ولاقوۃ سے جواب تو دیتے ہیں مگر ٹریفک قوانین کا احترام کرتے ہوئے بیٹ (Beat) پر ہی کھڑے رہتے ہیں!

ملٹری جی..... جے ہند

۱۹۴۵ء کا زمانہ تھا۔ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد انڈین نیشنل کانگریس کے صدر تھے۔ ان کی شریک حیات کا انتقال ہوا تھا۔ مولانا جیل میں تھے اس لئے اپنی بیگم کی تجہیز و تکفین میں حصہ نہیں لے سکے تھے۔ اُن کی صحت خراب ہوگئی تھی اور اُن کا وزن ۴۵ پونڈ گر گیا تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو چاہتے تھے کہ مولانا کشمیر جائیں اور وہاں ہاؤس بوٹ اور گلمرگ میں ٹھہریں تا کہ اُن کی صحت بہتر ہو سکے۔ اُن کی مشہور و معروف کتاب غبارِ خاطر میں اس کا ذکر ہے۔ گلمرگ میں اُنہوں نے قیاس کیا تھا کہ باہر برف ہو رہی ہے اس لئے اُنہوں نے کمرے کے اندر بیٹھ کر پردے گرا کر آتش داں روشن کیا تھا۔ اُنہیں سردی یا سردی کا موسم پسند تھا اور وہ سردیوں میں آتش دان جلا کر آگ کے شعلوں اور انگاروں سے اپنی اندرونی دنیا کو ملاتے تھے اور نہ جانے کیا کیا سوچتے تھے۔ بہر حال پنڈت نند لال کترو ایک فہیم اور ذکی الذہن کشمیری پنڈت تھے۔ ذاکر حسین صاحب کے ساتھ اُن کے خاصے اچھے تعلقات تھے اور وہ ان تعلقات کی آبیاری بھی کرتے تھے۔ کترو صاحب کے ساتھ ان کے دو اور ساتھی بھی مولانا سے ملنے گئے۔ ۱۹۶۰ء میں جب میں فُل برائٹ پر امریکہ جا رہا تھا، کترو صاحب نے مجھے ازراہِ نوازش کھانے پر بلایا۔ میرے ساتھ میری گھر والی بھی تھی۔ باتوں باتوں میں انہوں نے ایک نہایت ہی اہم اور ان مٹ بات کہی جس کا ایک ایک لفظ مجھے ابھی بھی یاد ہے۔ کہا کہ ایک دن ''میں اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ مولانا آزاد سے ملنے

گیا۔ مولانا نسیم باغ کے ہوس بوٹ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اُس وقت مولانا آرام کررہے تھے۔ ہمیں کہا گیا کہ مولانا آرام کررہے ہیں اس لئے مل نہیں سکتے۔ مگر نہ جانے مولانا نے کیسے دیکھا اور کہا 'بہت دور سے آئے ہوں گے، بلالو'۔ ہم اندر چلے گئے تو مولانا نے ہم سے کہا۔ 'یہ جو شیخ صاحب نے تحریک چلائی ہے۔ آپ لوگ اس سے خائف تو نہیں'۔ میں نے کہا نہیں صاحب۔ مولانا نے پھر کہا۔ 'ہوسکتا ہے مگر میرا آپ کو مشورہ ہے کہ آپ اپنی تمام تر قوتوں کو یہاں کے عوام کو اُبھارنے میں صرف کریں اور ان کے ساتھ خود ابھریں'۔ بعد میں جب میں پھر حکومت جموں وکشمیر میں کام کررہا تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ مولانا کا احساس اُس زبردست تناؤ سے ابھر آیا ہے جو جمے ہوئے کشمیری پنڈت کے طبقے اور درمیانی طبقے کے مسلمانوں کے درمیان پیدا ہوا تھا۔ مسلمانوں کا درمیانی طبقہ شیخ عبداللہ کی تحریک آزادی سے پیدا تو ہوا تھا مگر چکداری کے خاتمے، شیخ صاحب کے تعلیم پر زور نے اس میں توانائی بخشی تھی۔ بعد میں بخشی غلام محمد کی عوام دوست پالیسی سے یہ طبقہ بہت آگے بڑھ گیا تھا۔ اس عوام دوست پالیسی میں پنڈت جواہر لال نہرو کی حکومت کا خاصا رول تھا جو ہندوستان بھر میں جمہوریت سیکولرازم اور سوشلزم کی جڑیں مضبوط کررہا تھا۔ اس کے علاوہ بخشی غلام محمد کے ہاتھ مضبوط کرنے کیلئے یہاں کے عوام کو اُبھارنا بہت ضروری تھا۔ اس کے بغیر سماج واد اور جمہوری قدروں کو بڑھاوا نہیں مل سکتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شیخ صاحب کی ۵۳ء سے پہلی حکومت میں کم کم اور بخشی صاحب کی حکومت میں مقابلتاً زیادہ زیادہ قابلیت نظر انداز کی گئی تھی مگر جمہوریت کیلئے اُبھرتے ہوئے نئے نئے لوگوں کیلئے ایسا کرنا ناگزیر تھا۔ سماج کے بچھڑے ہوئے طبقوں کیلئے اس وقت بھی ہندوستان بھر میں ملازمتوں میں، تکنیکی تعلیمی اداروں میں اور اعلیٰ تعلیم میں کافی گنجائش رکھی گئی ہے تاکہ تعلیم وتربیت کے ذریعے ان طبقوں کو آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع دئے جائیں اور سرکاری ملازمتوں کے ذریعے بھی پھلنے پھولنے کی رعایتیں دی جائیں۔ لہٰذا پڑھے لکھے اور

تہذیبی وتمدنی طور پر ترقی یافتہ خوش حال پنڈتوں کی عقل وفہم سے توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ زمانے کی روش سمجھیں اور اپنے کمزور کشمیری بھائیوں بہنوں کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملا کے چلیں۔ مگر بدقسمتی سے ایسا نہ ہو پایا بلکہ پنڈتوں نے نئے پیدا شدہ حالات کو سرے سے نظر انداز کرنے کی کوشش کی اور رجعت پسندانہ، مغرورانہ رویّہ اختیار کیا۔

۱۹۴۷ء کا ایک واقعہ دہرا ہیں تو معاملہ سمجھنے میں مدد ملے گی۔ ایک دن میں حبیب اللہ صاحب وڈیرہ کے ساتھ لال چوک میں کھڑا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ ہندوستانی فوج اور فوجی افسر پہلی بار بکتر بند گاڑیوں میں گزر رہے ہیں۔ اس سے پہلے دن تک شیخ محمد عبداللہ نے فوج اور پولیس کے بغیر اقلیتوں کو اتنا تحفظ دیا تھا کہ ایک بھی حادثہ پیش نہیں آیا تھا۔ یہ شمالی ہندوستان میں شیخ صاحب کا اَن مٹ کارنامہ ہے۔ ان دس دنوں میں اقلیتوں نے شیر کشمیر کو آسمان پر چڑھایا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ پنڈتوں کے ایک جلسے میں، جس میں مردوں اور عورتوں نے حصہ لے لیا تھا، شیخ صاحب پر پھول نچھاور کردئے گئے تھے اور اُن کو لارڈ کرشنا کہا گیا تھا۔ مگر جس دن لال چوک سے فوج گزر رہی تھی، کشمیر میڈیکیٹ کی اوپری منزل میں ورنڈے پر کشمیری پنڈتوں کا ایک گروپ کھڑا تھا۔ اُنہوں نے فوج دیکھ کر نعرے لگائے ''جے ہند، مہاتما گاندھی کی جے، پنڈت نہرو کی جے''۔ کشمیر کے دوسرے لیڈر تو درکنار، خود شیر کشمیر (لارڈ کرشنا بقول کشمیری پنڈت) بھی اُن کی زبان پر نہ چڑھا۔ یہ نعرہ بازی اُس احساس کی علامت بن کر سامنے آئی جو کشمیری پنڈتوں نے حقیقتاً دل میں چھپائے رکھا تھا۔ اس نعرہ بازی سے حبیب اللہ وڈیرہ مرحوم کا احساس زخمی ہوگیا اور اُس نے اپنی جذباتی جراحت سے کشمیری پنڈتوں کو صلواتیں سنائیں۔ حبیب اللہ وڈیرہ تحریک حریت کشمیر کا جزو تھا۔ اس نے بھی دوسرے لوگوں کی طرح اس بات کا خیال رکھا تھا کہ اقلیتوں کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ پس کشمیر کے دل کے شیشے میں شگاف پڑ گیا۔ اسی کشمیر کے دل میں جس نے وسیع القلبی کا ثبوت دیا تھا، مذہبی طرزِ فکر سے کام نہ لیتے ہوئے اپنے

آپ کو بھارت کے ساتھ راضی برضا جوڑ دیا تھا۔ کشمیر میڈیکیٹ سنڈیکیٹ (Syndicate) بن گیا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا، سنڈیکیٹ کی کارروائی بڑھتی گئی یہاں تک کہ ۱۹۵۳ء میں ''چھٹے ایمان'' شیخ عبداللہ کو گلمرگ سے سیدھے جیل میں ڈال دیا گیا۔ نیا کشمیر برسرِ طاق رہا اور کشمیر آگ کی بھٹی میں تبدیل ہو گیا۔

ایک اور داستانِ رنج و غم جو پرورشِ لوح و قلم کرتی رہے گی۔ ۱۹۵۳ء میں ہم پنڈت دُرگا پرشاد کے ساتھ چشمہ شاہی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ حالات بدل چکے تھے۔ کشمیریوں کے اوپر ایک ایسا وقت نازل ہوا تھا جو اہلِ دل اور اہلِ خرد کو اپنی سرنوشت سنا رہا تھا۔ ڈی پی کے ساتھ کچھ مسلمان افسر بیٹھے ہوئے تھے جو سب کے سب افسردہ خاطر تھے، اُداس تھے۔ وہ ہی کیوں؟ میں بھی گم سم بیٹھا ہوا تھا۔ ہم پر بجلی گری تھی۔ ڈی پی بڑا ذہین پنڈت تھا اور مجلس آرا۔ مجلس کی نوعیت سمجھ گیا۔ اُسے لوگوں کو اپنی طرف کھینچنے کی زبردست صلاحیت تھی۔ اس نے ہماری نفسیات جانچ لی اور خوش طبعی کیلئے ایک کہانی سنائی جو کشمیری پنڈتوں کے دل کی حالت کی خوب خوب تشریح کر رہی ہے۔ یہ کہانی کے بجائے خود ایک طنز ہے جس کی شدت وقت کے ساتھ ساتھ ظاہر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ در صاحب نے فرمایا کہ جب ۱۹۴۷ء میں ہندوستانی فوج کشمیر میں داخل ہوئی تو ایک فوجی حبہ کدل کے اوپر نمودار ہوا، گشت کرنے لگا۔ ایک کشمیری پنڈت نے اُسے ذرا دور سے دیکھا اور چاہا کہ فوجی کو چائے پلائے۔ مگر پنڈت کو معلوم نہیں تھا کہ اُسے کس طرح پکارے۔ فوجی سے ڈر کر اس کی زبان سے چیخ سی آواز نکلی۔ ''ملٹری جی!'' ڈی پی در صاحب ہمیں محظوظ کرانا چاہتے تھے مگر ''ملٹری جی'' اُسکے دل میں بحوالہ گرفتاری شیر کشمیر نہ جانے کیا کیا کرتب دکھا رہا تھا۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ ''ملٹری جی'' کا ڈرامہ کشمیر میں کتنے کھیل کھیلے گا۔ آج اس ڈرامے کا کلائمکس چل رہا ہے اور حبہ کدل کا کشمیری پنڈت جس کے منہ سے ملٹری جی بے ساختہ نکلا تھا، بانہال پار کہیں دور فضاؤں میں جسمانی طور پر نہ سہی، آتما کے روپ میں یہ سارا کلائمکس

دیکھ رہا ہوگا۔ اس کی آتما سے آج کون سی آوازیں نکل رہی ہوں گی، مجھے معلوم نہیں۔

کشمیر کا ہر ایک مسلمان جانتا ہے کہ کشمیری پنڈت سرکاری اہلکاروں اور کارندوں نے ان کے اوپر کس کس طرح کے مظالم ڈھائے۔ اس پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ ان مظالم میں محکمہ مال میں کام کرنے والوں، خاص کر پٹواری کا رول قابل ذکر ہے۔ اس کے ہاتھ سب سے زیادہ میلے تھے مگر اس کے ساتھ پنڈت پولیس والے ملے ہوتے تھے جو لوگوں کا خون طفیلیوں کی طرح چوستے تھے۔[1] میرے پاس اس کا انوکھا ثبوت ہے۔ یہ کہانی آنجہانی روپ کرشن مرزا کے سسر کے بھائی نے اسے سنائی تھی اور اس نے مجھے۔ رُوپ کرشن کے سسر کے برادر پولیس میں کام کر رہے تھے۔ کہانی کا مدعا یہ بتانا تھا کہ کشمیری پنڈت کیا کیا طریقے استعمال کرتے تھے تاکہ پیسہ کمایا جا سکے۔ اگر کسی گاؤں میں گائے چرائی جاتی تھی تو پولیس سٹیشن میں رپورٹ پہنچتے ہی آس پاس کے پانچ چھ دیہات میں تفتیش شروع ہو جاتی تھی کہ گائے کس نے چرائی اور کہاں سے۔ اس دوران لوگوں کا قافیہ اتنا تنگ کیا جاتا تھا کہ وہ اِدھر اُدھر سے پیسہ حاصل کر کے پولیس والوں کو دیتے تھے اور اپنی گردنیں چھڑاتے تھے۔ دوسری کہانی بھی روپ کرشن مرزا نے سنائی مگر اس کا راوی اس کا بڑا بھائی ہے، پنڈت رادھا کرشن مرزا۔ وہ بڑے تاجر تھے۔ ان کی زمین مجہ گنڈ (سوناواری) میں ہماری زمین کے ساتھ تھی۔ اُس میں مکّی کاشت کرائی جاتی تھی۔ رادھا کرشن نے اپنے چوکیدار کو دو بھٹے کھاتے ہوئے دیکھا تھا۔ قیامت برپا ہو گئی تھی۔ مرزا صاحب سیخ پا ہو گئے تھے اور چوکیدار پر برس پڑے تھے۔ ''تم نے میری جائیداد چُرائی ہے۔ تم نے چوری کی ہے، مال لوٹ لیا ہے۔'' بھٹے کھانے سے بے چارا چوکیدار چور اور لُٹیرا بن گیا تھا اور اس لئے غصّے کا شکار۔ رات دن مرزا صاحب کا کام کر رہا تھا۔ باد و باراں اور چلچلاتی دھوپ کی پروا کئے

۱۔ اب تو خون چوسنے کا کام مسلمان عمّال نے اپنے ہاتھ میں لیا ہے جو نیا کشمیر کے تن بدن پر ایسے گھاؤ لگا رہے ہیں کہ انسانیت حیرت سے انگشت بدنداں ہے۔

بغیر۔ مگر مرزا صاحب کے کھیت کے دو بھٹے بھی نہیں کھا سکتا تھا۔

مجھے کشمیری پنڈتوں کے ساتھ کافی لگاؤ ہے اور ان کے ساتھ دل لگی ہے۔ مجھے پروفیسر محمد حبیب کے ساتھ اتفاق ہے کہ کشمیر نے پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ بڑے قابل اور ہونہار کارکن پیدا کئے ہیں جو ایک دوسرے پر تکیہ نہیں لگاتے ہیں اور ذاتی قابلیت کی بناء پر کھڑے رہتے ہیں، تعلیم، صحت، تعمیر و ترقی اور زندگی کے دوسرے شعبوں پر پھیلے ہوئے ہیں۔ مگر حکمران لوگوں نے یہاں کی اکثریت کے نفسیاتی اور روحانی وجود کو اتنا گائل کر دیا ہے کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ اگر آپ اس معاملے میں ذرا کھوج لگائیں گے، آپ کو نظر آئے گا کہ قریباً سارے مسلمان ناخواندہ ہیں، کاشتکار ہیں، پامال ہیں، دیہاتی ہیں، نان گار ہیں، ملازم نہیں ہیں، حکومت میں کام نہیں کرتے ہیں۔ سرکاری مشینری ان بے یارومددگار مسلمانوں کو دو دو ہاتھوں سے لُوٹ رہی ہے۔ اس میں پٹواری، پولیس والے، تھانے دار، جمع دار، منشی، محرّر مال، عدالت میں کام کرنے والے عرضی نویس، وکیل، تحصیلدار اور دیہات میں کام کرنے والے ان کے کارندے سب شامل ہیں جو مسلمان نادار پر پل رہے ہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ ہندوستان میں جاگیردارانہ نظام میں کسانوں اور مزدوروں پر کیا گزرتی تھی، مگر منشی پریم چند، کرشن چندر اور ایسے ہی ترقی پسند ادیبوں کی کہانیاں دل دہلانے والی داستانیں سنا رہی ہیں جو کشمیری مسلمانوں کی بے یارومددگار زندگی پر بھی دلالت کرتی ہیں۔ سرراہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ۱۹۸۹ء میں جس آگ نے کشمیر کو آناً فاناً اپنی لپیٹ میں لے لیا، اس کی دو بنیادی وجہیں ہیں: ایک کشمیریوں کا نفسیاتی وجود جو سالہا سال سے ظلم و جور کا شکار ہوتا رہا اور جس میں کبھی بدلاؤ نہ آسکا۔ کبھی اگر اس بدقسمت قوم نے جاگنے کی کوشش بھی کی تو ظالموں اور بے روح حاکموں نے اُنہیں کسی نہ کسی طریقے سے پھر سُلانے کی کوشش کی۔ دو، افسر شاہی نے ہمیشہ اپنا گھر اپنے بچے کی تھاپ پر حکومت کرنے کی کوشش کی۔ کنبہ پروری کا بول بالا رہا۔ قابل ترین مسلمانوں کو

آگے بڑھنے کی کوئی صورت نظر نہیں آئی۔ بیرونِ ریاست کام کرنا ان کے لئے ممکن نہ ہوسکا، خاص کر سرکاری ملازمتوں میں۔

انگلستان میں صنعتی انقلاب کے بعد دھیرے دھیرے چناؤ کا حق بڑھتا گیا اور بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں عورتیں حق رائے دہی میں شامل ہوگئیں۔ یہاں کشمیر میں ۱۹۴۷ء کے بعد سلہ، گلہ، اوحد اور مہود بل کاک در جیسے ڈی، پی، در کے سامنے کھڑے ہوگئے۔ پڑھائی کم، لکھائی کم، تجربہ کم مگر "بیعنامہ امرتسر کو توڑ دو، کشمیر کو چھوڑ دو" میں ایسا اُبال آیا کہ اُن لوگوں کو سب کچھ چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا جو یہاں حکومت کرتے تھے۔ اچانک سیلاب آیا اور بہت سوں کو بے گھر کر دیا۔ کشمیری پنڈت بیچارے بخشی غلام محمد کی حکومت میں دھیرے دھیرے پٹ گئے تھے۔ ان کی اہلیت، اُن کی قابلیت اور ان کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی ملازمت پر منفی اثرات پڑ گئے مگر انہیں گھر بار چھوڑنا پڑا اور وہ ہندوستان کے طول وعرض میں پھیل گئے۔ کچھ تو ہندوستان سے باہر بھی چلے گئے اور دنیا کی بہت جگہوں پر اپنا نام پیدا کر گئے۔ ان کے ساتھ "ملٹری جی" تھی، قابلیت تھی، قابلیت کیلئے ضروری لوازمات تھے، وہ اس طرح پھلتے نہیں، پھولتے نہیں تو اور کون؟ میں نے جناح کی سیاست کبھی پسند نہیں کی مگر اس کی باتوں میں ایک خاص نکتہ تھا۔ پنڈت نہرو نے اس کی نکتہ چینی کی تھی کہ جناح انڈین نیشنل کانگریس میں دسویں پاس لوگوں کو ممبر بنانا چاہتا ہے۔ مگر جناح تازہ ہوا لیکر آیا تھا۔ لوگ اس کے گرویدہ ہوگئے تھے۔ وہ اُن کا قائداعظم بن گیا تھا۔ عوامی حکومت، جمہوریت جب اپنے پر پھیلاتی ہے تو ایک رادھا کرشنن کے ساتھ سینکڑوں کامراج کھڑا کر دیتی ہے اور عام خام کو خوب ہوا دیتی ہے۔ یہاں کشمیر میں بھی ہندوستان کی نو اور ریاستوں کی طرح صرف قابل اور تجربہ کار لوگ ہی سامنے نہیں آئے بلکہ ان کے ساتھ ساتھ دس گنا نہیں، کئی گنا وہ لوگ بھی سامنے آئے جن کی وجہ سے غلام السیدین بھی

بخشی صاحب سے خفا ہوکر نوکری چھوڑ کر کشمیر سے رخصت ہوگئے۔[1] مگر اس قسم کی تقرّریوں سے کشمیر کا تعلیمی نظام بگڑ گیا۔ کالجوں میں لوگ تشدّد پر اُتر آئے اور اعتماد کے نام پر بھونڈے پن اور وحشیت کا مظاہرہ کرنے لگے۔ کشمیر میں جمہوریت دو دھاری تلوار بن گئی۔ اس کی اتنی پیش رفت ہوئی کہ غنّی لوگ پیدا ہوگئے۔ مگر اس کے ساتھ مولانا آزاد کی نصیحت ضائع ہوگئی۔ نہ کشمیری پنڈتوں نے یہاں کے مفلس عوام اور نئے اُبھرتے ہوئے طبقے کو صحیح رنگ میں اُبھارنے کیلئے دستگیری کی اور نہ وہ خود بھی اس عمل کے ذریعے اُبھر سکے، آگے بڑھ سکے۔ کشمیری مسلمانوں نے اپنی آنکھوں سے ڈاک خانوں میں، بنکوں میں اور دیگر مرکزی حکومت کے دفتروں میں کشمیری پنڈتوں کو پھلتے پھولتے اور ملازمتیں حاصل کرتے دیکھا۔ یہ بھی کہ ان کے لئے ان دفتروں کے دروازے بند کئے گئے ہیں۔[2] شیر کشمیر کی گرفتاری نے ایک زبردست المیہ کھڑا کردیا۔ جگہ جگہ سکول کھلے حالانکہ تعلیم عام کرنے کیلئے ابھی کوئی تیاری نہیں ہوئی تھی۔ ہندوستان کی نو ریاستوں میں بھی دیگر وجوہات کی بناء پر ایسا ہی جال پھیلا تھا۔ اس لئے ان میں بدنظمی پیدا ہوگئی۔ مگر ان ریاستوں میں تعلیم پر زیادہ پیسہ خرچ کیا گیا جس سے عام تعلیم زیادہ ہوگئی اور بارآور ثابت ہوئی۔ کشمیر میں ہائی اسکول کھلے اور ان میں نیم حکیم تعلیم یافتہ طبقہ پیدا ہوا۔ وہ بیکار ہوگیا اس لئے کہ کشمیر میں ملازمتوں کا زیادہ موثر انتظام نہ ہوسکا کیونکہ سارا بوجھ نوکریوں پر تھا۔

۱۔ میں امریکہ میں تھا۔ پروفیسر سیدین کو پھر سے کشمیر ایجوکیشن کا ایڈوائزر مقرر کردیا گیا تھا۔ ایک دفعہ بیس کے قریب لیکچرار اور پروفیسر متعین کرنے تھے۔ سیدین صاحب نے آٹھ دس کشمیری پنڈت بھی متعین کئے۔ بخشی صاحب نے سیدین صاحب کے انتخاب پر اعتراض کیا۔

It does not add to my pride as a Musalman to take a 3rd divisioner Muslim when the Ist divisioner is available.

۲۔ اس کا ثبوت خود اس کتاب میں کہیں اور دیا گیا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور یہاں کے ایک چیف سیکریٹری جناب موسیٰ رضا نے بھی اس سلسلے میں مرکز کو جھنجھوڑا تھا مگر فضول۔

یہاں نہ صنعتی اعتبار سے ترقی ہوئی اور نہ تعلیم کو چھوٹی صنعتوں کے ساتھ مربوط کیا گیا۔ افسر شاہی اور سیاست گری نے اس صورت حال کو اور پیچیدہ بنایا۔ اس لئے لوگوں نے جہالت کی وجہ سے غلط راستے اختیار کئے۔ کشمیری پنڈتوں اور مسلمانوں کے درمیان دو قومی نظریہ پیدا ہونے لگا۔ کشمیری پنڈت اپنی سبھاؤں اور اپنے جتھوں میں کہنے لگے کہ جن لوگوں نے ان کی زمینیں چھین لیں انہیں وہ لکھائیں، پڑھائیں اور اپنے ساتھ ساتھ کام کرائیں؟ وہ کشمیر کی نامناسب سیاسی حالت کا دور سے تماشہ دیکھنے لگے۔ کچھ لوگ تو اندر سے مرکز کے ساتھ مل کر یہاں کے کٹھ پتلی چیف منسٹروں کی مدد کرنے لگے۔ کچھ لوگوں نے وقت وقت پر سیاسی ڈرامہ بنانے اور اسے سٹیج کرنے میں خاص دستگیری کی۔ دوسری طرف افسر شاہی، کاروباری لوگ اور زندہ باد کرنے والے لوگ اکٹھے مل گئے اور اپنی کرتوت سے پچاس سال کے عرصے میں ایک ایسا تمدن پیدا کیا جس کے گھاؤ دور سے ہنستے دکھائی دیتے ہیں[1] اور جسنے کشمیر کو جہنم میں تبدیل کیا ہے۔ کشمیر کا وہ تمدن چلا گیا جو صدیوں کی پیداوار تھا، جس میں

۱۔ مجھے جموں میں ایک سینئر پولیس آفیسر نے بتایا کہ اس کی بیٹی شام کے بعد جموں کے راستوں پر چل نہیں سکتی جس طرح وہ سرینگر کے گلی کوچوں سے بلا عذر اور بلا خوف وخطر چل سکتی تھی۔ یہ پولیس آفیسر اچھے خاصے گھرانے کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اور اس کا باپ ایک مشہور سول سرونٹ تھا۔ ان کا گھر گپکار روڈ پر واقع ہے۔ اس کا تعلق وزیر خاندان سے ہے اور یہ کشمیری پنڈتوں کا اچھا خاصا خاندان تصور کیا جاتا تھا۔ مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ شاہد وزیر خاندان کی ایک لڑکی کو بہت چاہتا تھا۔ اُن دنوں وہ سکول میں پڑھتی تھی اور اب شاید ہالینڈ میں ہے۔ مجھے اس ضمن میں آں جہانی پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہر لال نہرو اور خود مہاتما گاندھی یاد آتے ہیں۔ وجے لکشمی کے زمانے سے ہی اُنہوں نے ہندو عورت کو غیر ہندو کے ساتھ شادی کرنے کی اجازت نہ دی۔ کیا اس قسم کی شادیوں سے ہندو مسلم رشتے پکے نہیں ہو جاتے۔ کیا سماج کے اوپری طبقے میں ایسے رشتوں سے ہندوستانی سماج کا مہلک ترین مسئلہ شاندار طریقے سے حل نہیں ہوتا۔ یہ رَواب بڑے بڑے شہروں میں پھیل رہی ہے۔ کشمیر میں ڈاکٹر سید نصیر احمد شاہ کی شادی ڈاکٹر گرجا در سے ہوئی ہے۔ دونوں بڑے خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ میرا نظریہ رومانوی نظریہ ہے مگر رومان سے ایسے مسائل حل ہوتے ہیں جو نہ سائنسی طریقۂ کار اور نہ روایاتی بندھنوں سے حل ہوتے ہیں۔

برہمنوں، بودھوں، مسلمانوں نے اپنا اپنا حصہ لگادیا تھا، جس میں درویشوں، فقیروں، ریشیوں، مُنیوں نے مذہبی تعصب سے بالاتر ہوکر انسان نوازی اور انسان سازی کی بہترین روایات قائم کی تھیں۔ یہ تمدن اپنی رنگارنگی اور اپنی گہرائی و گیرائی کی وجہ سے قابل رشک تھا اور ریاست کے باہر بھی دانشمند اور حق پرست لوگ اس کی تعریف کرتے تھے اور اس سے فیض حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ شاید یہ تمدن اب کبھی لوٹ کے نہیں آئے گا۔ اس کا صدمہ مجھے گھڑی گھڑی بے آرام کردیتا ہے۔ مجھے کشمیر ایک بے رنگ اور غیر متوازن بستی دکھائی دیتی ہے جس کو گویا کسی ناگہانی طوفان نے ریگستان بنادیا ہے۔ ریگستانوں میں وہ پیڑ پودے، وہ ثمردار درخت، وہ میدان، وہ جھرنے کہاں جن کے اردگرد پھولوں کے تختے سجتے ہیں اور زندگی کو شاداب بنادیتے ہیں۔ کشمیر میں سیاست کا پولو کھیلا جارہا ہے اور اس کھیل میں انسانوں کی، انسانوں کے نکھرتے تہذیب وتمدن کی قدر گھٹ گئی ہے۔

جب میں ٹیچرس کالج کا پرنسپل تھا تو ایک واقعہ پیش آیا جس کا تعلق کشمیری پنڈت برادری سے تھا۔ یہ برادری کشمیر کی اقلیت ہے۔ میری وجہ سے یہ برہم ہوئے ہوں گے کیونکہ یہ لوگ اپنی برادری کے ساتھ کسی بھی قسم کی مداخلت برداشت نہیں کرتے۔ مگر مداخلت ہوئی اور وہ بھی میری طرف سے۔ واقعات اس طرح رونما ہوئے کہ کالج کے میرے کمرے میں دُرگا نامی ایک پنڈت لڑکی داخل ہوئی۔ کالج کی طالبہ، بہت عمدہ ساڑھی پہنے ہوئے تھی کیونکہ اس کا عملی امتحان (Practice of Teaching) ہونیوالا تھا۔ یہ امتحان بی، ایڈ طلباء اور طالبات سے سکولوں میں اسباق پڑھانے کے سلسلے میں لیا جاتا ہے۔ یہ اسباق بی ایڈ کا لازمی اور عملی حصہ ہوتے ہیں۔ امتحان لینے کیلئے لکھنو سے رازداں صاحب اور بنارس سے ماتھُر صاحب تشریف لائے تھے۔ اُن دنوں ایسے امتحانات کا معاملہ بڑا سنجیدہ ہوا کرتا تھا۔ جونہی دُرگا میرے کمرے میں داخل ہوئی تو اس نے رونا شروع کیا۔ اُس نے اپنی ساڑھی تھوڑی سی اوپر کردی اور مجھے اپنی ٹانگ دکھائی۔ میں دیکھ سکتا تھا کہ اس

کی ٹانگ پر خراش سے نیلے دھبّے پڑ گئے ہیں۔ اس نے کہا کہ اس کے بھائی نے ساری رات اس کی مار پیٹ کی۔ میں نے وجہ پوچھی۔ اس نے کہا۔ ''میری ایک لڑکے کے ساتھ دوستی ہے۔ وہ مجھے پڑھانے کیلئے آتا ہے۔ میں اسے چاہتی ہوں۔ میرا بھائی کہتا ہے کہ اسے چاہنے اور اس کے ساتھ شادی کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس نے مجھے ایک کمرے میں بند کیا اور مجھے زدوکوب کیا۔ میں کھڑا بھی نہیں رہ سکتی۔'' میں خدائی فوجدار یا ڈون کیوے (Don Quixote) تو تھا ہی، سوچے سمجھے بنا فون اُٹھایا اور اپنے بڑے بھائی آغا ناصر صاحب کو سارا قصہ سنایا۔ وہ اُس وقت سرینگر کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ اس نے پنڈت صاحب کے گھر ایک سب انسپکٹر پولیس بھیج دیا۔ کشمیری پنڈت کے گھر میں کوئی پولیس والا جائے؟ وہ تو اس گھر کیلئے بے عزتی کی حد ہے۔ دُرگا یا اس کے بھائی نے کون سا جُرم کیا تھا کہ کوئی پولیس والا ان کے گھر میں جائے۔ یہ بات پنڈت برادری کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ مگر جو ہوا تھا سو ہوا تھا۔ اُس گھرانے کی عزت واپس نہیں آسکتی تھی۔ اسی اثنا میں لڑکی کالج میں میرے کمرے کے پاس والے کمرے میں تھی۔ اس کے اعصاب پر دباؤ تھا۔ میں نے ڈاکٹر موہن سنگھ کو بلوا بھیجا۔ اسے تو میں نے کالج کا ڈاکٹر مقرر کر دیا تھا۔ وہ بڑے مہربان ڈاکٹر تھے۔ وہ آئے اور اس لڑکی کو آرام کرنے کی خاطر کچھ دوا دلوا دی۔ اسی اثناء میں اس کا بھائی آیا کہ بہن کو اُٹھا کر گھر لے جائے۔ میں نے انکار کیا۔ لڑکی نے کسی گھبراہٹ کے بغیر بتایا کہ اس کا بھائی کہتا ہے کہ اس کے (دُرگا کے) ہونے والے پتی کا سرینگر میں مکان نہیں۔ ڈاکٹر سیٹھی نے مداخلت کی۔ ''مگر وہ تو شہر میں مکان بنا رہا ہے۔'' میں حیران ہو گیا کہ ڈاکٹر سیٹھی کو علم ہے کہ وہ سرینگر میں مکان بنا رہے ہیں۔ اور فی الحال کرایے کے مکان میں رہتے ہیں۔ میں اس معاملے میں اپنے ناصح پروفیسر جے ایل کول سے پھر مشورہ کرنا چاہتا تھا۔ میں ان کے گھر چلا گیا جو ٹیچرس کالج کے نزدیک ہی ہوا کرتا تھا۔ اُنہوں نے کہا۔ ''بابا، آپ کو دُرگا کے گھر پولیس نہیں بھیجنا چاہیے تھی۔ مگر اب کیا کیا جا سکتا

ہے۔آپ کو ان کی شادی کا انتظام کرنا چاہیے، ورنہ لڑکی بدنام ہو جائیگی۔" ڈھائی گھنٹے میں میں نے فیصلہ کیا کہ ان کی شادی ہوگی۔ میں نے کالج سے تین لڑکیاں اٹھائیں، ہم امیر اکدل چلے گئے۔ہم نے ایک ڈیجہر وخریدا۔ یہ ایک زیور کا نام ہے جو سونے سے بنتا ہے۔شادی کے پوتر دن یہ زیور دُلہن کے سر سے لٹکا رہتا ہے۔ میں نے لڑکیوں سے کہا کہ اچھا خاصا سینڈل بھی خرید کے لاؤ۔ ہم ایک دُکان پر گئے جہاں سینڈل خریدا گیا مگر پہلے یہ سینڈل لڑکیوں کے پاؤں پر آزمایا گیا۔ جس وقت سامان خریدا گیا، شام کے پانچ یا چھ بج چکے تھے۔اس سے پہلے وومنز کالج میں چائے کی دعوت ہو رہی تھی۔ میں گیا کہ پرنسپل محمودہ دُرگا کی کہانی سنکر خوش ہو جائیگی اور مدد کریگی۔ میں یہ اس لئے سوچ رہا تھا کہ محمودہ جی کو عورتوں کے حقوق کے تحفظ کا پاس تھا۔ میں درخواست لیکر گیا تھا کہ دُرگا کو کالج کے ہوسٹل میں ٹھہرنے کی اجازت دی جائے کیونکہ اس کی شادی کا پروگرام بن گیا تھا۔ صادق صاحب وہاں موجود تھے۔ میں نے اسے سارا معاملہ سنایا۔اس نے کہا نہیں، بالکل نہیں، میں ایسا نہیں کرسکتا۔ میں اُسے گرلز کالج لا نہیں سکتا۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ شادی ضرور ہوگی۔اس لئے میں نے لڑکے کو بلایا۔ میں نے کہا کل آٹھ بجے شادی کا پروگرام بنایا گیا ہے۔مگر مسئلہ یہ ہے کہ دُرگا ٹھہرے گی کہاں۔اس نے کہا کہ اس کی بہن چھتہ بل میں ہے، وہاں ہی ٹھہرے گی۔ میں نے کہا ٹھیک ہے مگر تم وہاں ٹھہر نہیں سکتے۔ میں نے کالج کے طلباء اور طالبات سے بات کی کہ وہ لائبریری ڈیپازٹ اور کالج فنڈ سے جو چندہ دینا چاہتے ہوں ، دیدیں۔اُنہوں نے میرا ہاتھ بٹایا۔ میں نے پیسہ جمع کیا اور آریہ سماج ہال میں چلا گیا۔ بالکل وہاں جہاں آریہ پتری پاٹھشالہ سکول تھا۔ میں پنڈت سے ملا اور اس سے کہا کہ آٹھ بجے صبح دُرگا کا لگن ہوگا۔اس نے لگن کرنے کا وعدہ دیا۔ میرے پنڈت طلباء اور طالبات راضی خوشی لگن میں شریک ہوئے۔ وہ عام طور پر بزرگ لوگ تھے جو سینیارٹی کی بنیاد پر بی، ایڈ کیلئے آئے تھے۔اُنہوں نے پیسہ بھی دیا تا کہ شادی شان سے عمل میں لائی جائے۔

اُنہوں نے وہاں شربت جیسی چیز (sops) کا بھی انتظام کیا جو وہاں بانٹ دی گی۔[1] اس دن صبح سویرے دُرگا کو میرے گھر بلایا گیا۔ میری بیوی نے مشّاطہ کا رول ادا کیا۔ ہم نے ایک صندوق بہم کیا جس میں درگا کی چیزیں ڈال دی گئیں۔ میں نے اپنے بیوی بچوں کے علاوہ پروفیسر جے ایک کول کو بھی لگن میں شرکت کرنے کیئے ساتھ اٹھایا۔ ہم حضوری باغ گئے اور شادی ہندو رسم کے مطابق عمل میں لائی گئی۔ مجھے یاد ہے کہ پنڈت نے دلہا دلہن کو کہا تھا کہ وہ اپنے پاؤں پتھر پر رکھیں۔ اس رسم میں پنڈتوں کا کوئی فلسفہ ازدواج ہے۔ میرے پاس اب بھی اس رسم کی تصویریں موجود ہیں۔ دوسرے دن کشمیری پنڈتوں نے مخالفانہ ردعمل دکھایا۔ ان میں پنڈت شیام لال صراف قابل ذکر ہے۔ انہوں نے کہا کہ کشمیری پنڈتوں کی برادری کے ساتھ اس طرح ٹانگ اڑانے کا مجھے کوئی حق نہیں۔ جے، ایل کول نے تقریر کی تھی۔ اُس نے کہا تھا۔ ''لڑکا لڑکی کی عشق کی بنیادوں پر شادی ہمارے تمدن میں بحران پیدا کر دیتی ہے۔ یہ قابل مذمّت بات ہے۔'' شادی کے بعد دُرگا اور اس کا پتی ہمارے گھر آتے رہے۔ اس رشتے نے اچھی خاصی حیثیت اختیار کی۔ ایک دن آغا شاہد نے اپنی بڑی بہن کو کہا کیوں نہ دُرگا کی شادی سے متعلق حقائق حاصل کئے جائیں اور اس پر ایک سٹوری بنائی جائے۔ نیویارک ٹائمز اپنے میگزین سیکشن میں اسے چھاپنے میں دل چسپی دکھائے گا اور یہ سٹوری چھاپنے کے لائق ہے۔

مولانا آزاد کا مشورہ جو انہوں نے نسیم باغ کے قریب ہوس بوٹ میں کشمیری پنڈتوں کو دیا تھا، وہ میں نے بے چوں و چرا قبول کیا۔ کشمیری مسلمانوں کیلئے سائنس پڑھنا اور جدید تعلیم حاصل کرنا ضروری تھا کیونکہ اُسی صورت میں وہ تعمیری اور تخلیقی صلاحیتوں کو اُبھار سکتے تھے۔ ان صلاحیتوں کی بدولت آگے بڑھ سکتے تھے اور ترقی کر سکتے تھے۔ انسپکٹر سکولز کی حیثیت سے میں نے بھی مدارس میں کام کرنے والے اُستادوں کو صاف الفاظ میں کہا تھا

1. They collected some sops there so that there was a not a tag from the other side.

کہ بچوں کی صلاحیتوں کو اُبھارنا اور اُنہیں پہلے ہی سے جدید زندگی کے ساتھ جوڑنا بہت ضروری ہے اگر نیا کشمیر کے پروگرام کو عملی جامہ پہنانا ہے۔ چنانچہ مسلمان گھرانوں کے بچوں نے اپنے آپ کو اس ڈگر پر ڈھالنا شروع کیا۔ نتیجہ کے طور پر سکنڈری سکولوں اور اعلیٰ تعلیمی اداروں میں مسلم مڈل کلاس بننا شروع ہوگیا۔ اس سے اقلیتی فرقے میں ہراس پیدا ہوگیا۔ ان کی اجارداری تعلیم اور ملازمتوں کے حوالے سے خطرے میں پڑ گئی اور انہوں نے ہر لحاظ سے اپنی جمی ہوئی پوزیشن کو برقرار رکھنے کیلئے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کئے۔ میں نے اپنے طور پر کشمیری پنڈتوں کے آگے بڑھنے کیلئے زیادہ سے زیادہ مواقع پیدا کئے تھے۔ مگر ٹریننگ کالج میں صرف تین مسلمان لڑکیاں تھیں اور دوسری طرف چالیس پنتالیس پنڈت لڑکیاں۔ میں اس کثیر تعداد کے ساتھ ساتھ تین لڑکیوں کا بھی خیال رکھتا تھا۔ میں نے سکولوں سے پنڈتوں کو چن چن کے لایا، اچھی جگہوں پر بٹھایا، ان کو سکھایا اور وہ لیکچرر بن گئے، پروفیسر بن گئے اور پھلے پھولے۔ وہ پڑھے لکھے تھے، ایم اے، ایم ایڈ پاس کر کے آئے تھے۔ میں نے ان کی حوصلہ افزائی کی اور وہ میری وجہ سے بھی پھلے پھولے۔ میں ان کے لئے کچھ اور زیادہ نہ کر سکتا تھا۔ مگر جب میں فُل برائٹ سے فائدہ اُٹھا کر امریکہ سے واپس آیا تو کشمیر یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ میں نے وہاں شعبۂ تعلیم کھولا اور پنڈتوں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو نئے ڈھنگ سے تعلیم کے محکمے میں لیڈر شپ رول ادا کرنے کیلئے تیار کرنا شروع کیا۔ پہلی دفعہ کشمیر کی تاریخ میں ایم ایڈ ڈگری سرینگر میں حاصل کرنا ممکن ہوگیا تھا۔ مسلمانوں نے پنڈتوں کے دوش بدوش محنت کی اور فسٹ ڈویژن حاصل کئے۔ انتظامیہ نے فیصلہ کیا کہ چند ایک مسلمان ایم ایڈ ڈگری یافتہ اشخاص کو ٹیچرس کالج لایا جائے۔ میں نے اس کالج میں کام کرنے والے لیکچررروں کو اس تقرری پر ناخوش پایا۔ میں نے ان کو سمجھایا کہ نئی فصل تیار ہوگئی ہے اس لئے اُنہیں نئے لوگوں کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔ اُنہیں اپنے ساتھ کام کرنے کا موقع دینا چاہیے۔ ان میں سے ایک آدمی بول اٹھا۔ ''آغا

صاحب ہم اس بارے میں سوچیں گے"۔ بس معاملہ بگڑ گیا۔ میں اُن دنوں ڈائریکٹر ٹریننگ تھا۔ ہمیں وسیع اختیارات دیئے گئے تھے۔ میں نے گیارہ آدمی تبدیل کردیئے اور ان کو سٹیٹ انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن بھیج دیا۔ ان میں دو مسلمان خواتین بھی شامل تھیں۔ بس کہرام مچ گیا۔ کشمیری پنڈت برادری میں کھلبلی مچ گئی۔ ایم ایڈ طلباء اور طالبات کیلئے لائبریری سے فائدہ اٹھانے میں رکاوٹیں پیدا کی گئیں، کبھی ایک بہانے سے کبھی دوسرے بہانے سے طلباء اور طالبات کتابیں نکال نہ سکے۔ کافی ہاؤس کو استعمال کیا گیا اور وہاں میرے خلاف کھلا پروپگنڈا کیا گیا۔ ٹیچرس یونین کے ایک استاد کو جوان کا پٹھو تھا اور خود بھی کشمیری پنڈت تھا، استعمال کیا گیا۔ اس حد تک کہ مسخرہ پن کو بھی استعمال کیا گیا۔ جب کوئی تیر نشانے پر نہ بیٹھا تو میرے خلاف اٹھارہ نکات پر مشتمل رشوت ستانی کا کیس بنایا گیا۔ یہ لوگ سب کے سب میرے پالے ہوئے شاگرد تھے یا عزیز ساتھی۔ اُن کا تبادلہ ان کی نظر میں پنڈت کمیونٹی پر ایسا ہی حملہ تھا جیسے دُرگاہ کی شادی۔ پنڈت ڈی این کول اُن دنوں انسپکٹر جنرل پولیس تھے۔ انسداد رشوت ستانی کا محکمہ اُن کے تحت کام کررہا تھا۔ یہ وہی کول صاحب ہیں جن کی گھر والی میرے وقت میں کئی دفعہ ایم ایڈ کے امتحان میں فیل ہوگئی تھی۔ کول صاحب نے پیر غلام حسن شاہ صاحب ڈی آئی جی پولیس کو لکھا کہ وہ اس معاملے کی تحقیقات کریں۔ اس کا مدعا یہ تھا کہ پولیس آجاتی، میرے دفتر کا سارا ریکارڈ ضبط کرتی، اور اس دوران ساری ریاست میں خبر پھیلتی کہ آغا اشرف کو رشوت ستانی کے سلسلے میں پکڑا گیا۔ اب دلچسپ کہانی شروع ہوتی ہے۔ حسن شاہ صاحب چیف منسٹر سید میر قاسم کے پاس جاتے ہیں۔ اسے سارا ماجرا سناتے ہیں۔ قاسم صاحب اُنہیں کہتے ہیں کہ آغا اشرف صاحب کی زندگی میں رشوت ستانی کا کھوج نکالنا ایسی ہی بات ہے جیسے مرد کے فوطوں میں ہڈی ڈھونڈنا۔ پھر کہا کہ فضول بات ہے اسے وہیں چھوڑ دو۔ حسن صاحب نے کول صاحب کو رپورٹ بھیج دی۔ کول صاحب نے پھر لکھا۔ "ہر شخص معصوم ہے جب تک اس

کے خلاف جرم ثابت نہ ہو جائے۔ معاملے کو آگے بڑھاؤ، تحقیقات جاری رکھو"۔ حسن صاحب پھر چیف منسٹر کے پاس گئے۔ اس نے کہا کسی پولیس آفیسر کو آغا صاحب کے پاس بھیجو اور اس کی رائے طلب کرو۔ پھر زگورہ میں رہنے والے حمید اللہ صاحب کو میرے پاس بھیج دیا گیا۔ یہ خان خاندان کے ساتھ تعلق رکھتے تھے۔ سپرانٹنڈنٹ پولیس تھے۔ حمید صاحب آئے اور ہم میرے مکان کے ورنڈے پر بیٹھ گئے۔ میں نے سارے الزامات کا جواب دیدیا۔ ۵۲۔۵۳ء میں جب میں انسپکٹر سکولز تھا، انہوں نے (کشمیری پنڈتوں نے) میرے خلاف ایسا ہی کیس بنایا تھا۔[1] اس وقت شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ وزیر اعظم تھے۔ ایک الزام تھا کہ میں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ سے کتابیں خریدی ہیں۔ اِس وقت ایک الزام تھا کہ میں نے شرما صاحب سے ٹیچرس کالج کی وِلی (Villy) جیپ چھوڑنے کو کہا تھا۔ یہ جیپ اس کالج کیلئے نذرانے کے طور پر امریکہ سے آئی تھی اور بائیں جانب سے چلائی جارہی تھی۔ میں نے اُن سے کہا تھا کہ وہ گورنمنٹ سے اپنے لئے کار منگائیں۔ یہ جیپ آٹھ کلومیٹر فی لیٹر پر چلتی تھی مگر گورنمنٹ نے چار سے پانچ کلومیٹر ٹھہرائے تھے۔ میں نے ڈرائیور سے چابی لی اور اُسے رخصت کر دیا۔ پھر محمد یوسف راجا آئے جو چیف منسٹر کے برادر کے داماد تھے۔ اُس نے کہا کہ آٹھ کلومیٹر خرچ فی لیٹر دکھاؤں تو سارے ٹرانسپورٹ میں کھلبلی مچ جائے گی۔ یہ باتیں میں نے حمید اللہ خان صاحب کی تحقیقاتی فائل پر لکھ ڈالیں۔ حمید صاحب چلے گئے اور سارا معاملہ گول ہو گیا۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ!

قطع نظر کول صاحب کے کرپشن داؤ کے، قطع نظر اس کی انگریزی Every one is

---

۱۔ علی اکبر کاظمی ہمارے ناظم تعلیمات تھے، وہی اس کیس کی تحقیقات کر رہے تھے۔ تیس سے چالیس ہزار روپے کی کتابیں میں نے جامعہ سے اس شرط پر لی تھیں کہ وہ یہ کتابیں حکومت جموں و کشمیر کو ۴۰ فیصد رعایت پر بیچ دیں۔ وہ کتب فروشوں کو ۳۳ فیصد رعایت نہیں دیتے تھے۔ جو کتابیں میں نے خریدی تھیں اُن میں گاندھی اور نہرو کی خودنوشت سوانح عمریوں کی سو سو کاپیاں تھیں۔ کاظمی صاحب نے حالات سے واقف ہو کر سارا کیس دفن کر دیا۔

innocent unless proved guilty, proceed! کے، میں نے قابل مسلمان تعلیم یافتہ لوگوں کو کالج آف ایجوکیشن اور سٹیٹ انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن میں لایا۔ میں ٹیچرس ٹریننگ پروگرام نئے سرے سے نئے تقاضوں کے مطابق ڈھالنا چاہتا تھا۔ میں نے یہ خواہش پوری کی تاکہ ریاست کی تعلیمی ضروریات کا بوجھ اساتذہ اٹھا سکیں۔ بعد میں جب پروفیسر ستیہ بھوشن کمشنر بن گئے اور این، سی، آر، ٹی میں بنی ہوئی درسیات ریاستی سکولوں میں رائج کردی گئیں، میرا شروع کیا ہوا پروگرام اور بھی تیز ہوگیا۔ ٹریننگ کالجوں اور ٹریننگ سکولوں میں سائنس اور ریاضی کے ساتھ ساتھ سوشل سائنس پڑھانے کیلئے اساتذہ کو باضابطہ تربیت دی گئی۔ سرمائی چھٹیوں سے بھی کام لیا گیا۔ تقریباً گیارہ سال تک میرے یونیورسٹی کے شاگرد انتظامیہ کے ساتھ ساتھ کاندھے سے کاندھا ملا کر ان تھک کام کرتے رہے۔ انتظامیہ اور بورڈ آف سکول ایجوکیشن کو ٹریننگز کے ساتھ ملایا گیا۔ سارا محکمہ تعلیم رات دن ایک یونٹ کی حیثیت سے کام کرتا گیا۔ ہر مہینے ضلع سطح پر کام کرنے والے افسروں، سٹیٹ انسٹی ٹیوٹ میں کام کرنے والے تجربہ کار ماہروں اور تربیت یافتہ اُستادوں کے معلموں کی ماہانہ میٹنگیں ہوتی رہیں۔ ان میں تعلیم کے سینئر افسروں، ناظم تعلیمات اور پرسپلوں کی شرکت لگاتار ہوتی رہی۔ ایک تعلیمی ماحول بنا اور کام ہوتا رہا۔ اس کام کے نتائج کیا نکلے، اس کا اشارہ دوسرے ابواب میں دیا گیا ہے۔

میں بار بار مولانا آزاد کی طرف متوجہ ہوجاتا ہوں۔ اس لئے کہ مولانا آزاد نے پنڈتوں کو جو مشورہ دیا تھا وہ ان لوگوں کی ذہنی اور نفسیاتی حالت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ لوگ دور اندیش نہیں اور نہ دوسروں کے ساتھ مل کر کام کرنے کی اہلیت اور جرأت رکھتے ہیں۔ کمزوروں کو اُبھارنے سے ان کو عار ہے، اس لئے کہ یہ لوگ کمزوری کا فائدہ اٹھا کر اپنی خوش حالی کا بندوبست کرتے آئے ہیں۔ انہیں اُبھرنے کے مواقع دئے جائیں تو یہ کمال کر دکھائیں گے اور نہایت ہوشیاری اور چالاکی سے دوسروں کو اپنے فائدے کیلئے استعمال

کریں گے۔ میں نے ہمیشہ ٹیچرس کالج میں انہیں داخلہ دیا۔ ان کے ساتھ کام کیا، ان کی ذہنی اور اخلاقی زندگی کو اُبھارنے کی کوشش کی۔ ان کے ساتھ بہت ہی اچھی اور شہرہ آفاق کتابوں پر بحث کی جن کی دستیابی میری پہلی کوشش ہوا کرتی تھی۔ میں نے ان سے کوئی کتاب چھپائی نہیں۔ انہیں کوئی غلط مشورہ نہ دیا نا ہی ان کے لئے ناموزوں حالات پیدا کئے جن کی وجہ سے ان کے اندر کی تعمیری اور تخلیقی قوتیں اُبھر نہیں سکتی تھیں۔ جدید دنیا کے دریچے ان کیلئے کھول دئے تا کہ نئی روشنی سے ان کے ذہن کھُل جائیں اور وہ نیا کشمیر کے بنانے میں عقلمندانہ رول ادا کرسکیں۔ میں نے ان کے لئے مسلمان افسروں کے ساتھ اختلاف کئے اور اپنی طرف سے ان کو قائل کردیا کہ پنڈت ہمارے بھائی ہیں اور کشمیر کے خوبصورت پھول۔ مگر اُنہیں ہمیشہ اپنی صورت اپنے آئینے میں دکھائی دی اور اُنہوں نے اُلٹا مجھے اپنے مقصد میں ناکام بنانے کی کوشش کی۔ جن کشمیری پنڈتوں کو چُن چُن کر میں نے لایا تھا اور اپنی ٹیم میں شامل کردیا تھا، جن کی حوصلہ افزائی کرنے میں میں نے کوئی کسر باقی نہیں رکھی تھی۔ وہی پنڈت میرے خلاف ہوگئے اور مجھے جھوٹے مقدموں میں پھنسانا چاہا تا کہ میں بدنام ہوجاؤں اور جامعہ سے یورپ تک اور یورپ سے امریکہ تک کمائے ہوئے نام اور تجربے پر داغ لگ جائے۔ یہ سب اس لئے تھا کہ میں کشمیر کے معصوم عوام اور پہلی دفعہ پڑھے لکھے مسلمانوں کو بھی آگے بڑھنے کیلئے تیار کرتا تھا۔ ان کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ پنڈتوں کا طبقاتی کردار ان کے اخلاق پر ہمیشہ غالب رہا اور انہوں نے اپنے بھائیوں کی بڑھتی ہوئی ترقی قبول نہ کی۔ سب سے افسوس ناک بات اس سلسلے میں اس وقت سامنے آئی جب میرے دو بزرگ دوستوں نے میرے اوپر وار کیا۔ پنڈت آر سی رینہ صاحب میرے گہرے دوست تھے اور ہم نے بہت اچھے دن اکٹھے گزارے تھے۔ ڈاکٹر بھان صاحب تو میرے استاد بھی رہ چکے ہیں اور بہت قریب بھی۔ اس کے علاوہ وہ انگلستان میں بھی میرے ساتھ رہ چکے تھے۔ ایک دن دونوں پنڈت جموں میں میرے

ساتھ چہل قدمی کر رہے تھے۔ اُن دِنوں حساب، انگریزی اور سائنس کے علاوہ رومیلا تھاپر کی لکھی ہوئی تاریخ کی کتابوں، جغرافیہ کی جدید طرز پر لکھی ہوئی کتابوں اور سماج کے ساتھ مربوط دیگر کتابوں مثلاً شہریت وغیرہ پر خوب چرچا ہو رہا تھا۔ ہم کشمیر میں نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ کے تیار کردہ درسیات کو ریاست جموں و کشمیر میں لاگو کرنے کے متعلق سوچ رہے تھے اور اس سلسلے میں بڑے پیمانے پر اساتذہ کی تربیت کا انتظام کر رہے تھے۔ اسی زمانے میں کالج آف ایجوکیشن میں جمی ہوئی پنڈتوں کی ایک بڑی ٹولی کو میں نے تبدیل کیا تھا۔ جب رینہ صاحب اور بھان صاحب میری باتیں سُن رہے تھے تو انہوں نے بلا جھجک کہا۔ ''لیکن آغا صاحب، بالآخر تم کشمیری پنڈتوں کے سب سے بڑے دشمن ہو۔'' میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہے تھے۔ میں ہکا بکا رہ گیا۔ یہ غصہ مجھ پر اس لئے اتارا گیا کہ میں غریب عقل مند اور تیز فہم لوگوں کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا۔ رینہ صاحب اور بھان صاحب کے کھلے الفاظ نے مولانا آزاد کا سارا واقعہ میرے دل میں تازہ کر دیا۔

پہلے بھی اشارے دئے جا چکے ہیں کہ بخشی صاحب نے کچھ جمہوری قدروں کا پاس کرتے ہوئے کچھ ناراض مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملانے کیلئے اقلیتوں کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ مسلمان اُستادوں کو ترقیاں دی گئی تھیں، بہت سارے کم تعلیم یافتہ مسلمانوں کو اُستادوں اور اُستانیوں کی حیثیت سے سکولوں میں تعینات کیا گیا تھا۔ پنڈتوں نے برہم ہو کر مقدمہ سپریم کورٹ آف انڈیا میں پہنچایا تھا۔ مقدمے کی بنیاد یا تو تعلیمی قابلیت تھی یا سینیارٹی۔ مگر کسی قوم کو آگے بڑھانے کیلئے بچھڑے ہوئے طبقوں کو رعایات دینی پڑتی ہیں۔ خاص کر اُن طبقوں کو جو سینکڑوں سال خصوصی مراعات رکھنے والوں کے ہاتھوں پٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ دیہات میں رہنے والوں کو کالج اور یونیورسٹی کے اردگرد رہنے والوں کے ساتھ انتخابات کیلئے کھڑا نہیں کیا جا سکتا اور نہ ان کے ساتھ جن کی معاشی اور مجلسی زندگی سال ہا سال سے تعلیم و تربیت کیلئے زیادہ سازگار ثابت ہوئی ہوتی ہے۔ بھارت میں

سوشلزم کو کسی بھی قیمت پر قربان نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ایسا کرنا ایک بڑا سانحہ ثابت ہوسکتا ہے۔ کشمیری مسلمانوں کو کاشتکاری اور مزدوری کی سزا نہیں مل سکتی تھی مگر سپریم کورٹ نے جب فیصلہ سنایا تو بڑے بڑے جاگیرداروں کی نسل کے ساتھ ان کے کاشتکاروں کی نسل کو بٹھانا پڑا اور یہ کام سید میر قاسم کے وقت میں عمل میں لایا گیا۔ قاسم صاحب نے مجبور ہوکر ایک ایک ہائی اسکول میں دو دو ہیڈ ماسٹر کھڑا کردئے۔ ایک سیاسی مگر مصلحتی ہیڈ اور دوسرا اصلی۔ ہندوستان میں کشمیر میں دوعملی شروع ہوئی اور دوقومی نظریہ پیدا ہوگیا۔ یہ صورت حال جنگ جویانہ حرارت میں خوب کام آگئی۔

پنڈت ڈی این کول کا کرپشن پلاٹ مسلّم، یہ بھی مانا کہ میں کشمیری مسلمان کاشتکاروں کے بچوں کو ابھارنے کیلئے تعلیمی میدان تیار کرنے کی کوشش کررہا تھا اور اس طرح خودغرض ڈوگرہ شاہی کے اہلکاروں کے اوپر اکثریتی فرقے کی ترقی کا خواہاں تھا، مگر کشمیر ایک ایسی جگہ کا نام ہے جہاں تقسیم ہند کی پاداش میں رونما ہونے والے جیسے ہولناک مناظر دیکھے جاسکتے تھے۔ ''اگر حملہ آور خبردار، ہم کشمیری ہیں تیار۔ شیر کشمیر کا کیا ارشاد، ہندو مسلم سکھ اتحاد'' جیسے نعرے دینے والے اور بلا لحاظ مذہب وملت ۳۰۳ بندوقیں کاندھے پر رکھکر مارچ کرنے والے کشمیری شیخ صاحب کی قیادت میں کھڑا نہ ہوجاتے تو یہاں بھی خون کی ندیاں بہہ گئی ہوتیں۔ یہاں بھی کوئی خودغرض منشائے سیاست مسلمانوں کے راستے میں حائل نہیں ہوتی جس طرح ہندوستان میں کئی کئی بار حائل نہ ہوئی تھی اور اس طرح ہندوؤں نے بازارِ خون آشامی گرم کیا تھا۔ ہندوستان میں خون ہوا، جموں میں قتل کا بازار گرم کیا گیا مگر کشمیر میں ہندو مسلم بھائی بھائی کی روشنی گاندھی جیسے مہاتما کو بھی نظر آگئی۔ اپورب سومناتھ جیسے قابل اور فاضل دانشمند، بائیں بازو والے ترقی پسند، چھوٹے بڑے مرد وزن، سارے کے سارے کشمیری پنڈتوں کے اردگرد سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر کھڑے ہوئے تھے۔ مسلمانوں نے ڈوگرہ شاہی کے مظالم بھول ڈالے تھے۔ پٹواری سے

لیکر تھانے دار تک، تھانے دار سے لیکر ذیلدار تک، ذیلدار سے لیکر تحصیلدار اور وزیرِ وزارت تک کے سارے شکنجے پسِ پشت ڈالے تھے۔ ایک متنفس کشمیری پنڈت کو دھیلے کا نقصان نہ ہوا تھا، جانی نقصان درکنار۔ شیخ صاحب کشمیری پنڈتوں کے گھروں کا طواف کر رہے تھے۔ کشمیری پنڈت اسے لارڈ کرشنا کہہ رہے تھے، وہ جیالال کلم کے خون کے ساتھ اپنا خون بہانے کی قربان گاہ پر چڑھنے کے لئے خود رجز پڑھ رہے تھے، مگر جب ہندوستانی فوج سرینگر میں آ پہنچی تو شیخ صاحب کو بھلایا گیا اور ''جے ہند'' کی آواز سنڈ یکیٹ کے گلے سے آنکلی۔ پس کشمیری مسلمان کی نفسیاتی کیفیت پر زخم لگنے شروع ہوئے اور اس کا اظہار حبیب اللہ وڈیرہ کی زبان سے ہونے لگا۔ سیاسی کھیل کی زبان میں کہا جاسکتا ہے کہ پہلا ویکٹ گر گیا۔ ۱۹۵۳ء میں ڈی پی در، سردار امر سنگھ اور کئی لوگ جب چشمہ شاہی میں امرت دھارا پی رہے تھے تو کشمیر کے لینن ڈی پی صاحب کی زبان سے فرطِ شوق سے ''ملٹری جی'' کی کہانی وضع ہوئی۔ سب ہنس پڑے مگر کچھ مسکراہٹوں کے پیچوں بیچ خون کے آنسو رو رہے تھے۔ ڈی پی صاحب کا کلام ماشاء اللہ سیاسی ذہانت سے دُھلا منجھا مگر اس کے دُوررس مطالب نے دوسرا ویکٹ گرادیا۔ تیسرا ویکٹ ۱۹۸۹ء میں گرا جب یہاں خونین تحریک شروع ہوئی۔ جب سارے نوجوانان کشمیر سرحد پار سے بندوق حاصل کر کے آئے۔ اس کی فوری وجہ نیشنل کانفرنس کی کم عقلی اور تنگ نظری تھی جس نے لوگوں کو الیکشن کے دوران ڈنڈوں سے مارا تھا۔ کشمیریوں نے سوچا ویت نام سے امریکہ کو نکال دیا گیا، افغانستان سے روس کو اور ایران سے رضا شاہ کو۔ یہ کرامت بندوق کی تھی۔ اس لئے وہ بھی قسمت آزمائی پر اُتر آئے اور ''چھین کے لیں گے آزادی'' گھن گرج کے ساتھ بآواز بلند پکارنے لگے۔ کشمیر کی ساری روحانی روایات اور یہاں کی صدیوں سے پلی ہوئی قدریں اس سیلاب کے ساتھ بہہ گئیں۔ یہ کرکٹ میچ کا خاتمہ تھا۔ ''ملٹری جی، بے قدر ہوئی اور بے اثر۔ ہر مسجد سے ''اللہ اکبر'' کی آواز گونج اٹھی اور راتوں رات سارے کشمیری برہمن مہاراجہ ہری سنگھ کی

طرح بھاگ گئے۔ کسی نے کشمیر پر فلم بنائی۔ میں نے اسے انڈیا انٹرنیشنل سنٹر میں دیکھا۔ کے ایل سہگل کا گانا ''بابل مورا'' اس کا رمز (refrain) تھا۔ کاش کشمیری پنڈت مولانا آزاد کا مشورہ مانتے تو یہ نوبت نہ آتی۔ اس فلم سے کشمیر ایڈمنسٹریشن ننگی ہو جاتی ہے جس نے دوسری باتوں کے علاوہ کشمیری پنڈتوں کی نفسیاتی اور ذہنی کیفیات کا خیال نہ رکھا۔ کشمیر کے ڈاکٹر، انجینئر، سول سرونٹ اور دیگر قابل پنڈت کشمیر سے چلے گئے۔ یہاں جو بودھ ہندو اور مسلم تہذیب گتھم گتھا ہوگئی تھی اور جس میں بہت ہی حسین و جمیل روحانی تجربات شامل ہو گئے تھے، دس برس کے اندر ملیامیٹ ہو گئے۔ کشمیر اکبر اعظم کا فتح پور سیکری یا دربار اکبری تھا۔ اسے اورنگ زیبی سیاست اور اس کے بعد کی ''موج مناؤ اور عیش کرو'' سیاسی پالیسی نے تاراج کر دیا (اورنگ زیب سیاسی شخص نہیں، علامت ہے)۔ کشمیر کے انتظامیہ نے نہ اس روایت کا احترام کیا اور نہ اسے مناسب جگہ دی جس سے یہ پھلتی پھولتی اور زندگی کو پروان چڑھاتی۔

میں نے ساری عمر جس کام کیلئے وقف کی تھی، جو کام انسان کی ترقی اور تعمیر، محبت اور اخوت کی تلاش میں رہتا تھا، اس کام کو سیاست گری اور سیاسی بازی گری نے تباہ کیا۔ وہ فلسفہ، وہ سماجی اعتدال، وہ نفسیاتی ہم آہنگی اور توازن، وہ درویشی و بے خویشی جو سقراط سے لیکر گاندھی تک میرے دل و دماغ پر چھائی رہی اور اساتذہ، طلباء اور طالبات کے ساتھ کام کرتے کرتے زبان پر چڑھتی رہی، سب اکارت گئی اور غارت! میں بار بار کشمیر کی لیڈر شپ کی بے قدری کی طرف اشارہ کرتا گیا۔ اس بے قدری کا نتیجہ ہمارا مکمل زوال ہے یا ہمارا ماتم جس میں ہم سب مصروف ہیں۔ تعلیم کا، اساتذہ کا، زندگی کی نفاست کا، شہریت اور مہذب سلوک کا کیا حال ہے! موٹریں کس طرح چلائی جاتی ہیں اور دو پہیے والی گاڑیاں کس طرح! پیدل چلنے والوں کا چلنا کس قدر محال ہے! اُنہیں چلنے نہیں دیا جاتا۔ اُن سے بدسلوکی کی جاتی ہے۔ جگہ جگہ پولیس والے کھڑے ہیں۔ وہ گویا اس ہولناک منظر کا تماشہ

دیکھ رہے ہیں۔ لگتا ہے کہ حیوانوں نے انسان کا قالب اختیار کیا ہے۔ اپنی حیوانی نظریات کا کھلا اظہار کرنے کیلئے۔ نہ کوئی داد ہے نہ دادرس! کتے بھی یہ تماشہ دیکھ کر بھونکتے نہیں۔ بندوق نے پیسہ کمایا اور ایسی حالت پیدا ہوئی جس نے جنگل کی بادشاہت قائم کی۔ اس نئے گروپ نے اپنی بصارت کھوڈالی ہے کیونکہ زراندوزی اور نفع طلبی نے ان کی آنکھوں میں موتیا بند پیدا کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اُنہیں عزت، بھوک اور بیماری کو گلے لگانا چاہیے تھا جنہوں نے آزادی کا پرچم اٹھایا تھا۔ مگر ہوا یہ کہ انہوں نے روپیہ حاصل کیا، محلات بنائے، موٹریں خریدیں، رہائش گاہوں میں جدید طرز کا ساز وسامان لایا۔ ان کا برتاؤ اتنا ناشائستہ اور اکھڑ ہو گیا ہے کہ اس کے بیان کیلئے زبان کا جامہ تنگ ہے!

یورپ اور امریکہ میں تعلیم و تربیت

ڈاکٹر ذاکر حسین جامعہ ملیہ اسلامیہ کو چھوڑ کر علیگڈھ چلے گئے۔ مجھے مشورہ دیا کہ میں بھی ساتھ چلوں۔ میں نے کہا میں کشمیر جاؤنگا، اپنے گھر، مجھے علیگڈھ جانا کس لئے؟ اُنہوں نے شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ کے نام خط دیا کہ مجھے ہندوستان سے باہر تعلیم و تربیت کیلئے بھیجدیا جائے۔ میں نے کشمیر ہاؤس دلّی میں خط شیخ صاحب کے حوالے کیا۔ اُنہوں نے کہا جموں میں کاروائی ہوگی۔ میں جموں میں اُن سے ملا۔ اُنہوں نے 16,042 روپے سرکاری قرضہ دیا۔ قرضے پر بیمہ کیا گیا تھا۔ ساری رقم دس سال میں واپس کرنی تھی۔ اس طرح میں دو سال کیلئے اگست ۱۹۵۰ء میں ایس ایس ملتان (S S Moolton) جہاز میں پہلی دفعہ غیر ملکی سفر (یورپ) کے لئے روانہ ہوا۔ فیض طیّب جی نے مجھے الوداع کیا۔ اکیس دن سفر جاری رہا۔ جہاز میں لکڑی اور بید کی شاخوں سے بنا ہوا شاندار فرنیچر تھا۔ ملتان جہاز چونکہ سیاحوں کے لئے بنایا گیا تھا، اس لئے اسمیں اِدھر اُدھر گھومنا ممکن تھا۔ جہاز میں مجھے رالف رسل ملے۔[1] رسل صاحب نے مجھے لندن میں پیسہ بچانے کا گُر سکھایا جس سے میں ولایت میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہ سکا۔ مگر یہ کام بعد میں مشکل ثابت ہوا۔ تاہم میری زندگی کا کام ہی مشکلوں کے ساتھ کھیلنا ہے۔ سفر میں ہم نے ٹالسٹائی کا ناول ''انا

۱۔ پروفیسر رالف رسل ۱۹۵۰ء میں جامعہ آئے تھے۔ میں مُلتان جہاز میں اُن سے ملا۔ وہ میرے دوست بن گئے۔ رسل بڑے ہنس مُکھ اور دلبر قسم کے آدمی تھے۔ اُردو کے یہ پروفیسر مرزا غالب پر خاصی اچھی نگاہ رکھتے تھے۔

کریتنا" (Anna Karenina) اور دوستوفسکی کا ناول "جرم اور سزا" (Crime and Punishment) باری باری پڑھا۔ اس طرح رسل صاحب کے ساتھ میرا سفر علمی و ادبی ماحول میں ختم ہوا۔

میں نے لندن یونیورسٹی میں اکیڈامک ڈپلوما (Academic Diploma) کے لئے داخلہ لیا۔ اس کے لئے General Education Theory لینی ضروری تھی۔ میں نے اس کے ساتھ Comparative Education اور Educational Administration کا بھی انتخاب کیا۔ پروفیسر لاریس نے کہا کہ مجھے ٹیچر ایجوکیشن ڈپلوما کرنے کی ضرورت نہیں اس لئے کہ میں نے جامعہ میں پہلے ہی کچھ تجربہ حاصل کیا ہے۔ اکیڈامک ڈپلوما کا معیار ٹیچر ایجوکیشن ڈپلوما کے معیار سے اونچا تھا۔ بمبئی ہسپتال میں جب میں سیدین صاحب سے ملنے گیا، اُنہوں نے مشورہ دیا کہ مجھے تقابلی (Comparative Education) پڑھنا چاہیے۔ یہی خیال پروفیسر لاریس کا بھی تھا۔ چنانچہ جب میں نے اُن سے تقابلی تعلیم کے انتخاب کی بات کی تو اُنہوں نے میرے انتخاب پر اپنی مہر ثبت کی۔ شیخ صاحب مجھے انتظامیہ (Administration) کے لئے تیار کرنا چاہتے تھے۔ اُن دنوں لندن یونیورسٹی میں اِرک فرام (Erich Fromm) زبان زدِ عام تھے۔ اُن کی کتاب "آزادی کا خوف" (Fear of Freedom) ۱۹۴۲ء میں چھپ گئی تھی اس لئے صرف آٹھ سال گذر چکے تھے۔ لندن یونیورسٹی کی ایک خصوصیت تھی کہ اس میں یہودیوں کا ایک گروپ جمع ہو گیا تھا جس کو ہٹلر نے جرمنی سے نکال باہر کیا تھا۔ اس گروپ کے بارے میں میں نے بعد میں سُنا کہ پریذیڈنٹ روزویلٹ (Roosevelt) کی گھر والی اپنے میاں پر دباؤ ڈال رہی تھی کہ وہ اس گروپ کو بچانے کی کوشش کریں۔ اُس گروپ سے اکثر یہودی بعد ازاں امریکہ چلے گئے مگر کارل مان ہائیم انسٹی چیوٹ آف ایجوکیشن میں ہی ٹھہر گئے۔ اُس نے انسٹی چیوٹ کا بنیادی ماحول ہی بدل ڈالا۔ مان ہائیم ریفوجی تھا اور صرف لیکچرر مگر اُس نے سماجیات کی

لائبریری سماجی اجتہاد کے لئے قائم کی۔ میں اس کی کتابوں کو دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔ اس کی کتاب ''عصر حاضر کی تشخیص'' (Diagnosis of Our Time) الگ الگ عناصر کا نہیں، مربوط عناصر کا تصورِ حیات ہے۔[1] یہ تصور دوسرے تصورات کے ساتھ مل کر بچے کی نشوونما اور کردار سازی کا کام کرتا ہے۔ سماج کی مختلف ایجنسیاں جب مل کر تعلیم کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائیں، کامیابی حاصل ہوگی۔ بچہ اُن ساری چیزوں کے بیچوں بیچ سماج میں پیدا ہوتا ہے جو آجکل کی زندگی کی تعبیر پیش کرتی ہیں۔ کارل مان ہائیم نے جن باتوں کو اُبھارا وہ انگلستان کے لئے نئی تھیں۔ پروفیسر لارلیس مرد آدم کیلئے مان ہائیم کی باتیں وقت کی آواز کے مترادف تھیں۔ وہ بھی کہتے تھے کہ ہم سماج کے پس منظر میں ہی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ کارل مان ہائیم کا بڑا کارنامہ ''دنیائے خواب و خیال اور آئیڈیالوجی'' (Ideology and Utopia) ایک معنی خیز کارنامہ ہے۔ ذاکر صاحب نے جامعہ کے ایام میں ہی مجھے کہا تھا کہ جرمنی میں اُسے معلوم ہوا تھا کہ کارل مان ہائیم بہت قابل آدمی تھا۔

لندن میں ایک نیک دل خاتون لیڈی تھرلو تھی۔ اس نے رہن سہن کے سلسلے میں ہماری مدد کی تھی مگر وہ بھی برطانیہ کے خاص طرزِ ادا کا شکار تھیں۔ مجھے یاد ہے ایک دن لندن کے بیکرس سٹریٹ میں ڈاکرز ہڑتال پر تھے۔ اُس نے کہا۔ ''یہ جو ڈاکرز ہیں یہاں کے، اُن کو گولی مارنی چاہیے۔ مجھے کان کنوں کے ساتھ ہمدردی ہے، وہ جوز میں کے اندر کام کرتے ہیں۔[2] میں نے ہاں میں ہاں ملا تو دیا مگر اُسے کیا معلوم تھا کہ میں مارکس سے بہت متاثر ہوا

۱۔ میں جب انگلستان سے فارغ ہو کر کشمیر واپس آیا تو میں نے بھی ''عصر جدید کی تشخیص'' پر اپنے شاگردوں کے ساتھ کام کرنا شروع کیا۔ میں اساتذہ کو تیار کرنے کے لئے ایک بہت ہی کارآمد اور سودمند ماحول تیار کرتا تھا۔

۲۔ لندن میں میں ویلز کے ایک شخص ہاول جے مورث (Hwyel J Moris) کا دوست بن گیا۔ اس نے مجھے کرسمس کے موقع پر ویلز آنے کی دعوت دی جو میں نے خوشی سے قبول کی۔ اس سے ہمارے تعلقات اور اُستوار ہوئے۔ اُس کا باپ کانوں کا ایجنٹ تھا جو اچھا عہدہ تصور کیا جاتا ہے۔ میں اس کے پاس ہفتہ بھر ٹھہرا۔ اُنہوں نے مجھے کانوں کے اندر لے لیا جہاں میں نے (بقیہ اگلے صفحے پر)

تھا۔ ایک طرف یہ تو دوسری طرف میں سمیناروں میں حصہ لیتا تھا۔ یہ سمینار کیمبرج میں پڑھے لکھے لوگ منعقد کرتے تھے۔ میں نے موریس کارن فورتھ (Mauris Cornforth) جیسے دانشور کے چھ لیکچر سُنے تھے جو مادّی جدلیات (Dialectical Materialism) پر دئے گئے تھے۔ میں کوارٹرلی جرنلز اور سٹیٹسمین پڑھتا تھا۔ جامعہ میں تربیت پانے کی وجہ سے، ذاکر صاحب کی صحبت میں بیٹھ کر اور گاندھی جی کے زیر اثر اور اُس فکری سرمایہ کی وجہ سے جو مجھے حاصل ہوا تھا، میں ہر وقت اصولوں کے بندھنوں سے آزاد ہونا چاہتا اور ہر وقت نئے پن کی تلاش میں رہتا تھا۔ رالف رسل صاحب کے ساتھ میری کبھی کبھی بحثیں ہوتی تھیں۔ وہ بائیں بازو کی طرف میلان رکھتے تھے اس لئے کہ وہ غریب گھرانے میں پیدا ہوئے تھے اور انگلستان کے ورکنگ کلاس میں شامل تھے۔ مگر میں بھی اپنے آزادانہ خیال کا اظہار اس کے پاس کرتا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان خیالات سے بائیں بازو کی ترقی پسندانہ روش پر اثر پڑتا ہے تو وہ گرم گفتاری سے پیش آتے تھے۔ بعد میں جب وہ ۱۹۵۶ء میں کشمیر آئے، وہ کرشچیوف کی تقریر پڑھ چکے تھے۔ ایک اس کی وجہ سے اور دوسرے اُن مظالم کی وجہ سے جو مارکسی دنیا میں دیکھنے میں آتے تھے، وہ بھی دل برداشتہ ہوئے تھے۔ چنانچہ اُنہوں نے مجھ سے کہا کہ میرے آزادانہ خیالات صحیح ثابت ہوئے ہیں۔ رسل صاحب نے ایک دفعہ باتوں باتوں میں کہا کہ ایک دن وہ ہوسٹل میں کھانا کھا رہے تھے۔ گوشت سبزی کے ساتھ رَس تھا اور وہ پلیٹ سے روٹی کے ساتھ رس کھا رہے تھے۔ منتظمہ نے ان کے کھانے کی ادا پر اعتراض کیا بلکہ رسل صاحب کو ٹوکا کہ کھانا اس طرح

(گزشتہ سے پیوستہ) کان کنوں کی محنت کا بھی جائزہ لیا اور صنعتی نظام کے لئے ضروری چیزوں کا بھی اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا۔ ان کے گھر میں تاہم مجھے ایک بہت ہی ناپسند چیز کا تجربہ ہوا۔ مجھے پتہ چلا کہ ان کی ماں گھر کے سارے افراد کے جوتوں کی پالش کرتی ہے۔ باعزّت بوڑھی ماں کی پالش کرنا مجھے بہت بُرا لگا مگر ان کے یہاں نہ یہ ہتک آمیز ہے اور نہ معیوب۔ وہ کوئی بھی کام بُرا نہیں سمجھتے۔ جب میں واپس آیا تو ایک دن لندن میں پروفیسر لاریس کو سارا ماجرا سُنایا۔

نہیں کھاتے۔ یہ ہوسٹل اچھے گرامر سکول کا تھا جہاں رسل صاحب پڑھنے کیلئے گئے تھے۔ رسل صاحب نے کہا کہ وہ کبھی یہ نہ سمجھ پائے کہ اُن کو کیوں ٹوکا گیا تھا اور اُن کا قصور کیا تھا۔

انگلستان کے قیام کا اہم واقعہ وہ دن تھا جب میں تیسری دنیا کے نوجوانوں کے میلے (The Third World Youth Festival) میں شرکت کرنے کے لئے جرمنی چلا گیا۔[1] اگرچہ ہندوستان کے ہائی کمیشن نے وہاں جانے میں رُکاوٹ پیدا کی، مگر میں نے فیصلہ کیا کہ میں جاؤں گا۔ رُکاوٹ اس لئے پیدا کی گئی تھی کہ اجلاس کمیونسٹوں کا تھا، اس لئے مشرقی جرمنی جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ آخری وقت پر ہمیں بتایا گیا کہ ہم مغربی جرمنی سے نہیں جاسکتے مگر سٹالن نے ایس، ایس، بے ٹری (S.S.Batory) جہاز ڈن کرک (Dunkirk) بھیجا۔ ڈن کرک بلونگ (Balogne) کے نزدیک ہے۔ جہاز انگلستان میں بنا تھا مگر تھا شاندار۔ جب بندرگاہ پر پہنچا تو گودی والوں (Dockers) نے جھنڈیاں ہلا ہلا کر اس کا استقبال کیا۔ ہم جہاز پر چڑھے تو آدھ گھنٹے کے اندر اندر ناشتہ آیا۔ ہم سب بھوکے تھے، انگریز، ہندوستانی، سب! ہمارے ٹوسٹوں میں دو دو انڈے بھرے تھے حالانکہ انگلستان میں ہفتے میں صرف ایک انڈا ملتا تھا۔ ایک انگریز نے کارن فلیک جیسا دوسرا بسکٹ منگایا۔ کارن فلیک تو اندر بھرے پڑے تھے مگر مانگنا بڑی چیز تھی۔ اُس جہاز میں سفر کرنا کتنی اچھی بات تھی۔ جہاز سے ڈنمارک کا کرون برگ (Kronberg) نظر آتا تھا۔ ہم ڈین زی (Denzig) کی بندرگاہ پر اُتر آئے۔ وہاں سے مشرقی برلن پہنچنے میں چوبیس گھنٹے لگ گئے۔ ہم تقریباً ایک ہزار لوگ تھے، ہندوستانی، برطانوی، امریکی۔ اُن دنوں کمیونسٹ

۱۔ میں نے کیمبرج میں داؤد رہبر صاحب کے برادر محمد یعقوب سے بیس پونڈ اُدھار لئے تھے۔ بیس سال کے بعد جب وہ امریکہ سے کشمیر آئے۔ میں نے وہ بیس پونڈ ہندوستانی پیسے کی صورت میں واپس کئے۔ یعقوب صاحب امریکہ میں پروفیسر تھے۔ میں نے اس کے علاوہ لبرٹی دوکان کو اپنی گھر والی کی دو ساڑھیاں بیچ دی تھیں۔ اُنہوں نے کل چالیس پونڈ دئے تھے۔ ساٹھ پونڈ جیب میں رکھ کر میں نے اپنی گھر والی کو بھی جرمنی اپنے ساتھ لے لیا۔

تحریکیں جگہ جگہ چل رہی تھیں۔ فرانس کے مزدور بھی جاگ اُٹھے تھے۔ جب ہم پہنچ گئے تو مختلف النوع پروگرام شروع ہوئے۔ وہاں مختلف قسم کے ہال تھے جن میں لوگوں کی تفریح کیلئے مختلف قسم کے پروگرام ہوتے تھے۔ ان میں موسیقی، ناچ اور سرکس شامل ہے۔ ایک دن ہم کو شام کے وقت مدعو کیا گیا اور ہمیں روس کا سب سے مقبول ناچ سوان لیک بے لے (Swan Lake Ballet) دکھایا گیا جس میں مشہور ڈانسر (Galina Ulanova) نے ناچ کے کرتب دکھائے۔ ہم بہت محظوظ ہوئے۔ مختلف سفارت خانوں کی طرف سے بھی ہم کو مدعو کیا گیا۔ ہم نے کیا کیا کھانے کھائے اور چائے کے ساتھ لیمو اور دوسری چیزیں۔ سب سے زیادہ دل چسپ مگر مضحکہ خیز وہ امر تھا جب ہر شو کے اختتام پر سب لوگ کھڑے ہو جاتے تھے اور ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر زور سے "لینن، سٹالن، ماؤ" منٹوں تک پاگلوں کی طرح چلاتے تھے۔ یہ بھی اُس زمانے میں کمیونزم کا ایک رُخ تھا۔ انگریز بھی وہاں موجود ہوتے تھے، سنتے تھے اور ہاں ہاں بولتے تھے۔ وہ حظ اٹھاتے تھے۔ ہم تقریب دیکھ کر جوش میں آ گئے تھے۔ سوچتے تھے کہ دنیا بدل رہی ہے۔ ورلڈ فیڈریشن آف دی ڈیموکریٹک یوتھ نے ایک ترانہ بنایا تھا۔ ہر جگہ جوان گاتے تھے "دکتی گھان، ہم ہیں جوان"۔ یہ ترانہ پچاس زبانوں میں جگہ جگہ ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر گایا جاتا تھا۔ انگریزی میں، جرمن زبان میں، ہندوستانی میں، وغیرہ وغیرہ۔ ہر جگہ عجیب جوش تھا اُن دنوں۔[1] برلن یوتھ فیسٹول میں جانا کتنا اچھا لگا تھا۔ اُس وقت میں نے لینن کا مطالعہ کیا تھا، فیض احمد فیض کو بھی پڑھا تھا۔ پندرہ دن ہم نے نہایت شاندار طریقے سے گزارے تھے اور انگلستان واپس آئے تھے۔

جب میں واپس آیا تو جاڈین (Jardine) بہت حیران ہوئے۔ جعفری جاز ڈین نے کہا کہ مجھے ان کی میٹنگ میں سوئزر لینڈ بھی جانا چاہیے۔ گو کہ میٹنگ کا مدّعا تھا اخلاق کا

۱۔ میں کتنا سادہ لوح تھا۔ جب شیر کشمیر پولوگراؤنڈ میں جسمانی کرتب دیکھنے آتے تھے تو میں بھی یہ ترانہ "ہم نوجوان ہیں، ہم آزادی کا ترانہ گاتے ہیں" گواتا تھا۔

سُدھار یعنی (Moral rearmament) مگر اصلی مقصد تھا کہ کمیونسٹوں کے اثر کو ختم کیا جائے۔ جارڈین نے انتظام کیا اور میں سوئزر لینڈ چلا گیا۔ وہاں میرے لئے گرینڈ ہوٹل میں ٹھہرنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ میں ڈکوٹا میں سوئزر لینڈ چلا گیا اور جینیوا کی موہنے والی جھیل لیک لے مُن (Lake Lemon) کے ساتھ ہی ہوٹل میں ٹھہرا۔ یہ ہوٹل پہاڑی پر واقع تھا۔ حیران کن بات تھی کہ ایک طرف مشرقی برلن میں یوتھ فیسٹول میں شریک ہوا تھا اور دوسری طرف اخلاقی سدھار (Moral Rearmament) کی میٹنگ میں شرکت کے لئے جینیوا آیا تھا۔ سفر کے دوران میں نے سوئزر لینڈ کی ایک خاتون کے ساتھ دوستانہ تعلقات پیدا کئے۔ وہ ایک سکنڈری سکول کی سیکریٹری تھی۔ میں نے میٹنگ کے منتظمین کو کہا کہ میں اُس سے ملوں گا۔ اُنہوں نے پہلے مانا نہیں مگر میں نے جب اصرار کیا تو انہوں نے کہا کہ شام کے وقت موٹر مل سکتی ہے۔ میں نے کہا میں ریل گاڑی میں جاؤنگا۔ اتنے میں موٹر آئی اور انہوں نے مجھے لوسن Lausanne پہنچایا جہاں میں اُن ماں بیٹی سے ملا۔ میں وہاں رات بھر کیلئے ٹھہرا اور گھڑی گھڑی مغربی موسیقی سے متعارف ہوا جس میں یونانی موسیقی کے عنصر بھی شامل تھے۔ جعفری گارڈین نے مجھے Peer Gynt Suite سنایا تھا جو ناروے کے موسیقار ایڈورڈ گریگ کی ایجاد تھی۔

اخلاقی سدھار میٹنگ میں شریک لوگ سادہ لوح تھے، محض سادہ لوح۔ وہ اچانک رُک جاتے اور کہتے ''اب ہم خاموش رہیں گے۔ من میں ڈوبیں گے اور مسئلے کا حال تلاش کریں گے''۔ بین الاقوامی سطح پر میٹنگ اور یہ حال۔ مجھے کسی مسئلے پر سوچنا ہی نہیں تھا۔ آخری سیشن میں میں نے بحث میں حصہ لیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرا خاصا اثر کانفرنس پر پڑ گیا۔ جب آخری دن میں نے اُن سے جانے کی اجازت مانگی، اُنہوں نے انکار کیا۔ کہا کہ اٹلی کی شہزادی آج میرے ساتھ بیٹھے گی۔ میرا خیال ہے کہ وہ میرا سوچ بدل ڈالنے کی کوشش کرتے تھے۔ ہم ایک ایسی جگہ پر بیٹھ گئے جہاں ایک زمانے میں راجے، مہاراجے

اور شہزادے بیٹھتے تھے مگر اب وہی جگہ کمیونسٹوں کے خلاف مرکز بن گئی تھی۔ ہماری سیدھ میں جینوا کی جھیل تھی۔ وہاں ہر ایک کو ڈر تھا کہ سٹالن اطلانٹک کے ساحل تک فوج کشی کریگا۔ آخری دن انہوں نے مجھے پھر تقریر کرنے کی دعوت دی۔ مجھے معلوم نہیں کہ میں نے گاندھی جی کو اپنی تقریر کا محور کیوں بنایا۔ میں نے ایک کہانی بتائی جو عابد حسین صاحب گاندھی کی سنجیدگی اور کلاسیکی سادگی کے بارے میں بولتے تھے۔ یہ سادگی میں نے گاندھی کی ذات میں اُس دن پائی تھی جب وہ ۱۹۴۷ء کی آفت کے دوران جامعہ آئے تھے۔ کہانی کا نفس مضمون یہ تھا۔ ایک دفعہ ایک مزہ چش تھا، اپنے کام میں آزمودہ کار۔ مزہ چش بڑے بڑے ہوٹلوں اور ریستورانوں میں عمدہ اور ناکارہ شراب چکھنے کیلئے رکھے جاتے ہیں۔ یہ مزہ چش اتنا تجربہ کار تھا کہ صرف دو تین بوندیں شراب چکھ کر بتا سکتا تھا کہ شراب کس قسم کی ہے اور کتنی دیرینہ۔ اُس کے ایک دوست نے ایک دن اس کے ساتھ مذاق کیا۔ اُس نے ایک عجیب سیّال چیز اُسے پہنچاننے کیلئے دیدی۔ پہلی دفعہ اُس نے معمول سے زیادہ سیّال چیز کی بوندیں لے لیں اور پھر لیں یہاں تک کہ اُس کی زندگی کا جمع کیا ہوا تجربہ ہار گیا۔ اُس نے کبھی پانی چکھا نہیں تھا اس لئے وہ اس سیّال چیز کو پہچان نہ سکا۔ عابد حسین صاحب یہ کہانی اس لئے دہراتے تھے کہ جو لوگ تحلیل نفسی (Psychoanalysis) کے ذریعے انسان کے اندرون کی پیچا پیچ حالت کا پتہ لگانے کی کوشش کرتے ہیں، اسی مزہ چش کی طرح سادہ لوح اور نیک باطن کا اندازہ لگانے میں کامیاب نہیں ہوتے۔ کہانی کے بعد میں نے اپنی تقریر میں کہا" آپ نے ہماری مہمان نوازی اٹلی کے غذاؤں سے کی۔ آپ نے بہت خوبصورت چیزیں ہمیں دکھائیں اور امارت کے نمونے۔ آپ نے بقول اخلاقی سدھار (Moral rearmament) کے پریذیڈنٹ کے ہمارے ساتھ اچھا سلوک کیا اور اپنے راز ہمارے ساتھ بانٹے۔ آپ کے ہاں امریکیوں کی طرح سب چیزیں مہیا ہیں۔ امریکہ میں گائے اٹھارہ مہینوں تک پچیس لٹر دُودھ دیتی رہتی ہے۔ ہندوستان میں سب سے زیادہ

مویشی ہیں۔ گائے اوسطاً آدھ لٹر دودھ دیتی ہے۔ ہندوستان کے بچے دُودھ کیلئے ترستے ہیں۔ اس لئے راز بانٹنا اچھا سلوک کرنا، مہمان نوازی کرنا ہندوستان کو زیادہ متاثر نہیں کرسکتا۔ یہ سُن کر اُنہوں نے مجھے اپنے حال پر چھوڑ دیا کیونکہ اُنہوں نے سمجھا کہ میرا ذہن کن چیزوں کی طرف مائل ہے۔ مجھے بھی وہاں خاموش بیٹھنے اور الہام کے آنے کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس لئے میں رخصت ہوا۔ واپس آکر مجھے معلوم ہوا کہ برلن میں میرے ساتھ جو لوگ یوتھ فیسٹول میں شرکت کرنے آئے تھے اُن کو میرے سوئزرلینڈ جانے سے صدمہ ہوا تھا۔ میری گھر والی بھی اُن میں شامل تھی۔ تاہم سوئزرلینڈ جا کر مجھے ایک نیا تجربہ حاصل ہوا تھا گو کہ یہ تجربہ عجیب سا تجربہ تھا۔

اسی دوران جموں و کشمیر کی حکومت نے مجھے مشورہ دیا کہ میں لندن یونیورسٹی میں اپنا تعلیمی کام جاری نہ رکھوں۔ چونکہ میرا معاملہ تعلیمی انتظام کے ساتھ تھا، مجھے کہا گیا کہ میں دوسرا سال یورپ کے دورے میں گذاروں اور ان کے تعلیمی نظام دیکھوں۔ پروفیسر لاریس Lauwerys نے میرا سفرنامہ تیار کیا اور مجھے مشورہ دیا کہ میں جرمنی، فرانس، سوئزرلینڈ، ڈنمارک اور سویڈن جاؤں۔ میں نے قناعت سے پیسہ خرچ کیا تاکہ کچھ پیسہ بچا سکوں، گھر والی کو فرانس ہفتہ بھر کے لئے لے سکوں اور بچوں کو مسز ہال Mrs Hall کے پاس رکھ چھوڑوں جو ایک چھوٹے مکان میں ہمارا دیکھ بال کر رہی تھی اور ہمیں آرام پہنچا رہی تھی۔ وہ فرانس کی رہنے والی تھی جس نے انگریز کے ساتھ بیاہ کیا تھا۔ پیرس میں میرے ٹھہرنے کا انتظام لندن یونیورسٹی نے کیا تھا۔ ہمیں سیور Sevres میں مادام پامپیڈور Pompadour کے محل میں ٹھہرایا گیا تھا۔ یہ بہت بڑا محل تعلیم کا بین الاقوامی سنٹر بن گیا تھا۔ اس کی ڈائریکٹر مادام ہاتھنگوے (Hathingais) تھی جو ممتاز ماہر تعلیم تھی۔ یہاں سے ہمیں مختلف سکولوں اور کسبی (Vocational) سنٹروں میں لیا گیا۔ مجھے دکھایا گیا کہ جنگ عظیم کے بعد فرانس کی تعلیم کے مسائل کیا تھے۔ اُنہوں نے مجھے بتایا کہ وہ فرانس کے نظام

تعلیم کو جمہوری طریقوں سے کیسے بحال کرنا چاہتے ہیں۔ فرانس اور انگلستان جنگ سے قتل گاہ بن گئے تھے۔ اس لئے تعلیم کو از سرِ نو بحال کرنے کی سخت ضرورت تھی۔[1] انہوں نے پال لاجواں (Paul Langevin) ایک تعلیمی کمیشن بنایا تھا۔ لاجوان بڑا عالم تھا۔ شاید علم کیمیا میں اُسے خاصی مہارت حاصل تھی۔ لاجواں رپورٹ یورپ کے دل میں بیٹھ گیا تھا۔ اس میں ایک بنیادی نکتہ تھا کہ کسی بھی تعلیمی نظام کی احیاء کا بنیادی نکتہ انصاف ہونا چاہیے۔ کوشش کی جانی چاہیے کہ عام انسان ترقی کر سکے مگر ساتھ ساتھ قابلیت کا بھی بول بالا ہو۔ ایسا مگر ہوا نہیں۔ اس رپورٹ کے بنانے میں نفسیاتی اور عمرانی حقائق کو سامنے رکھا گیا تھا تاکہ تعلیم کو بڑھاوا مل سکے۔ مجھے ابھی بھی یاد ہے کہ اُنہوں نے کہا تھا کہ بچہ گیارہ سال کی عمر میں جونہی بنیادی تعلیم سے فارغ ہو جائے، دو سال تک اُس پر نگاہ رکھنی چاہیے کہ اس کا رجحان کیا ہے اور زندگی میں عمل پیرا ہونے کے لئے اس کی صلاحیت یا صلاحیتیں کیا ہیں۔ کیا بچہ ہاتھ کا کام کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے یا ذہنی یا جمالیاتی یا اور کوئی خاص قابلیت اُس کے اندر نمایاں طور پر موجود ہے۔ تیرہ سال کی عمر میں (یعنی دو سال کے مشاہدے کے بعد) اس صلاحیت کی طرف زیادہ دھیان دینا چاہیے۔ مگر امکان ہے کہ پندرہ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے رجحان بدل جائے۔ پس اسی وقت فیصلہ ہونا چاہیے کہ بچہ کہاں یا کس طرف جا رہا ہے۔ اس عمر میں بچے کا خود بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔

ہفتہ بھر میں اور میری گھر والی فرانس میں رہے اور خوش گذران۔ ہم سکولوں میں گئے، پیرس کی نفیس نفیس جگہیں دیکھیں، نپولین کا مقبرہ دیکھا[2]، نمائشیں دیکھیں، میوزیم دیکھے، فرانس کے مشہور میوزیم۔ برٹش میوزیم فرانس کے بڑے میوزیم کے مقابلے میں بہت

۱۔ جے، پی، پریسٹلے کے ناولوں میں اس حالت کا اچھا خاصا عکس ملتا ہے جو قابلِ تحسین ہے۔

۲۔ نپولین ایک زمانے میں میرا ہیرو تھا۔

معمولی چیز لگتا ہے۔ یہ بڑا میوزیم پیرس میں ہے۔ اب مجھے یاد نہیں، شاید یہ بڑے گرجے کے پہلو میں ہے۔ اگر ہم بڑی سیڑھی پر چڑھیں تو بائیں طرف ہمیں Victory of Samothrace کا مجسمہ ملیگا۔ ہم وہاں دو دفعہ گئے اور ہمارے تصورات پر جادو چھا گیا۔ فرانس کا کھانا بھی ہمیں بہت عمدہ لگا۔

فرانس کے بعد میں سوئزرلینڈ چلا گیا[1] اور میری گھر والی واپس انگلستان آ گئی۔ وہاں بچے اُس کا انتظار کر رہے تھے۔ سوئزرلینڈ میں میں نے دیہاتی سکول دیکھے۔ یہ سکول ذرا دور دور تھے اور بچے دور سے بھی سکول آتے تھے۔ گو کہ بچے گرم کپڑے پہن کر آتے تھے، تاہم سکولوں میں گرمی کا انتظام تھا۔ معلوم نہیں کمرے گرم رکھنے کیلئے لکڑی استعمال ہوتی تھی یا کوئلہ مگر کمروں کے اندر خاصی اچھی گرمی ہوتی تھی۔ بچے برف کے اوپر کھیلتے تھے یعنی سکی انگ (Skiing) کرتے تھے۔ پرائمری سکول میں ایک ہی اُستاد کام کرتا تھا۔ اکیلا ہوتے ہوئے بھی یہ اُستاد اچھا کام کرتا تھا۔ سوئزرلینڈ گو کہ جگہ جگہ صاف تھا اور ہر جگہ صفائی کا انتظام تھا، پھر بھی ٹی بی بڑے پیمانے پر پھیلا تھا۔ گاڑیاں اچھی طرح چلتی تھیں۔ خوراک بہت عمدہ تھی۔ کالج کلاسیک کی سیکریٹری میرے اوپر مہربان ہو گئیں۔ وہ درویش صفت خاتون تھی اور گاندھی ٹیگور اور رومین رولان سے واقف تھی۔ اس دوست خاتون نے مجھے جھیل کے کنارے اپنا سکول بھی دکھایا۔

سوئزرلینڈ سے میں آسٹریا کے راستے جرمنی پہنچا۔ وہاں جو تجربات حاصل ہوئے وہ دلچسپ تھے، خاص کر وہ جو سپلانگر کے ساتھ ملاقات سے حاصل ہوئے۔[2] بواں میں انسپکٹر آف سکولز نے مجھے ایک مدرسہ دکھانے کیلئے اپنے ساتھ لیا۔ جب ہم وہاں پہنچے، میں نے دیکھا کہ مدرسہ ہی کہیں نہیں۔ زمین تقریباً مسطح تھی۔ مگر انسپکٹر صاحب نے تہہ خانہ دکھایا

۱۔ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میں اخلاقیات کے سُدھار کی میٹنگ میں شرکت کرنے کیلئے سوئزرلینڈ چلا گیا تھا۔ اس لئے اس ملک کا یہ دوسرا دورہ تھا۔ اس دورے کا سکوپ وسیع تھا اور اس کا محض تعلیمی۔

۲۔ میں اُس سے ملنے کیلئے Tubingan میں ٹھہرا تھا۔

جہاں بچے تھے اور جنہیں پڑھایا جاتا تھا۔ میں نے انسپکٹر صاحب سے کہا کہ مجھے اتنی تباہی دیکھ کر افسوس ہوا ہے۔ اُس نے کہا کہ تباہی کے بعد جرمن جو بھی بناتے ہیں، اچھا بناتے ہیں اور بہتر۔ مگر میں نے برلن، کلون اور سٹرٹ گارٹ Stuttgart کی تباہی بھی دیکھی اور دیکھا کہ جرمن وہاں کیا تعمیر کر رہے ہیں۔ وہ ساری تصویریں ابھی تک میرے ذہن میں موجود ہیں۔ جرمنی میں مجھے ایک عجیب سے آدمی نے دوست بنایا، اپنے گھر لے لیا اور وہاں دو دن ٹھہرایا۔ اس کے ہاں خوبصورت سا باغ تھا۔ میں جب باغ میں اوپر نیچے کر رہا تھا تو میں نے باغ کے کنارے میں ایک گھری ہوئی جگہ دیکھی۔ نزدیک گیا تو اس کے اندر ایک گدھے کو پایا۔ وہ شخص میرے پاس دوڑتے دوڑتے آیا اور میں نے اس کے ساتھ مذاق کئے۔ میں نے گدھے کے اوپر اپنی باہیں ڈال دیں تو اُس شخص نے میری تصویر کھینچی۔ یہ تصویر ابھی بھی میرے پاس موجود ہے۔ ایسا لگا کہ جرمنی کے لوگ تباہی کے باوجود زندہ دل ہیں اور دوست پرور۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔

ڈنمارک دیہاتی ملک ہے اس لئے میں دلچسپی سے وہاں حالاتِ زندگی کا مشاہدہ کرتا رہا اور اپنے تجربات میں اضافہ کرتا رہا۔ دیہاتیوں کو تعلیم دینا اور جدیدیت کی طرف ان کی راہنمائی کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ بازاروں میں ڈنمارک کے دیہاتی بے کار رہتے تھے مگر انہوں نے عوامی سکولوں کیلئے تعمیری قدم اُٹھائے تھے۔ یہ بہت نئی چیز تھی۔ ان مدرسوں میں لوگ جاڑوں میں آتے، ٹھہر جاتے، بات چیت کرتے، تقریریں سنتے کہ کس طرح زراعت کو بڑھاوا دیا جائے اور اس طرح زندگی کی ہمہ گیر ترقی کیلئے بنیادی کام کیا جائے۔ وہ لوگ اپنے رہائشی مکانوں کو بہتر بنانے کے بارے میں بھی سوچتے تھے۔ میں اپنے مشاہدات سے متعلق خاص خاص باتیں ڈائری میں درج کرتا تھا۔ وہ اندراجات ابھی بھی میرے پاس موجود ہیں۔ جس طرح ڈنمارک میں تعلیم کو زندگی کے ساتھ مربوط کیا جا رہا تھا اور اس سے زندگی کو بڑھاوا دینے کا کام لیا جا رہا تھا، میں بھی سوچتا رہتا تھا کہ کس طرح ہم

بھی کشمیر میں ڈنمارک کے تجربے سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں کیونکہ ہماری ریاست بھی بنیادی طور پر زراعتی ریاست ہے۔ میں یہ بھی سوچتا تھا کہ نیا کشمیر کے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کیلئے ہمیں بھی تعلیم کو خاص کر زراعت اور اس کے مختلف شعبوں کے ساتھ جوڑنا چاہیے۔

ڈنمارک کے بعد میں سویڈن چلا گیا۔ وہاں میں نے سکنسین ہوم (Skansen) دیکھا۔ اس میں سترہویں اور اٹھارہویں صدی کی زندگی کے آثار رکھے گئے تھے۔ وہ یعنی سویڈن کے لوگ ہوم دیکھنے والوں کو اپنے ماضی میں لے جاتے تھے تاکہ مشاہدہ کرنے والوں کو اندازہ لگ جائے کہ سویڈن کون سی جگہ ہے اور وہاں ترقی کی رفتار کیا ہے۔ ہوم کے ساتھ ایک چڑیا گھر تھا جس میں ہم نے قطبی ریچھ (Polar bear) دیکھا جو بہت آرام سے بیٹھا ہوا تھا۔ پاس ہی ایک اچھا سا تھیٹر تھا۔ سویڈن کے سکول غضب کے سکول تھے، بہت اچھے۔ ڈنمارک اور سویڈن کے مدرسوں کی خاص بات یہ تھی کہ اُن میں دوپہر کا کھانا مہیا کیا جاتا تھا۔ دوپہر کی غذا میں دودھ اور مکھن کافی مقدار میں موجود ہوتا تھا۔ آس پاس میں دانتوں کے دو یا تین معالج بھی ہوتے تھے جس سے پتہ چلتا تھا کہ وہاں لوگوں کو دانتوں کی صحت کا خاصا خیال رکھنا پڑتا تھا۔ بچوں کیلئے دوپہر کے کھانے کی غیر معمولی اہمیت ہے اور اس اہمیت کا احساس ان ملکوں میں تعلیم کے ساتھ ساتھ پیدا ہو گیا تھا۔ سویڈن کے لوگوں کے ثانوی مدارس (Secondary Schools) بھی خاصے اچھے ہی نہیں بلکہ شاندار تھے۔ کوئی بھی طالب علم پرائمری سکول سے ہائی سکول میں نہیں جا سکتا تھا اگر وہ باضابطہ طور پر تین غیر ملکی زبانیں درس کیلئے نہیں چُنتا۔ ہائی سکول چونکہ علمی ادارے تھے اس لئے یہ زبانیں ضروری یا لازمی تصور کی گئی تھیں۔ ان کے ذریعے ہی معلوم کیا جا سکتا تھا کہ دنیائے علم میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ یورپ کی یہ نئی بستیاں (ڈنمارک، سویڈن وغیرہ) اس کے باوجود اپنی زبان سے شروع کرتے تھے جو آگے بھی ساتھ ساتھ جاتی تھی۔ بعد میں تقابلی تعلیم کے ذریعے مجھے معلوم ہوا کہ وہ کئی زبانوں کو ایک ہی رسم الخط میں پڑھ سکتے تھے

اس لئے کئی ایک زبانیں سیکھنے میں اُنہیں سہولت آتی تھی[1]۔ سویڈن میں مجھے عمر رسیدہ لوگوں کے ہومز (Old age Homes) بھی دکھائے گئے جہاں ۷۰ سے ۷۵ سال کے عمر رسیدہ لوگ مرد اور عورتیں رہتی تھیں۔ عمر رسیدہ مرد عورتیں دوستوں کی طرح اکٹھے بیٹھتے تھے اور چائے وغیرہ پیتے تھے۔ مردوں کے لئے رسوئی کا انتظام بھی ہوتا تھا جس میں عجیب سی روشنی کا انتظام ہوتا تھا۔ جب بتی جلائی جاتی تھی تو عجیب سی روشنی پھیل جاتی۔ اگر مرد باہر جاتا تو بتی بجھاتا۔ غسل خانے میں زائد گھنٹی ہوتی تھی۔ اگر کسی شخص کو کوئی تکلیف پیدا ہو جاتی یا کوئی مسئلہ پیش آتا تو وہ گھنٹی دبا کر اس طرح امداد طلب کر سکتا۔ ۵۰۔۱۹۵۱ء کے زمانے میں بھی سویڈن میں ایسے ہومز (Homes) تھے۔ سویڈن میں سڑکوں پر زیادہ شور وغل نہیں ہوتا تھا۔ نہ وہاں لوگوں کی بھیڑ ہوتی تھی اور نہ زیادہ موٹریں چلتی تھیں۔ تاہم بجلی پر چلنے والی بسوں اور ریلوں کا خاصا انتظام ہوتا تھا۔ سویڈن اور ڈنمارک جیسے ملکوں میں سماجی جمہوریت (Social Democracy) دیکھی جا سکتی تھی۔ یہاں حقیقی رنگ میں مواقع میسر ہوئے تھے۔ کوئی بیمار ہو جاتا یا درد میں مبتلا تو اُسے فوراً طبی امداد بہم پہنچائی جاتی تھی۔ جو لوگ صنعت میں کام کرتے تھے، وہ لوگوں کی خدمت کرتے تھے۔ اچھی صحت کیلئے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی تھی، ان کی طرف بھی یہ لوگ توجہ دیتے تھے۔ میں جون جولائی میں یورپ کا دورہ ختم کر کے انگلستان واپس آیا اور لندن۔ اُسی سال بعد میں میں یورپ میں تعلیم و تربیت کا پروگرام مکمل کر کے گھر واپس آ گیا۔ ہمارا سفر یا تو ریل میں گذرا یا آبی جہاز میں۔

۱۔ لاہور کا ایک دانشور سوم ناتھ چھ جب لندن یونیورسٹی میں تقابلی تعلیم (Comparative Education) پر لیکچر دینے آیا تو اس سے پوچھا گیا کہ آپ ایک ہی رسم الخط میں ایک سے زیادہ زبانیں کیوں نہیں سیکھ سکتے، یعنی رومن رسم الخط میں۔ اُس نے کہا کہ وہ جس ملک میں رہتا ہے وہاں ابھی یہ فیصلہ بھی ہو نہیں پاتا کہ حیوان کے گلے پر ایک ہی دفعہ چھری مارنی چاہیے یا چند ایک بار۔ وہاں زبان یا زبان کے لئے رسم الخط کا معاملہ کیسے حل ہو سکتا ہے۔ سوم ناتھ جی سیاحت میں کام کرتے تھے۔

۱۹۶۰ء میں میں فل برایٹ (full bright) پر امریکہ چلا گیا۔ مغربی دنیا میں جانے کا اور وہاں کے علمی سرچشموں سے فیضیاب ہونے کا میرے لئے یہ دوسرا موقعہ تھا۔ بخشی غلام محمد مرحوم کے عہد حکومت میں منسٹروں اور دیگر کئی قسم کے لوگوں سے مجھے ناپسندیدہ تجربات حاصل ہوئے تھے جن کا ذکر میں نے کہیں اور کیا ہے۔ بخشی صاحب نہایت ہی قابل اور باہمت منتظم تھے مگر اُن کی شخصیت کے کئی رنگ تھے۔ میں چاہتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح کشمیر کے نامساعد حالات سے نکل کر باہر چلا جاؤں۔ فیضی صاحب کی عنایت سے مجھے موقع مل ہی گیا۔ فیضی صاحب عالم و فاضل شخص تھے اور میرے قریب علم و ادب کی اساس پر ہی آئے تھے۔ وہ میرے گھر تشریف لاتے اور ہم اکٹھے کھانا کھاتے اور زندگی کے نت نئے مسائل اور تجربات پر باتیں کرتے۔ وہ میری فکری اور جذباتی طبیعت سے واقف ہو گئے تھے اس لئے اُنہوں نے ایک دن مجھے مصر کی ایک خطّاطی (Calligraphy) بھی عنایت کی جس پر ایک قرآنی آیت لکھی ہوئی تھی، نصر من اللہ و فتح قریب۔ آیت کے معانی حوصلہ افزاء تھے ہی مگر خطاطی کا حُسن بھی کچھ کم روح افزا نہیں تھا۔ اُنہوں نے آلیور یڈک کو لکھا کہ مجھے امریکہ فُل برائٹ پر بھیج دیا جائے۔ اُن کی تجویز منظور ہوئی اور مجھے چھ مہینے کیلئے فُل برائٹ ملا۔ میں امریکہ چلا گیا اور وہاں زندگی کے پانچ شاندار سال گزارے۔ میرا ادارہ کار اُستاد کی نشوونما (Teacher Development) تھا۔ ۱۹۶۰ء کی گرمیوں کا موسم تھا کہ میں سمندری جہاز میں امریکہ روانہ ہوا۔ جہاز نیا تھا۔ میں بمبئی میں طیّب جی کے گھرانے کے چند افراد اور فیضی صاحب سے ملا۔ یہ میرا پہلا امریکہ کا سفر تھا۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ میں کیا محسوس کر رہا تھا۔ اتنا تو کہہ سکتا ہوں کہ میں کشمیر کی گھٹن سے آزاد ہوا تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ کشمیر کی تعلیم پر سیاست کا کافی دباؤ ہے۔ سیاست نے یونیورسٹی اور دوسرے تعلیمی اداروں کی خودمختاری پر قبضہ جمانا شروع کیا تھا۔ اُستادوں کی تقرّری پر بھی اس کے منحوس سایے پڑ گئے تھے۔ بہت سارے اُستاد اور کالجوں کے لیکچرر گندی سیاست سے ہاتھ

دھونے لگے تھے۔ یہ حال بیسوی صدی کی پانچویں دہائی کا تھا۔ میں نے اس لئے سمجھ لیا کہ ان حالات سے دُور رہنا بہتر ہے۔ میں جب امریکہ پہنچا تو تین مہینے ایک ادارے میں ٹھہرا اور باقی تین مہینے مشرقی ساحل سے مغربی ساحل تک گھومتے گھامتے گذارے۔ ان چھ مہینوں کے بارے میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ میں فُل برائٹ لیکر کسی خاص یونیورسٹی کے لئے نہیں گیا تھا۔ کشمیر میں میں ٹیچرس کالج میں کام کر رہا تھا اس لئے میں کئی اور لوگوں کے ساتھ منسی انڈیانا (Muncie Indiana) کے ٹیچرس کالج میں تین مہینوں کے لئے ٹھہرا۔ باقی تین مہینے ہم سفر کرتے رہے۔ میں پروگرام سے کسی نہ کسی طرح کھسک جاتا تھا اور دوسرے احباب سے ملتا تھا۔ کچھ واقعات اُن دنوں کے ضرور کہوں گا۔ میں جب واشنگٹن پہنچ گیا، میں نے اپنا پروگرام بھول ڈالا اور کانگریس کی لائبریری میں چلا گیا۔ وہاں سے کئی ایک کتابیں اُٹھالایا جو یہاں کشمیر میں نایاب تھیں۔ مثلاً البیرونی کی کتاب ''الہند'' اور لارنس کی کتاب ''دی ویلی آف کشمیر''۔ میں جامعہ کے دنوں کے ایک شخص اسماعیل سے ملا۔ وہ اُن دنوں جامعہ میں پڑھتے تھے اور میرے شاگرد تھے۔ اسماعیل صاحب یہاں کانگریس لائبریری میں کام کر رہے تھے اور ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمے کے کام پر فائز تھے۔ وہ مجھے گھومنے پھرنے لے جاتے تھے۔ یہ وہ دن تھے جب مشینوں کی برکت سے کوک (Coke) کی بوتل ۵ سے ۱۰ سینٹ (Cent) میں ملتی تھی۔ اسماعیل صاحب نے ایک امریکی لڑکی کے ساتھ ناطہ جوڑا تھا اور خوشی سے زندگی گذارتے تھے۔ امریکہ میں اس کی انگریزی بہت سُدھر گئی تھی اور اس کے ذہن نے بھی بہتر طریقے پر کام کرنا شروع کیا تھا۔ وہ امریکہ میں ترجمے کے علاوہ ذاکر حسین اور رابندر ناتھ ٹیگور پر تقابلی کام کر رہے تھے۔ اُن دنوں سیّدین صاحب امریکہ آئے تھے اور ایک گھرانے میں شام کی ضیافت پر مدعو ہوئے تھے۔ ہم بھی اُن سے ملے۔ اُنہوں نے اسماعیل سے کہا کہ وہ افلاطوں کو تقابلی جائزے کے لئے کیوں نہیں چُنتے۔

دوسرا واقعہ تھا میرا گیری انڈیانا Gary Indiana کا دورہ۔ وہاں ہم ایک بڑے ہال میں داخل ہوئے جو یا تو کسی کالج کا ہال تھا یا ہائر سکنڈری سکول کا۔ ہم میں سے چند ایک کو دعوت دی گئی کہ ہم اپنے ممالک پر تقریر کریں۔ تقریروں کا دور چلا تو ہم انتظار کرنے لگے اُس جگہ پر جانے کیلئے جہاں وہ ہمیں لے جا رہے تھے۔ ایک آدمی ہمارے پاس آیا اور کہنے لگا کہ جو لوگ ہمارے ساتھ شام گذارنا چاہیں وہ اپنے نام دیں۔ میں نے ایک میکسیکو کی خاتون، ایک پاکستانی اور ایک ایرانی کا نام دیا۔ میں نے شکاگو کے غنڈوں کے بارے میں سنا تھا مگر اس کے باوجود ہم چلے۔ ہم ایک یہودی کے گھر پہنچے جو پولینڈ کی نسل تھا۔ اس کا نام چارلس لیزروٹس (Charles Lazerwitz) تھا مگر مختصر نام صرف چیک۔ اُس کا گھر ایک پہاڑ پر تھا۔ برف گر رہی تھی۔ جب وہ پہاڑی پر چڑھ رہا تھا، میں سوچ رہا تھا وہ کس طرح موٹر برف کے تودے پر روکے گا۔ اُس نے ایک بٹن دبایا اور گراج کا دروازہ کھل گیا۔ اس کے خوبصورت گھر کو دیکھ کر میں زندگی میں پہلی بار گویا ڈر گیا۔ میں طہارت خانے میں جانا چاہتا تھا۔ اُس نے مجھے اوپر لے لیا۔ جونہی میں نے دروازہ کھولا، مجھے محسوس ہوا کہ میں کھڑکی سے گر رہا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ میرے پیچھے ایک بہت بڑا شیشہ اور طہارت خانے میں ایک بڑا آئینہ تھا۔ پچھلے شیشے سے شکاگو کی زرق برق روشنیاں آئینے میں منعکس ہو گئیں۔ سارا طہارت خانہ روشن ہو گیا شکاگو کی پچیس میل دُور کی روشنیوں سے۔ میں فنِ تعمیر کی یہ عجیب چیزیں دیکھ کر عجائبات میں کھو گیا۔ چیک میرا دوست بن گیا۔ اس دوستی کی بدولت لاس اینجلس (Los Angels) اور سان فرانسسکو (San Francisco) میں میرے کئی استقبال کئے گئے۔ چیک نے کرسمس پر مجھے اور اپنے پچیس دانشور دوستوں کو گھر لایا۔ اُنہوں نے ہندوستان کے بارے میں بہت کچھ کہا اور بہت خوشی سے کہا۔ وہ بھی میرے دوست بن گئے۔ میں نے چیک کو کہا کہ میں اپنی گھر والی کو امریکہ لانا چاہتا ہوں۔ اُس نے مجھے ایک خط دیا جس میں لکھا تھا کہ اگر سفارت خانہ

والوں کو میری گھر والی کے بارے میں کچھ پوچھنا ہو تو وہ چیک کے سینٹر (Senator) کے ساتھ اس معاملے میں بات کر سکتے ہیں۔ جیک معمار تھا مگر اس کے پاس کافی پیسہ تھا۔ اُس نے بعد میں میرے عیال کی خاطر تواضع کی۔ اُس کے دوستوں کا سارا گروپ نیک انسانوں پر مشتمل تھا۔ اُن میں لیسلی سنگر (Leslie Singer) ایک شخص جون، ایف کینڈی (John F Kenedy) کا صلاح کار تھا۔ وہ امریکی ڈیموکریٹوں کی بائیں بازو والی جماعت کے ساتھ منسلک تھا۔ اُسے چیکوسلواکیہ کے اونچے طبقے کے ساتھ نسبی لحاظ سے تعلق تھا۔ پہلے وہ انگلستان کے ایک پرائیویٹ سکول میں پڑھتا تھا۔ پھر ۱۹۴۸ء میں چیکو سلواکیہ کی ایک جیل میں بند تھا۔ وہ بہت توانا تھا اور چھ فٹ لمبا۔ اُس نے جیل کی چھٹی منزل سے دریائے ڈینوب میں چھلانگ ماردی اور جیل سے بھاگ گیا۔ وہ ڈینوب پار کر کے کسی جگہ پہنچ گیا جہاں اُس نے ایک لڑکی کو زار زار روتے پایا۔ یہ لڑکی چرچ میں گئی تھی توبہ کرنے کیلئے۔ وہاں پادری صاحب نے اس کی عصمت ہی چھین لی۔ اس لئے باہر آئی اور رونے لگی۔ لیسلی سنگر نے اُسے اپنے ساتھ لے لیا اور وہ میاں بیوی ہو گئے۔ سنگر نے ہماری خوب تواضع کی اور ہم دوست بن گئے۔ اُس کے پاس وان ڈائیک (Van Dwyk) کی اصلی تصویریں تھیں جو کہیں اور موجود نہیں تھیں۔ میں وہاں جدید مصوّری سے بھی متعارف ہوا۔ سنگر انڈیانا یونیورسٹی میں گیری کیمپس میں پروفیسر تھا۔ اس کے گھر میں ہم نے مزیدار تربوز کھائے۔ اس کے پاس چینی طرز کا کمرہ، چینی پلنگ (جو پست ہوتا ہے اور صوفے کا کام دیتا ہے) اور چینی قالین تھا۔ مکان میں چار پانچ کمرے تھے۔ میرا عیال آنے والا تھا اور میں نے امریکہ میں ٹھہرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ چیک نے مجھے تحفے کے طور پر ایک موٹر دی، ۱۹۵۴ء کی شیوی شیولر لیٹ Chevy Chevrolet جو ۲۰،۰۰۰ میل چلی تھی۔ اُس نے کہا "بال بچوں کے سمیت بسوں میں سفر کرو گے تو کافی پیسہ خرچ ہو گا تمہارا۔ نیویارک جاتے جاتے بھی دقّت آئیگی تجھے"۔ سنگر کو امریکی ڈیموکریٹک ایکشن

(Americans for Democratic Action) میٹنگ میں جانا تھا۔ وہاں جان ایف کینڈی تھے۔ اُس نے اپنی موٹر میں مجھے نیویارک پہنچادیا تا کہ میں امریکہ میں موٹر چلانے کے طریقے سے واقف ہوجاؤں۔

ہندوستان میں میرا ایک دوست تھا۔ اُسے بھی فُل برائٹ ملا تھا۔ جب میں امریکہ پہنچا، وہ مجھ سے ملا اور مجھے اپنے گھر لے گیا۔ دوسری دفعہ جب میں اپنے بال بچوں کے آنے کا انتظار کررہا تھا، اُس نے میرے لئے کام کا انتظام کیا۔ نیویارک سٹیٹ یونیورسٹی کے پچھتر کیمپس تھے۔ اُس کے ایک کالج میں مجھے گرمیوں میں پڑھانا تھا۔ یہ کالج نیو پالٹس (New Paltz) میں تھا جو نیویارک سے پچاس میل دُور تھا۔ میں نے گرمیوں میں پڑھایا اور تھوڑا بہت پیسہ کمایا۔ میرے بچے تیراکی کے لئے جاتے تھے اور لوگوں سے ملتے تھے۔ لوگ اُنہیں پسند کرتے تھے اور اُنہیں دوست بناتے تھے۔ ہم اس طرح جیتے رہے جب تک مجھے پی ایچ ڈی کے لئے فیلوشپ مل گئی۔ بات یہ ہے کہ میں نے ایک کالج میں تین مہینے گزارے۔ کالج والوں کو میرے ساتھ دوستی ہوگئی اور مجھ سے کہا کہ میں اُس کالج میں پی ایچ ڈی کروں۔ میں راضی ہوگیا۔ میری رضامندی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ میں کشمیر سے باہر رہنا چاہتا تھا۔ یہاں کشمیر میں نور محمد صاحب نے مجھے ہوسنگ لون دلایا تھا۔ میری تھوڑی سی زمین تھی جس پر میں مکان بنانا چاہتا تھا۔ مگر میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں اپنے بال بچوں کو امریکہ بلاؤں۔ پس زمین بھی بِک گئی اور ہوسنگ لون بھی کام آیا۔ میری گھر والی اپنے تین بچوں سمیت نیویارک پہنچ گئی۔ میرے بال بچے پروفیسر لنک (Link) اور اُن کی گھر والی بولاہ (Bulah) کے ساتھ کئی دن ٹھہرے۔ بولاہ پڑھاتی تھی۔ اُن کا ایک بیٹا تھا، پیری (Perry)۔ لنک بھی ایک طرح سے بائیں بازو کا طرفدار تھا۔ پیری پرنسٹن میں تھا۔ چین پر اُس نے خاصی مہارت حاصل کی تھی۔ وہ لکھتا ہے۔ میں نے اس کے مضامین اور ریویو مضامین دیکھے ہیں۔ وہ شاید چینی تمدّن کا پروفیسر تھا۔ تب سے آج تک

قریباً پچتالیس سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔

بیوی بچوں کے ہمراہ میں منسی انڈیانا چلا گیا۔ منسی تاریخی مقام تھا۔ رابرٹ لنڈ (Lyind) اور ہیلن لنڈ (Helen Lyind) نے وہاں عمرانیات پر خاصا اچھا علمی کام کیا تھا۔ اُس نے اپنی کتاب کا نام مڈل ٹاون رکھا تا کہ منسی کا نام نہ آئے۔ پندرہ سال کے بعد وہ واپس آ گیا اور وہاں کے تغیرات کا جائزہ لیکر کتاب لکھی جس کا نام مڈل ٹاون ان ٹرانزی شن (Middle Town in Transition) رکھا۔ رابرٹ نے یہودی گھرانوں کا بھی مطالعہ کیا تھا اور اُن کی زندگی کے مختلف شعبوں کا جائزہ لیا تھا۔ خود وہ بائیں بازو کے خیالات کا حامی تھا۔ بیسوی صدی کی تیسری دہائی میں وہاں بہت لوگ تھے جن کے خیالات ترقی پسندانہ تھے۔ رابرٹ کا بیٹا سٹفٹن لنڈ (Stouffaton Lynd) نامور سوشلسٹ بن گیا تھا۔ اشتراکیت پر اُس نے اچھی کتاب لکھی تھی جو میں نے بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں حاصل کی۔ وہ بے چارا سرطان میں مبتلا ہو گیا تھا۔

نیو پالٹس (New Paltz) میں میں نے دُنیا کی تاریخ پڑھائی اور بہت اچھا وقت گذارا۔ اس سے مجھے خوب پیسہ ملا اور بچے بھی امریکہ کے ماحول کے عادی ہو گئے۔ ڈاکٹریٹ کیلئے مجھے جو فیلوشپ ملی تھی، اس سے کافی پیسہ نہیں ملتا تھا۔ تقریباً چھ ہفتوں کے بعد مجھے تین سو ڈالر ملے۔ سو ڈالر اچھی رہائش گاہ پر اور انشورنس پر خرچ ہوتے تھے۔ سو ڈالر میں خوراک کا انتظام ہوتا تھا۔ سو ڈالر متفرق چیزوں پر صَرف ہوتے تھے۔ مگر میری کار کا خود کار گیر ٹوٹ گیا۔ میرے پاس ٹھیک کرنے کیلئے پیسے تھے نہیں۔ میرا دوست پروفیسر گوڈن (Gorden) میری گاڑی اُس جگہ لیکے گیا جہاں خستہ گاڑیوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ وہاں ایک بوڑھے آدمی نے ایک پرانی گاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پروفیسر گوڈن کو کہا کہ شاید اُس گاڑی کا گیئر کارآمد ثابت ہوگا۔ گوڈن نے وہ گیئر سو ڈالر میں خریدا اور میری گاڑی چار سال اُسی گیر پر چلتی رہی۔ پھر ایک دن میری گھر والی نے کہا کہ ہمارا آئس بکس خالی ہے۔

پیسہ دو ہفتوں کے بعد ملیگا۔ وہ ابھی بات ہی کر رہی تھی کہ کسی نے باہر سے گھنٹی بجائی۔ دروازہ کھلتے ہی ڈاکٹر ولیمز اور اُس کی گھر والی داخل ہوئی۔ وہ دونوں ڈاکٹر تھے۔ ولیمز (Williams) بال میموریل ہسپتال میں انستھیسیا (Anaesthesia) کا ماہر تھا۔ اُس کی گھر والی کالج میں ڈاکٹر تھی۔ کالج میں داخلہ سے پہلے اُس نے میری گھر والی کا معائنہ کیا تھا۔ کالج میں کوئی بھی فرد داخل ہو جائے اُسے طبی معائنہ لازمی کرانا پڑتا تھا۔ اُنہوں نے کہا ''ہمیں معلوم ہے کہ آپ کو زر مبادلہ کے کچھ مشکلات ہیں اس لئے کہ آپ کو یہاں اپنا روپیہ پیسہ خرچ کرنا پڑتا ہے اور آپ بال بچوں کے ہمراہ آئے ہیں۔ ہمیں کشمیری آرٹ کی چیزیں پسند ہیں اگر آپ کشمیر آرٹ کی کچھ چیزیں ہمارے لئے فراہم کرا سکیں، ہم آپ کو پیسہ دیں گے جو آپ یہاں خرچ کر سکتے ہیں۔'' میں نے اپنی گھر والی سے کہا کیوں نہ ہم انہیں شہتوس شال دکھائیں۔ میں نے کشمیریوں کی طرح چال کھیلی۔ شہتوس کو ایک انگوٹھی سے نکال دیا۔ اُنہوں نے اسے بہت پسند کیا۔ اُنہوں نے ہمیں اتنا پیسہ دیا کہ مہینے کا سارا خرچہ نکل گیا۔ میں وظیفہ ہی بھول گیا۔ اُس کے بعد میری ماں اُن کے لئے چیزیں بھیجتی گئیں۔ وہ ہمیں پیسے دیتے رہے اور اس طرح ہمارے مسائل حل ہو گئے۔ پھر میاں بیوی ۱۹۶۷ء میں کشمیر آئے اور ہمارے پاس چند دن ٹھہرے۔ وہ گلمرگ چلے گئے اور وہاں ہائی لینڈ پارک میں ٹھہرے۔ پھر میں نے اُنہیں شیخ صاحب کے مزار کے پاس ہاؤس بوٹ میں ٹھہرایا اور اُس کے بعد نیڈوز ہوٹل میں دو دن۔ ولیمز بہت اچھے انسان تھے۔ اُنہوں نے امریکہ میں ہمیں گھر بُلا بُلا کے، کھانا کھِلا کھِلا کے خاطر تواضع کی تھی۔

میں نے پی ایچ ڈی کیلئے دو غیر ملکی زبانیں لی تھیں، فرانسیسی اور اُردو۔ دو غیر ملکی زبانیں .Ph.D کیلئے لازمی قرار دی گئی تھیں۔ میں نے اُردو کے بارے میں اُنہیں ذرا چکمہ دیا تھا۔ جب اُنہوں نے پوچھا کہ اُردو زبان میں امریکہ سے متعلق کافی مواد میسر تھا، میں نے ٹھونک کر ''ہاں'' میں جواب دیا۔ غیر ملکی زبان سیکھنے میں مجھے دقّت محسوس ہوتی تھی

مگر یہ تو پی ایچ ڈی کے لئے محض ایک شرط تھی۔ میں نے فرانسیسی زبان سیکھی اور اس میں پاس ہوگیا۔ میں نے اس پروگرام میں تین سال گزارے اور تینوں سال فائدہ مند ثابت ہوئے۔ میں نے صرف ۷۹ صفحوں پر مشتمل مقالہ لکھا جسے سراہا گیا۔ عنوان تھا

"Theories of Americanization Operative in Gary Schools, 1907-1917"

(گیری سکولوں میں امریکیت کا عمل ۱۹۰۷ سے ۱۹۱۷ تک)۔ ایک باب میں امریکیت کا مقابلہ میں نے ہندوستانیت کے ساتھ کیا تھا۔ یہ تقابلی جائزہ محض فرضی یا قیاسی تھا۔ دو وجوہات کی بناء پر یہ مقالہ پر کشش تھا۔ (۱) گیری شکاگو کا ایک قصبہ تھا۔ شکاگو میں ہر طرف فولاد کے کارخانے تھے۔ گیری میں بنایا ہوا کارخانہ ٹاٹا کے پاس ہندوستان پہنچا تھا۔ (۲) روس میں بھی لگایا گیا فولاد کا کارخانہ پہلے گیری میں ہی بنا تھا۔ یہ روس میں فولاد کا پہلا بڑا کارخانہ تھا۔

حال ہی میں ایک بہت ہی اچھی مگر اہم کتاب چھپی ہے جس کا نام ہے خوابوں کی دنیا اور ناگہانی آفت (Dreamland And Catastrophe)۔ اس کتاب سے پتہ چلتا ہے کہ امریکہ نے سوویت روس کو صنعتی ملک بنانے میں مدد کی تھی۔ یہ انکشاف ممکن ہوسکا ہے کیونکہ اب ہی روس میں تاریخی دستاویزات کھلے چھوڑ دئے گئے ہیں۔ بات یہ ہے کہ امریکہ میں دباؤ پڑ گیا تھا زندگی کا اسلئے امریکہ کے لوگ کام ڈھونڈھ رہے تھے۔ روسیوں نے مصوّری اور فن کے نمونوں سے امریکہ کو راغب کردیا کہ وہ مصوّری کے نمونے خریدے۔ مصوّری کا ایک نمونہ چند ایک نمونوں کے ساتھ امریکہ کے سیکریٹری آف ٹریجری (فائنانس منسٹر) نے 1.8 ملین ڈالر میں خریدا۔ وہ اُس فولاد کے کارخانے کی اسی فیصد قیمت تھی جو روس میں پہلی بار لگایا گیا تھا۔ یہ تصویر حضرت مریم علیہا السلام کی تھی۔ سیکریٹری کو امریکہ کی داخلی مالیاتی منسٹری نے پکڑ لیا کہ یہ پیسہ اس کے پاس آیا کہاں سے۔ اُس نے پریذیڈنٹ روز ویلیٹ (Roosvelt) کو خط لکھا کہ وہ واشنگٹن میں میوزیم بنانا چاہتا ہے

جس کے لئے اُس نے کافی عرصے سے مصوّری کے نادر نمونے جمع کئے ہیں۔ انہی سے واشنگٹن کا میوزیم بن جائے گا۔ تصویروں کے کچھ نمونے اُس نے ہندوستان اور جرمنی سے بھی لائے تھے۔ روز ویلٹ کو خط لکھنے کے بعد اُسے چھوڑ دیا گیا۔ یہ تھی گیری (Gary) کی دُنیا اور وہاں کا شوق و سرور!

میں نے اپنے مقالے میں لکھا ہے کہ جنوب مشرقی یورپ کی مختلف قومیتوں کے لوگ جوق در جوق بیسوی صدی کی پہلی دہائی میں امریکہ آئے۔ اسے New Imigration کا نام دیا گیا۔ یہ لوگ امریکہ میں کام کرنے کیلئے آئے۔ اُن کا امریکہ آنا اور امریکا کا رنگ اختیار کرنا ہی میرا موضوع تھا۔ جب یہ لوگ آئے تو بھوکے تھے، ننگے تھے اور اُن کے جسم پر جوویں ناچتی تھیں۔ امریکہ نے اُنہیں اپنایا، خوش آمدید کیا۔ امریکی خود آزادی کے بُت کی پوجا کرتے تھے۔ اُنہوں نے ان لوگوں کو ریل میں بھر دیا اور گیری (Gary) پہنچا دیا جہاں اُن کو کام پر لگا دیا گیا۔ دوسرے ہی دن اس بستی سے ایک لڑکی نکل آئی اور اُس نے ان کے بچوں کو سکول پہنچا دیا۔ یہ ۴۲ قوموں کے بچے تھے جو اپنی اپنی زبانیں بولتے تھے۔ میں نے اپنے مقالے میں یہ دکھانے کی کوشش کی کہ ان بچوں کی زندگی کیسے بنی اور امریکہ کا عام سکول (common school) یکسانیت پیدا کرنے کا سکول کیسے بنا۔ سکولوں نے سب قوموں کو ایک قوم بنایا۔ بچوں کے والدین نے انگریزی تو سیکھی نہیں مگر بہت کام کیا، کٹھنائیاں برداشت کیں مگر بچوں کو ضرور سکول بھیج دیا۔ یونان کے ایک شخص کی مثال پیش کریں جو نیویارک میں دوائیوں کی دُکان چلاتا تھا۔ ایک رئیس امریکی نے اُس سے کہا ''آپ کے پاس دوائی کی خاصی اچھی دُکان ہے۔ آپ کا بیٹا اس کا وارث ہوگا''۔ اُس نے پھٹ جواب دیا: ''میرا بیٹا دوائی کی دُکان چلائیگا؟ وہ تو ہارورڈ جائیگا، ہارورڈ!'' میں نے اپنے جائزے میں لکھا کہ جو لوگ امریکہ آئے، اُن کے اپنے ملکوں نے اُنہیں باہر پھینک دیا۔ وہ امریکہ آئے اور یہاں برضا و رغبت امریکی قومیت میں گھل مل گئے۔ مگر ہندوستان میں

معاملہ کچھ اور تھا۔ جو لوگ ہندوستان آئے اور جنہیں اپنے ملکوں نے اسی طرح باہر پھینک دیا تھا، وہ ہندوستانی نہ بن سکے۔ وہ ہندوستانی قومیت میں دودھ اور پانی کی طرح مل نہیں گئے۔

میں امریکہ میں پی ایچ ڈی کے دوران بھی خوب کتابیں پڑھتا تھا۔ میں خاص کسی نقطے پر ذہن مرکوز نہیں کر سکتا تھا۔ لکھنے کی طرف بھی مائل نہیں ہوتا تھا۔ سخت ضرورت پڑتی تو مجبوراً لکھنے پر مجبور ہوتا۔ جب میں اپنے ڈائریکٹر کے پاس گیا یعنی وہ پروفیسر جو پی ایچ ڈی کیلئے میرا اصلح کار تھا یا راہنما، تو اُن سے کہا کہ مجھے ستمبر یا اکتوبر میں واپس جانا ہے۔ اس نے کہا کہ بٹرینڈ رسل (Betrand Russell) بھی دس ہفتے میں کتاب نہیں لکھ سکتا۔ میں نے کہا میں لکھوں گا گو کہ میں جانتا تھا کہ میرے سامنے مشکل کام ہے۔ پھر جب میں نے کام شروع کیا تو گھر جانے کی بھی فرصت نہ ملتی تھی۔ کبھی کبھی مجھے کھانا بھی بھول جاتا۔ میں کمرے میں کافی (Coffee) بنانے کیلئے کتلی میں پانی اُبالتا اور دوسرے انتظامات بھی کرتا۔ اُن دنوں میں پڑھاتا بھی تھا۔ فیلوشپ کافی نہیں تھی اس لئے پیسہ کمانا ضروری تھا۔ میری بیٹی حنا سولہ سال کی تھی اور وہ اب گاڑی چلا سکتی تھی۔ یہ گیئر (Gear) کے بغیر شری گاڑی تھی۔ حنا کو مقامی طور پر گاڑی چلانے کی اجازت ملی تھی۔ وہ آتی، مجھ سے ایک آدھ باب لے جاتی اور میرے پروفیسر کے حوالے کرتی۔ میں اپنے پروفیسر کے پاس جا بھی نہیں سکتا تھا۔ میں نے اٹھتر (78) دن میں مقالہ ختم کیا اور میرے پروفیسر نے تھوڑی سی سراہنا کی۔ نیویارک کے ایک پروفیسر نے بھی کہا کہ یہ سب سے عمدہ مقالہ تھا۔ ۱۹۸۹ء میں اُس نے میری گھر والی کو خط لکھا کہ میں نے شاندار مقالہ لکھا تھا۔ میں نے ''امریکہ کا خواب'' تصور (Concept) چونکہ سلیقے سے اُبھارا تھا اور واضح کیا تھا، وہ تھوڑا جوش میں آئے تھے۔ ہر سال چھٹیوں کے بعد دو کنووکیشن (Convocation) ہوتے تھے۔ ایک مئی میں اور ایک ستمبر اکتوبر میں۔ کنووکیشن ایک بڑی عمارت میں منعقد ہوتے تھے۔ اسی عمارت میں میں نے بھی ڈگری لی تھی۔ میں بال سٹیٹ یونیورسٹی کا پہلا پی ایچ ڈی ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ

یونیورسٹی کے پریذیڈنٹ اور وائس پریذیڈنٹ نے مجھے چوغہ پہنا دیا تھا۔ اُنہیں معلوم تھا کہ میرے پاس پیسے نہیں تھے اس لئے انہوں نے مجھے ایک قیمتی چوغہ دیا تھا۔ یہ ایک قسم کا تحفہ تھا جو میں نے آج تک محفوظ رکھا ہے۔ میں یہ چوغہ ایک دفعہ کشمیر یونیورسٹی میں بھی پہن کے آیا تھا۔ اُس کی تصویر میرے پاس موجود ہے۔ اُنہوں نے کہا تھا کہ میں پگڑی باندھوں۔ میں نے کہا تھا میرے پاس سرکاری دل فریب ٹوپی ہے، وہی پہن لونگا۔ اس میں سونے کا جھالر تھا۔ پی ایچ ڈی والوں کو سونے کا جھالر پہنایا جاتا ہے۔ میری گھر والی کو بھی EDS کیلئے سونے کا جھالر ملا تھا۔ میں امریکہ سے خوش و خرم واپس آ گیا۔ واپسی کیلئے ایک تو فُل برائٹ سے کچھ پیسہ بچا تھا، دوسرے ہمارا ایک موروثی مکان بک گیا تھا جس سے کچھ پیسے ملے تھے، تیسرے مجیب صاحب نے دو ہزار روپے ٹامس کک یا امریکی ایکسپریس کو دیا تھا۔ یہ رقم اُن دنوں کوئی معمولی رقم نہیں تھی۔

امریکہ میں گرمیوں میں ہم اپنے دوستوں کے پاس جاتے تھے۔ کشمیر کے محمد یوسف بڑھ صاحب سے بھی ہم ملتے تھے۔ وہ نقشبند صاحب کے چھوٹے بھائی تھے۔ میں نے ویسٹ اینڈ اونیو (West End Avenue) نیویارک میں اُن کے فلیٹ میں چند روز گذارے۔ وہ بڑے قابل انسان تھے۔ میں نے اُن کا ایک خط پڑھا جو کرسچین سائنس مونیٹر میں چھپا تھا۔ اُس نے لکھا تھا کہ ہندوستان پاکستان کشمیر پر کیوں جھگڑتے ہیں۔ وہ سوچتے ہیں جو لوگ کشمیر میں رہتے ہیں وہ انسان نہیں؟ اگر وہ ہمیں انسان گردانتے تو ہماری رائے معلوم کرتے۔ وہ پاکستان ڈیلی گیشن کا صلاح کار تھا اس لئے مجھے اس کے ساتھ کوئی غرض نہیں کہ وہ پاکستان کیلئے لکھتا تھا۔ ۱۹۷۱ء میں وہ ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ شملہ آیا تھا۔ وہ اُسی کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ اُس نے ایک امریکی عورت کے ساتھ شادی کی تھی مگر وہ لندن میں نشہ آور ادویات سمیت گرفتار ہوئی۔ اس کے بعد یوسف صاحب زاہد بن گئے۔ میں نے اپنے دوست فاروق احمد کاٹھواری سے دریافت کیا کہ وہ کہاں ہیں۔ اُنہوں نے کہا

کہ وہ کہیں آس پاس ہی رہتے ہیں۔

مجھے امریکہ میں چوٹی کے کچھ پروفیسروں سے ملنے کا موقعہ ملا۔ ایسے عظیم لوگوں کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا اور اُن سے فیضیاب ہونا بڑی سعادت ہے۔ کولمبیا میں گیسٹالٹ سیکالوجی کا ایک پروفیسر تھا، پروفیسر گڈوِن واٹسن (Goodwin Watson)۔ انہوں نے ایک تقریر کی تھی جس کا عنوان تھا (بیسوی صدی کی) چھٹی دہائی کی للکار (The Chellenge of 60's)۔ اُن کی تقریر اب بھی للکارتی ہے کیونکہ اب بھی وہ مسائل زندہ ہیں جو اُنہوں نے اپنی تقریر میں اُبھارے تھے۔ وہ ۱۹۶۱ء کے مارچ میں یہ تقریر کرنے کیلئے آئے تھے۔ اُنہوں نے پانچ نقطے اُبھارے تھے۔ (۱) ہم حد سے زیادہ مہلک ہتھیار بنا چکے ہیں جن سے تین گُنا عالمِ انسانیت تباہ ہوسکتا ہے۔ اس لئے جنگ نقطۂ عروج پر پہنچ گئی ہے۔ (۲) قومیت کا حد سے زیادہ بڑھاوا اور 'میری قوم، میرے لوگ'، کہنا علالتِ روحِ انسانی ہے۔ بڑے لوگ وہ ہیں جو آفاقی ہوتے ہیں۔ (۳) امریکہ بہت امیر ملک ہے۔ چھ فی صد لوگ جو امریکہ میں رہتے ہیں، دُنیا کی ساٹھ فیصد دولت کے مالک ہیں۔ وہ کس اخلاقی جواز سے اس دولت کو استعمال کرتے ہیں۔ کیا یہ حالت ہمیشہ قائم رہ سکتی ہے؟ (۴) دُنیا کے معاشی نظاموں میں کوئی نظام نہ قطعی اشتراکی ہے اور نہ قطعی سرمایہ دارانہ۔ امریکہ میں سوشل سیکورٹی کے پروگرام اشتراکی الاصل ہیں۔ اسی طرح ڈاک خانے اور سکول جن میں ہر قسم کے بچے پڑھتے ہیں۔ تعلیمی نظام بھی اشتراکی اصول پر قائم ہے۔ اسی طرح روس میں بھی مِلا جُلا اقتصادی نظام پیدا ہونے لگا ہے۔ الغرض امریکہ زیادہ سرمایہ دارانہ نظام ہے اور سویت روس[1] زیادہ اشتراکی۔ پانچواں نکتہ میرے حافظے سے محو ہوگیا۔ ایک اور پروفیسر وجودی فلسفے (Existential Philosophy) کا ماہر تھا۔ اُسکا نام پروفیسر ہیرلڈ ٹیلر (Harold Taylor) تھا۔ وہ بین الاقوامی یونیورسٹی بنانا چاہتا تھا جس کی درسیات (curriculum) طلباء اور

۱۔ یہ تقریر ۱۹۶۱ء میں کی گئی تھی اس لئے روس نہیں بلکہ سوویت یونین کہنا مناسب ہے۔

طالبات کے ذریعے منتخب کرانے کا خواہاں تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ تعلیم ایک چیلنج ہے جس کا منتہائے مقصد زندگی کی اعلیٰ ترین قدروں کا محاسبہ کرنا ہے۔ ٹیلر کے لیکچر بہت اچھے ہوتے تھے اور اُس کی کتابیں پڑھنے کے لائق۔ وہ سینٹ لارنس کالج کا پریذیڈنٹ رہ چکا تھا۔ میں جب اُن سے ملا، اُنہوں نے کالج سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ مجھے ایک لیکچر کے بعد اُن کے ساتھ ہوائی اڈّے پر کھانا کھاتے ہوئے بات کرنے کا موقعہ ملا۔ اُن کے فکر کی اُفتاد سے میں بہت متاثر ہوا۔ اُنہوں نے کہا کہ وہ ابوسعید ایوّب سے مل کر بہت متاثر ہوا ہے کیونکہ اُن کے خیال میں وہ ڈاکٹر رادھا کرشنن سے زیادہ فلسفے پر عبور رکھتے ہیں۔ اُنہوں نے یہ بھی کہا کہ اگر ہندوستان آزاد ہو چکا ہے مگر ایسا لگتا ہے کہ ہندوستانی افسر آنکھیں بند کر کے وہی کرنا چاہتے ہیں جو انگریز کرتے تھے۔ مطلب یہ کہ وہ نئی راہیں نہیں ڈھونڈھتے۔ اُنہوں نے ظریفانہ انداز میں ایک بات سنائی جو اُنہوں نے دلّی میں سُنی تھی۔ ''تین آدمی جن پتھ پر جا رہے تھے کہ اُنہیں کافی (coffee) پینے کا خیال آیا۔ جیسے ہی وہ کافی ہاؤس میں داخل ہوئے تو بارش ہونے لگی۔ دو آدمیوں نے تیسرے ساتھی سے کہا ہم کافی منگواتے ہیں، تم چھاتا لیکے آؤ۔ دو سال گذر گئے۔ ایک ساتھی نے دوسرے ساتھی سے کہا، یار وہ آیا نہیں، چلئے ہم اُس کی کافی پئیں۔ مگر تیسرا دروازے پر کھڑا تھا۔ کہنے لگا 'اگر میری کافی پی لی تو یاد رکھنا میں چھاتا نہیں لاؤں گا''۔ ایک اور دل جیت پروفیسر یہود تھے جن کا نام ابراہیم لیوں ساکر (Abramm Leon Sacker) تھا۔ وہ برانڈیز (Brandeis) یونیورسٹی کے پریذیڈنٹ تھے۔ یہ یہودیوں کی یونیورسٹی ہے۔ اُنہوں نے یہودیوں کی تاریخ کے علاوہ بھی کچھ کتابیں لکھی تھیں۔ وہ جب انڈیانا کے اساتذہ کے سالانہ جلسے میں خطاب کرنے آئے تو اُنہوں نے دس ہزار اُستادوں کے سامنے تقریر کی۔ اُنہوں نے امریکہ کے مادہ پرست رجحان پر سخت تنقید کی۔ اُنہوں نے کہا کہ امریکہ کا تمدّن، ہمّت اور جبروت کا تمدّن تھا جسے مادہ پرستی اور عیش کوشی نے بدل ڈالا۔ ہیرلڈ ٹیلر نے بھی یہاں

تقریر کی تھی۔ ایک اور پروفیسر تھا جس کا نام ایڈلائی سٹی ون سن (Adlai Stevenson) تھا۔ واشنگٹن کے قیام کے پہلے ہی چند مہینوں میں ڈیوس پاول میموریل (Davis Powell Memorial) لیکچر دیا۔ شاید وہ ابھی بھی میرے پاس موجود ہے۔ اُنہوں نے امریکہ کے اُس تمدّن کی مخالفت کی جس میں اشیاء انسان کے اعصاب پر سوار ہیں: رنگین ٹیلی ویژن، رسوئی میں رکابیاں دھونے کی مشینیں، ایرکنڈیشنرز (air conditioners) وغیرہ۔ اُنہوں نے چند ایک مصنّفین کے ساتھ مل کر امریکہ کی تاریخ لکھی تھی جو مستند تھی۔ بال سٹیٹ ٹیچرس کالج میں میرے اپنے پروفیسر بہت نامور تھے رابرٹ لافولیٹ (Robert La Follete)۔ وہ بعد میں ویت نام میں ہوائی حادثے میں جاں بحق ہو گئے۔ مجھے اس وقت ابوریحان البیرونی یاد آیا۔ میں اس کا بڑا معتقد ہوں۔ اُس نے گیارہویں صدی کے اوائل میں ہندوؤں کے بارے میں کہا تھا کہ اگر وہ سفر کرتے، دوسرے لوگوں کے ساتھ میل ملاپ پیدا کرتے، وہ مختلف قسم کے لوگ ہوتے۔ اُن میں تنگ نظری کی نامناسب روش نہ ہوتی نہ وہ محدود اور تنگ نظر سے زندگی جانچتے۔ مطلب یہ کہ جب ہم دوسرے ممالک کا سفر کرتے ہیں۔ وہاں تعلیم و ترتیب حاصل کرتے ہیں، ڈگریاں حاصل کرتے ہیں۔ لوگوں کے ساتھ ملتے جُلتے اور گفتگو کرتے ہیں، اُن کے خیالات اور نقطۂ نظر سے واقف ہو جاتے ہیں، ہمارا اپنا زاویہ نگاہ وسیع ہو جاتا ہے۔ ہماری زندگی کھِل جاتی ہے، پختہ ہو جاتی ہے اور پُر وقار۔ پس محض ڈگری پا لینا نہ ہمارا مقصد ہونا چاہیے اور نہ ہمارا سرمایۂ افتخار۔ البیرونی کے ساتھ ساتھ مجھے اوون لیتمور (Owen Lattimore) یاد آتا ہے۔ جب وہ انگلستان آیا۔ اُس سے پوچھا گیا کہ وہ امریکہ سے انگلستان کیوں آ گیا۔ اُس نے کہا لوگ امریکہ جاتے ہیں جہاں دولت ہے، وہ انگلستان اس لئے آیا کہ انگلستان میں عقل کی سرداری ہے۔ لیتمور کے الفاظ اس کے دل و دماغ کی آواز تھی مگر میرا تجربہ ہے کہ میں نے امریکہ میں بھی بڑے بڑے پروفیسر دیکھے اور کئی بہت اچھی یونیورسٹیاں بھی۔ تاہم

کہا جاسکتا ہے کہ دانشور اور اعلیٰ پایہ کے پروفیسر آکسفورڈ، کیمبرج یونیورسٹی میں ہی پیدا ہوجاتے ہیں۔ جو لوگ آکسفورڈ کیمبرج میں اول درجہ حاصل کرتے ہیں وہ معاشی کاروبار کی طرف راغب نہیں ہوتے۔ وہ ذہنی زندگی کو ترجیح دیتے ہیں۔ مگر امریکہ میں لوگ اب بھی یہی سوچتے ہیں کہ کاروباری زندگی ہی بہتر ہے اور جنرل موٹرس کیلئے جو باتیں سُود مند ہیں، وہی امریکہ کیلئے بھی سود مند تصور کی جاتی ہیں۔ ہمیں مسٹر فورڈ کے قول کا جائزہ لینا چاہیے کہ تاریخ واہیات ہے (History is bunk)۔ فورڈ بڑا سرمایہ دار تھا۔ اُس کی کار نے نہ صرف امریکہ میں انقلاب لایا بلکہ ساری دُنیا پر بھی دور رس اثرات ڈال دئے۔ کار کنوں کی زندگی پر اور لوگوں کے کھانے پینے پر اس کی کار کے اثرات خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود اُس نے کہا کہ تاریخ واہیات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کا مقولہ انٹی کلیمیکس ہے ہمارے حالات، افعال اور اطوار کا۔ میں بلا خوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ مطالعہ سے، عالموں، فاضلوں اور بڑے لوگوں کے ساتھ اُٹھنے اور بیٹھنے سے، جدید طرز کی زندگی کا غائر مشاہدہ کرنے سے میرے ذہن کو کافی فائدے حاصل ہوئے ہیں۔

میں امریکہ میں پی ایچ ڈی کے لئے کام کر رہا تھا، یہاں ہندوستان میں دو چیزیں واقع ہوئی تھیں۔ ایک یہ کہ ''ہندی چینی بھائی بھائی'' کی عمارت گر گئی تھی۔ یہ یقیناً افسوس ناک بات تھی گو کہ اس کی اہمیت کا دائرہ زیادہ وسیع نہ تھا۔ مجھے یاد ہے جب ہندوستان کے سفیر بی کے نہرو ٹیلی ویژن پر نمودار ہوئے تھے۔ مجھے بھی ایک لوکل ٹیلی ویژن سٹیشن نے اس موقعے پر سٹیشن پر آنے کی دعوت دی۔ میں نے ذرا جرأت سے بات کی۔ میں نے کہا کہ پنڈت نہرو چین کو یونائیٹڈ نیشنز میں لانے کیلئے جتن کر رہا تھا۔ ہندوستان میں آزاد سوشلسٹ سماج بنانا نہرو کا خواب تھا جس کی تعبیر آسان نہ تھی، اس لئے نہرو مثالی تھے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ عشق کے بغیر کامیابی سے وہ ناکامی بہتر ہے جس میں عشق ہو۔ دوسری طرف بات یہ تھی کہ نہرو سرگباش ہوئے اور

لوگوں نے مجھے ماتمی خطوط بھیجے۔ پروفیسروں کے ماتمی خطوط ابھی بھی میرے پاس موجود ہیں۔ نیو سٹیٹسمین اور نیشن (New Statesman and Nation) میں کنگسلے مارٹن (Kingslay Martin) نے لکھا تھا کہ نہرو کی حکومت کے سترہ سال بے مثال تھے اور لاجواب (It was a reign without precedent or parallel)۔ کسی اور لیکھک نے لکھا تھا کہ نہرو مرد ہی نہیں تھے بلکہ مردوں کا جلوس تھا[1]۔ میرے دل و دماغ میں نہرو کے بارے میں بہت سارے خیالات جھومتے تھے۔ یہ بھی کہ اُنہوں نے شیخ محمد عبداللہ کو رہا کیا تھا اور اُسے مصالحت کیلئے پاکستان بھی بھیجا تھا۔ مجھے آغا شوکت نے پاکستان کے دورے کے بارے میں خط لکھا تھا۔

امریکہ کے کلب مجھے تقریروں کیلئے بُلاتے تھے۔ لائنز کلب (Lions Club) کا نام اس ضمن میں خصوصاً لیا جاسکتا ہے۔ میں ایک دن تقریر کر رہا تھا کہ کسی پروفیسر نے پوچھا ''آپ یہ چیزیں کہاں سے لاتے ہیں''۔ وہ بال سٹیٹ ٹیچرس کالج کا وائس پریذیڈنٹ تھا۔ ایک تقریر میں میں نے بتایا تھا کہ ہندوستان جیسی نئی جمہوریت اور امریکہ جیسی آزمودہ کار جمہوریت کیلئے قریب نہ آنا حماقت ہے۔ کسی اور تقریر میں میں نے کہا تھا کہ امریکی تاریخ کو عالمی زاویہ نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ ایک دن وہ روسیوں کی بات کرتے ہیں اور دوسرے دن چینیوں کی۔ میں نے کہا تھا جب امریکیوں نے پہلی جنگ عظیم لڑی تو روس پیدا ہوا، جب دوسری لڑی تو چین پیدا ہوا۔ (اگر تیسری جنگ لڑیگا تو ہندوستان پیدا ہوگا)۔ وہ چونک گئے تھے۔ میں وسطی مغرب کے ایک چھوٹے قصبے میں بول رہا تھا۔ سامعین نے میری تقریر سن کر بہت خوشیلا شکریہ پیش کیا تھا اور کہا تھا کہ اُنہوں نے بہت کارآمد باتیں سُن لیں۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب امریکہ میں چیزیں بہت سستی تھیں۔ سنگترے کے رس

---

1. Nehru was not one man, but a procession of men.

کا ایک گیلن ایک ڈالر میں ملتا تھا۔ اسی طرح چار مرغے یا تین درجن انڈے ایک ڈالر میں ملتے تھے۔ ہم ہفتے کے بعد آئس بکس سے کچھ اشیاء خوردنی پھینک دیتے تھے اور اُن کی جگہ نئی چیزیں بھر دیتے تھے۔ ہمارے گھر میں خاصا ربط تھا۔ شاہد اگرچہ گھر کا کام نہیں کرتا تھا پھر بھی صفائی کرنے کی مشین (Vacuum Cleaner) سے گھر کی صفائی کرنے کا خواہشمند رہتا تھا۔ لالہ ہفتے بھر کیلئے لانڈری میں کپڑے دھوتا تھا۔ حنا اور اس کی ماں بازار سے ہفتے بھر کیلئے چیزیں خریدتی تھی۔ منصوبہ بند طریقے سے زندگی بہت آسانی سے گزرتی تھی۔ ہم سب سکول یا کالج جاتے تھے، کام کرتے تھے اور پھر گھر پر دوستوں کے ساتھ اچھا وقت گزارتے، کھاتے پیتے اور زندگی کی گرانیوں کو ہلکا بنا دیتے تھے۔

فُل برائٹ پر امریکہ جانا اور زندگی کے نادر تجربات حاصل کرنا بجائے خود ایک بہت بڑا کام ہے جس سے میں خود بھی متاثر ہوں، مگر امریکہ کے سفر کے اختتام پر میری زندگی کا ایک انوکھا واقعہ پیش آیا جو افسوس ناک تو تھا ہی مگر میرے دل میں درد کی ایک لہر چھوڑ گیا۔ یہ ایک حادثہ تھا جو میرے سماجی رشتے میں گھاؤ جیسا چھوڑ گیا گو کہ میں اس کیلئے ذمہ وار نہیں تھا۔ نہ میری خطا تھی اور نہ یہ واقعہ میرے ارادے سے پیش آیا۔ واقعہ یہ ہے کہ واپسی پر فیضی صاحب نے مجھے گھر پر دوپہر کے کھانے پر بلایا۔ اُن کے گھر سے سمندر صاف نظر آرہا تھا۔ جب میں امریکہ میں تھا تو فیضی صاحب نے مجھے ایکسپریس بھیجا تھا کہ اُن کی بڑی صاحبزادی فضل بوئے سے جُدا ہوگئی ہے۔ مجھے اس گھر سے دوستانہ تعلقات تھے۔ جب ہم امریکہ گئے تو اُن کے پاس ٹھہرے اور جب واپس آئے تو اُن کے پاس ہی ٹھہرے۔ فیضی صاحب نے مجھے کہا تھا کہ میں اگر اُن کے ساتھ کوئی رابطہ رکھوں، اُنہیں اس کے بارے میں مطلع نہیں کرنا چاہیے۔ اُن کی بات معقول تھی۔ مگر میں اُن کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔ شام کے وقت اُن کی بڑی بیٹی (فیضی صاحب کی) ہمیں ریلوے سٹیشن پر الوداع کرنے آئی۔ وہ بہت اچھا گاتی تھیں۔ اُس نے ریل میں فضل بوائز کے خوراک کے

پیکٹ اور پان دیکھے۔ جونہی فیضی صاحب ریل میں اندر آئے ہمیں الوداع کرنے کیلئے، اُنہوں نے اپنی بیٹی کو کہتے ہوئے سنا "لیکن یہ تو ماہیم سے آئے ہیں"۔ یعنی انہیں اُن کے سسرال والوں نے بھیجا ہے۔ فیضی صاحب بیٹی کے طلاق سے بہت رنجیدہ ہو گئے تھے۔ میں نے اُن کی آنکھوں میں غصّہ دیکھا اور وہ برس پڑے "خدا حافظ"! اور وہ چلے گئے۔ میں بہت پریشان ہوا مگر ریلوے سٹیشن پر کرتا کیا۔ ہم واپس آئے مگر رنجیدہ۔ فضل سلطان نے میرے بچے اپنے ساتھ لے لئے۔ میں اکیلا لائیڈز بنک کے آدمی کا انتظار کر رہا تھا۔ میری ماں نے پیسے بھیجے تھے اور میں بنک والے کا انتظار اس لئے کر رہا تھا کہ پیسہ ملے تو میں ٹیکسی والوں کو پیسہ دیکر چیزیں چھڑاؤں۔ میں نے لندن میں آئس بکس ۲۰ پونڈ میں خریدا تھا۔ اُس وقت پونڈ کی قیمت تیرہ روپے تھی۔ میں کھانا پکانے کی مشین اور کمرے صاف کرنے کی مشین بھی ساتھ لے آ رہا تھا۔ گیارہ بجے بنک والا آیا۔ میں نے ٹیکسی والوں سے گردن چھڑائی اور چل پڑا۔ جب کبھی میں کسی جگہ سے واپس آتا تھا تو میری جیب میں ہمیشہ چونّی رہتی تھی۔ مگر اس وقت چونّی کے ساتھ امریکہ کا دس پیسے کا سکّہ بھی تھا۔ اسے ڈائم کہتے ہیں۔ یہ سکّہ بھی بالکل چونّی جیسا تھا۔ میں نے امریکی سرمایہ داروں کو دھوکہ دینا چاہا۔ ڈائم کے بدلے میں چونّی مشین میں ڈال دی اور وہاں سے پھٹا پھٹ چاکولیٹ نکل آیا۔ بہر کیف میں پٹھانکوٹ سے بس میں روانہ ہوا۔ رات کد میں کاٹ لی۔ کد میں رات گذارنا کتنا اچھا لگا کیونکہ وہاں شیر کشمیر کی جیل تھی۔ جب میں سرینگر پہنچا تو سارا شہر موئے مقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے افسانوں میں محو تھا!

طریق کوہکن میں وہی حیلے ہیں پرویزی

۱۹۵۱ء میں ہم انگلستان سے ہندوستان واپس آئے۔ میں نہرو کی طرح نہیں کہوں گا کہ میں خود بین بن کر واپس آ رہا تھا مگر میں خود اپنی رائے قائم کرنے کے اہل بن گیا تھا اور سوچ رہا تھا کہ مارکسزم سے لیس میں نادانوں کو زیر کر سکتا ہوں۔ جب میں سری نگر میں شیخ محمد عبداللہ سے ملا تو وہ بہت ہی خوش ہو گئے۔ خوش کہ ایک نوجوان آدمی اُن کی طرح باتیں بھی کرتا تھا اور خواب بھی دیکھتا تھا، خواب جو انسان کی زندگی میں رنگ بھر دیتے ہیں اور زندگی کو بامعنی بنا دیتے ہیں۔ چند دنوں کے اندر اُنہوں نے میرے لئے ایک اسامی کھڑی کر دی اور مجھے سپیشل ڈیوٹی آفیسر بنا دیا جو انسپکٹر آف سکولز کے عہدے میں بدل گیا۔[1] شیخ صاحب نے اُسی وقت پروفیسروں کی نو اسامیاں کھڑی کر دی تھیں مگر پیسہ نہ ہونے کی وجہ سے یہ اسامیاں خالی رہ گئی تھیں۔ حکومت چاہتی تھی کہ پروفیسر کی اسامی پُر کرنے سے پہلے

۱۔ انسپکٹر آف سکولز کے ساتھ ساتھ یا تو میں شتر مرغ بنا یا خدائی فوجدار (ڈان کیوتے)۔ میں تعلیم میں زبردست انقلاب لانا چاہتا تھا۔ مجھے حد سے زیادہ اختیارات حاصل تھے۔ میں سکول بند کر سکتا تھا، اساتذہ کی تقرری کر سکتا تھا، اُن کو معطل کر سکتا تھا، تبادلے کر سکتا تھا۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو آج نہ سُنی جا سکتی ہیں اور نہ دیکھی جا سکتی ہیں۔ میں نے کرگل کے بارے میں جو رپورٹ شیخ صاحب کو دی اُس میں انقلاب ہی انقلاب تھا۔ آر سی رینہ شیخ صاحب کے پرائیویٹ سیکرٹری تھے اور میرے دوست۔ میں اس کی موٹر کے پیچھے دوڑا اور کہا کہ شیخ صاحب سے میری رپورٹ ضرور پڑھوانا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں اندھا دھند کسی چیز کی پروا کئے بغیر خدائی فوجداری کے لوازمات پورے کر رہا تھا۔

لوگوں کو انگلستان جانا چاہیے تا کہ وہ وہاں سے تعلیم سے آراستہ ہو کر آئیں اور پروفیسر بن جائیں۔ مگر پروفیسر کی ایک اسامی صاحب زادہ حسن شاہ کو دی گئی تھی۔ وہ بہت ہی قابل آدمی تھے۔ اُن کو ایک اسامی دی تو گئی تھی مگر اُن کو اسسٹنٹ ڈائریکٹر بنایا گیا تھا۔ کاظمی صاحب اُن دنوں ڈائریکٹر ایجوکیشن تھے۔ خیر، میں دھیرے دھیرے انتظامیہ کا مزاج سمجھنے لگا۔ آفیسر آن سپیشل ڈیوٹی کی حیثیت سے شیخ صاحب نے پہلی ہی دفعہ مجھے پونچھ، راجوری، بسوہلی اور بڑھوا اپنے ساتھ لے لیا۔ اُن دنوں جیپ وغیرہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اس لئے ہم گھوڑوں پر سفر کرتے تھے۔ درہال، منڈی یا جہاں بھی گئے، ہم نے دیکھا کہ لوگ بہت سادہ خوراک کھاتے تھے۔ میں مارکسی تھا۔ شیخ صاحب کی ایک ایک بات جانچتا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ ہمیں آہستہ آہستہ قدم بڑھانے ہوں گے۔ یہ الفاظ مجھے متاثر نہیں کرتے تھے کیونکہ میں تیز چلنا چاہتا تھا۔ شیخ صاحب راجپوت برادری سے ملتے تھے۔ یہ لوگ مقابلتاً امیر تھے۔ راجپوت مہماں نوازی کرتے اور شیخ صاحب اس کی داد دیتے۔ وہ اُنہیں کہتے تھے کہ ہری سنگھ کو جانا پڑا۔ اس کی نیّا ڈوب گئی کیونکہ اُس میں کافی گناہوں کا بوجھ جمع ہو گیا تھا۔ اُس نے کشمیر واپس آنے اور اس سرزمین پر پاؤں دھرنے کی جرأت نہیں کی۔ بسوہلی بڑھو میں میں بہت زیادہ متاثر ہوا۔ پگڑیاں باندھے ہوئے بوڑھے لوگ، داڑھیاں پہنے ہوئے جو پہاڑوں پر رہتے تھے، بڑے خوش شکل، معصوم مگر باتمیز، ہم سے ملتے، اگر کچھ نہ کہتے پھر بھی آنکھوں سے آنسو بہاتے۔ میں پھر بھی اُس تباہی کا نقشہ ذہن میں لاتا جو جموں صوبے میں لوگوں پر نازل ہوئی تھی جب مہاراجہ کشمیر سے بھاگ گیا تھا اور وہ بھاگتے بھاگتے جموں پہنچا تھا۔ اُس نے تمنا کی ہوتی کہ کم سے کم جموں کو بچایا جائے اور اُس نے جو طریقے استعمال کئے تھے اُن میں ایک طریقہ تھا نسل کشی! یہاں میں ایک ایسے شخص کی کہانی سناؤں گا جس کا پتہ مجھے پچیس سال کے بعد لگ گیا جب اس شخص کی عمر ستر سے زیادہ تھی۔ ۱۹۴۷ء میں وہ قریباً پچاس سال کی عمر کا ہوتا۔ ریاسی کے پہاڑی علاقے سے وہ اپنے

گھوڑوں پر نمک لاد لیا کرتا تھا۔ وہ ایسے ہی کام پر گیا تھا جب ۱۹۴۷ء میں اُس نے واپسی پر دیکھا کہ اُس کے گھرانے کے ۴۴ افراد قتل کر دیئے گئے تھے۔ مگر وہ وہاں ہی قدم جما کے بیٹھا جب تک کہ دوسری شادی کی اور دوسرا گھرانہ پیدا کیا۔ وہ پھر قدرے خوشحال ہو گیا۔

میں نے پہلے ہی کہا کہ جب میں شیخ صاحب کے ہاتھ سپیشل ڈیوٹی آفیسر پھر انسپکٹر آف سکولز بنا تو یہاں الہ آباد کے نور اللہ کاظمی صاحب ناظم تعلیمات تھے۔ کاظمی صاحب قابل تھے، ذاکر صاحب کے مداح تھے، اور اُن کے جتھے کے ایک مصاحب۔ اُنہوں نے لیڈس (Leeds) میں ایم، ایڈ کی ڈگری پائی تھی۔ وہ خوبصورت تھے اور اچھے انسان۔ مجھ پر مہربان تھے مگر انتظامیہ میں مجھے اُن کے ساتھ بنی نہیں۔ میں کام کی آزادی چاہتا تھا، ذاکر صاحب اور جامعہ کے تخلیقی کام کا عادی ہو چکا تھا، میں اس کے لئے تیار نہیں تھا کہ مجھے انتظامیہ میں پسا جائے اور تنگ نائے میں بند کیا جائے۔ پس جب میں انسپکٹر آف سکولز بن گیا۔ میں نے اُن سے کہا کہ کرگل اور لداخ کی تعلیم کا کسی کو آج تک علم نہیں اس لئے میں وہاں جاؤں گا۔ میں نے جیپ حاصل کی۔ اکتوبر کا مہینہ تھا اس لئے کاظمی صاحب نے کہا کہ لداخ جانے میں خیر نہیں۔ رستہ خراب تھا اور زوجیلا کے پاس تنگ راستہ تھا۔ تاہم جیپ چل سکتی تھی۔ پہیوں میں زنجیر لگائی ہوئی تھی اور میں کرگل چلا گیا۔ شیخ صاحب کے وقت میں انسپکٹر آف سکولز سارے سکولوں کا انتظام چلاتا تھا۔ آج کل کے منسٹروں سے بھی زیادہ اُس کے پاس اختیارات ہوتے تھے۔ اُستادوں کی تقرری اور اُن کے تبادلے بھی اُس کے اختیارات میں شامل تھے۔ انسپکٹر کسی سکول کو بند بھی کر سکتا تھا۔ جس انسان کو کام کا شعور ہوتا، وہ منصوبے بناتا اور بارآور کام کرتا۔ شیخ صاحب ایجوکیشن منسٹر تھے اور میرے بارے میں حسنِ ظن رکھتے تھے۔ جس وقت میں انسپکٹر بن گیا، افسر شاہی کے اصولوں کے مطابق مجھے اپنے دورے کے بارے میں ڈائریکٹر کو دو ہفتے پہلے مطلع کرنا ضروری تھا۔ اگر میرا پروگرام منظور کیا جاتا، تب میں جا سکتا تھا۔ میں نے اصول کو نظر انداز کیا اور چلا گیا۔ کشمیر

کے ایک خوب رو پنڈت طُفچی صاحب (Tufchi) ہر دفتر میں جاتے اور ریڈیو کشمیر کیلئے خبروں کا مواد جمع کرتے۔ میں نے اُسے کہا تھا کہ میں کرگل جارہا ہوں۔ میری طرح کاظمی صاحب دیر سے اُٹھتے تھے اس لئے صبح کی خبریں ریڈیو سے نہیں سُن پاتے۔ پس ریڈیو پر خبر جو آئی تو انہوں نے نہیں سُنی۔ میں جب لداخ پہنچا تو وہاں ایک گرلز سکول دیکھا۔ اُس میں پیاری پیاری بچیاں تھیں۔ میں نے اُن کے لئے دودھ تیار کروایا اور اُنہوں نے پی لیا۔ میں ایسا خدائی فوجدار (ڈان کیوتے)* نازل ہوا تھا کہ تعلیم میں کوئی نیا باب کھولنا چاہتا تھا۔ میں تمنا کرتا تھا کہ سکولوں کے پچھلے صحن میں سبزیاں اُگانے کا بندوبست ہو جہاں ٹماٹر اُگائے جائیں اور بچوں کو وٹامن ''سی'' مل سکے۔ اس قسم کے اور بھی بہت خواب میں شیر کشمیر کے نیا کشمیر میں دیکھتا تھا۔ میں جامعہ میں کام کر چکا تھا، انگلستان اور یورپ کے دورے سے واپس آیا تھا، برلن کے بین الاقوامی یوتھ فیسٹول (International Youth Festival) میں شرکت کر چکا تھا، مجھے کیا معلوم تھا کہ میں نالائق تھا، عینی اصولوں کا متوالا تھا، قیاسی محل بنانیوالا، ناموزون البیلا، کشمیر کے اُس سماج کے ساتھ ساز باز نہیں جو ابھی ایسے تعمیری کام کیلئے ذہنی طور اور اخلاقی اعتبار سے تیار نہیں تھا۔ مگر مجھے شیخ محمد عبداللہ کی حمایت حاصل تھی اور میں جوش سے آگے بڑھنے کی ہر ممکن سعی کرتا تھا۔

جس دن میں لداخ گیا، صبح کی خبروں میں بتایا گیا کہ انسپکٹر آف سکولز کرگل کے دورے پر گیا ہے۔ شیخ صاحب نے یہ خبر سُنی تھی۔ ڈائریکٹر صاحب جب شیخ صاحب سے ملے تو اُنہوں نے پوچھا کہ انسپکٹر سکولز کہاں ہے۔ کاظمی صاحب نے کہا کہ ابھی آرہے ہیں۔ شیخ صاحب نے ہنستے ہوئے کہا کہ وہ کرگل گئے ہیں اس لئے کہ پچھلے ۱۶ برسوں میں وہاں کوئی انسپکٹر گیا ہی نہیں۔ یہ سب دل چسپ باتیں تھیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ کیسے مگر امرِ واقع ہے کہ میں نے ریڈ کراس والوں سے ملٹی وٹامن ٹکیاں، دودھ کے ٹین، خشک دودھ،

---

* Don Quixote

کمبل اور بھی جو کچھ میسر تھا، اُٹھالیا تھا اور کرگل پہنچا تھا۔ مٹائن (Metayan) میں میں نے ایک المناک چیز دیکھی تھی۔ ایک بچے کو گویا غار سے نکالا گیا تھا۔ تین سال کی عمر کا یہ بچہ چھ مہینے کا لگ رہا تھا۔ وہ لوگ نہ جانے وہاں ترمی اناج کھا کھا کر کس طرح جیتے تھے۔ جہاں جہاں بھی میں گیا، میں نے لوگوں کو ایک قسم کی خارش میں مبتلا پایا۔ یہاں کشمیر میں بھی بہت لوگ اس کے شکار ہو جاتے ہیں۔ جب میں کرگل سے واپس آیا تو ڈائریکٹر نے مجھے بتایا کہ میں کیسے اجازت کے بغیر گیا تھا۔ مگر دو مہینے کے بعد میں پھر اُس سے پوچھے بنا فوج کے ڈکوٹا جہاز میں لیہہ پہنچا۔ اس جہاز میں ایک بڑے المونیم بکس کے بغیر کچھ نہیں تھا۔ اس بکس کے اندر صرف گولیاں تھیں۔ میں اسی بکس کے اوپر بیٹھ گیا تھا۔ یہ بھی لداخ کا سادھا سفر تھا۔ اس کے فوٹو میرے پاس موجود ہیں۔ جونہی میں ڈکوٹا سے اُترا، میں نے ڈکوٹا کی تصویر اُتاری۔ ہوابازوں نے میرا کیمرہ چھین لیا۔ میں نے اُنہیں بتایا میں کون ہوں تو انہوں نے کیمرہ واپس کیا۔ اس طرح میرا فلم اور تصویریں بچ گئیں۔ لیہہ میں میں نے پہلا گرلز پرائمری سکول قائم کیا۔ ایک لداخی لڑکی نے میٹرک پاس کیا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ اُستانی بننے پر رضامند ہے۔ وہ لداخ کے کسی افسر کی بیٹی تھی۔ اُس نے مان لیا۔ سارا درجی نے بعد میں ہمارے گھرانے کے ساتھ بہت اچھے تعلقات قائم کئے۔ وہ اب اس دُنیا میں نہیں۔ میں لیہہ میں ایک زندہ دل آدمی کے ساتھ سفر کرتا رہا۔ اُس کا نام علی زیر جولڈن (Elizar Jolden) تھا۔ اُس نے مجھے ایک چھوٹے گھوڑے شے (She) پر خانقاہ لے لیا۔ یہ جگہ لیہہ سے قریباً چھ گھنٹے کا سفر ہے۔ میں وہاں اپنے باپ کے دوست مسٹر ڈچن کے پاس ٹھہرا۔ وہ لیہہ کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ انہوں نے مجھے خاصا اچھا کھانا کھلایا، خاصی اچھی چیز پلائی۔ یہ ایک موٹی رکیک چیز ہے جسے شاید مُکھ مُکھ کہتے ہیں۔ میں نے لداخ میں لداخی کپڑے پہن لئے اور اُن کپڑوں میں اپنی تصویر بھی کھنچوائی۔ میں نے اُس ویرانی کی کراہت محسوس کرتے ہوئے وہی کیا جو وہاں ممکن تھا۔ ۱۹۵۲ء میں میری

آنکھ اُتنا ہی دیکھ سکی۔ میں جب کشمیر واپس آیا اور امیرا کدل کے اوپر سے جیپ میں گذرا، مجھے یقین نہیں آیا کہ میں پھر کشمیریوں کو دیکھ رہا ہوں۔ لداخ اس قدر مرگ کی حالت میں اکڑی ہوئی جگہ تھی۔[1] اپریل کا مہینہ تبادلوں کا وقت ہوتا ہے۔ تبادلوں کا معاملہ سنگین تھا۔ میں نے دریافت کیا کہ کیا اس کے لئے کوئی اصول ہوتا ہے۔ معلوم ہوا کہ لانگسٹ ان اور لانگسٹ آوٹ کا اصول جو محض محکمانہ روایت ہے اس ضمن میں مسئلہ حل کرتا ہے۔ مثلاً جو آدمی سب سے زیادہ عرصے کیلئے اپنے گھر کے آس پاس کام کرتا رہا ہو اُس کو تبدیل کیا جائے اُس اُستاد کی جگہ پر جو سب سے زیادہ عرصے کیلئے باہر رہ چکا ہو۔ اس معقول اصول کی بنیاد پر میں نے فہرس بنائی۔ جب میں نے پہلا آرڈر پہلی اپریل کو جاری کیا، اُسی دن آغا اشرف کے خلاف افسر شاہی کی بنیادی مخالفت شروع ہوئی۔ اس حکم نامے میں بخشی صاحب مرحوم کی صاحب زادی کا اتالیق (tutor) آیا، شیر کشمیر کا بھانجا آیا، شیر کشمیر جو اُس وقت ریاست جموں و کشمیر کے وزیر اعظم تھے۔ افسر شاہی نے پسند نہیں کیا کہ میں کامیاب ہو جاؤں۔ اُنہوں نے مجھے بتایا نہیں تھا کہ ایسا کرنے سے میرے راستے میں مشکلات پیدا ہو جائیں گے۔ دوسرے دن ڈاکٹر فاروق عبداللہ میرے پاس آئے اور انگریزی طرز میں مجھے بتایا "پرائم منسٹر اور اس دفتر کے درمیان فکری ہم آہنگی ہے کہ میرے چچازاد بھائی کو تبدیل نہیں ہونا پڑے"۔ یہ الفاظ تقریباً وہی ہیں جو فاروق صاحب کی زبان سے نکلے تھے۔ میں نے فاروق صاحب سے کہا کہ میں خود شیر کشمیر سے ملوں گا۔ وہ تو چلے گئے مگر دوسرے دن شیخ صاحب نے مجھے اپنے دفتر بلایا۔ میری والدہ وہاں ہی بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ اُن دنوں چیف انسپکٹرس آف سکولز تھیں۔ آغا سید احمد اُن دنوں جنرل سیکریٹری بھی تھے اور ایجوکیشن کے سیکریٹری بھی۔ شیخ صاحب نے بتایا "تم نے میرے بھانجے کو اجس بھیجا ہے؟

۱۔ ۱۹۸۴ء میں میں لداخ گیا۔ اُس وقت لداخ بالکل بدل گیا تھا۔ ہر رنگ میں ترقی ہوئی تھی۔ لیہہ کا بازار خاصا اچھا تھا۔ میں نے گھر کیلئے کچھ آرائشی سامان اور کچھ اچھے پتھر خریدے۔

جب وہ میرے پاس آیا تو میں نے کہا شکر کرو کہ اُس نے کرگل نہیں بھیجا آپ کو۔ برخوردار راضی خوشی اجس جاؤ''۔ میں نے کہا'' جناب، فاروق صاحب میرے دفتر آ گئے تھے''۔ شیخ صاحب نے کہا''تم نے اُس کی ٹانگیں نہیں توڑیں؟'' اُس نے تمہارے دفتر آنے کی جرأت کیسے کی؟'' میں یہ اس لئے لکھ رہا ہوں کہ اُس وقت کا مُوڈ (Mood) بیان کروں۔ مگر شیخ صاحب نے بتایا کہ اُنہیں بخشی صاحب کے ساتھ تھوڑی سی رنجش پیدا ہوگئی ہے۔ اس لئے اُن کی (شیخ صاحب) درخواست ہے کہ اُن کی صاحبزادی کے اتالیق کا تبادلہ روک دیا جائے۔ میں نے کہا جناب صرف ایک شخص کو میں کیسے رعایت دے سکتا ہوں۔ میں یہ کہہ رہا تھا تو میری والدہ دوسری طرف سے اشارہ کر رہی تھی کہ میں شیخ صاحب کے ساتھ نامناسب لہجے میں بات کر رہا ہوں۔ اُس کا خیال تھا کہ شیخ صاحب مجھے دفتر سے نکال باہر کریں گے۔ مگر شیخ صاحب کا لہجہ نرم تھا۔ اُنہوں نے کہا اچھا ٹھیک ہے تم بخشی صاحب کے گھر جاؤ اور اُن کی بیٹی سے کہو کہ تم اُس کے لئے کسی اچھے اتالیق کا بندوبست کرو گے۔ میں نے اتالیق چن لیا مگر بخشی صاحب کی صاحب زادی نے اُسے رد کیا اور خط لکھا کہ تبادلہ روک دیا جائے۔ میں نے پھر اُس کے اپنے اتالیق کو ٹریننگ سکول سرینگر بھیج دیا۔ ٹریننگ سکول میرے اختیار سے باہر تھا۔ اُن دنوں ٹریننگ سکول کے ساتھ کئی استاد ملحق رہتے تھے۔ اس طرح اُس کے اتالیق کو سرینگر میں ہی اپنے گھر کے آس پاس ہی رکھا گیا۔ بعد میں میں نے اسکو ایک دن ٹیچرس کانفرنس میں دیکھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ وہ سیدھا آدمی نہیں تھا۔ مجھے یہ کہنا ہے کہ مجھے معاملات نبھانے کا مناسب طریقہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ بخشی صاحب کو میرا رویہ پسند نہیں آیا۔ اُس نے کہا کہ مجھے کسی کا لحاظ نہیں۔ پھر پانچ افسر میرے دفتر آئے جن میں فاضلی صاحب، وید پرکاش گوسوامی، قادری صاحب شامل تھے۔ اُنہوں نے کہا خدا کیلئے شونٹھو صاحب کے بڑے بھائی کو تبدیل مت کرو۔ غلام احمد شونٹھو صاحب اکونٹنٹ جنرل ہیں۔ میں نے کہا میں کسی کو رعایت دینا حرام سمجھتا ہوں۔

خیر جس دن شیر کشمیر کو پرائم منسٹری کے منصب سے گرا کر گرفتار کیا گیا۔ اُس کے فوراً بعد میری تنخواہ بند کر دی گئی۔ بہانہ یہ بنا کہ میرا پوسٹ تسلیم شدہ پوسٹ (confirmed) نہیں ہے۔ نو مہینے میں نے تنخواہ کے بغیر کاٹ دئے۔ ایک دن اُس وقت کے وزیر خزانہ شری گردھاری لال ڈوگرہ نے مجھے اپنے دفتر بُلا لیا۔ اُنہوں نے کہا۔ ''میں نے آپ کی فائیل دیکھی اور میں حیران رہ گیا۔ میں کابینہ میں تھا جب آپ کا پوسٹ کھڑا کر دیا گیا تھا۔ حکومت نے سمجھا ہے کہ آپ کو انگلستان ڈپٹی ڈائریکٹر کی حیثیت سے بھیج دیا گیا تھا۔ میں نے اُن کو کہا ہے کہ آپ ریاست کے تسلیم شدہ افسر ہیں۔ اب آپ کی تنخواہ روکنے والا کوئی نہیں۔ میں نے لکھا ہے کہ آپ کی تنخواہ واگذار ہو''۔ بار بار میری نصیبوں میں لکھا ہوا ثابت ہوا کہ میری مدد کشمیری نہیں، غیر کشمیری کریں گے اور وہ بھی نازک موقعوں پر! ڈاکٹر کرن سنگھ نے میری مدد کی، آصف علی اصغر فیضی صاحب نے کی مگر ہر وقت ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ کشمیر کے اُبھرتے ہوئے افسروں نے مجھ پر شک کیا۔ مجھ پر بھروسہ نہ کیا اور مجھے تنگ کرنے کی کوشش کی۔ میں شعوری طور پر اس سے واقف نہ تھا۔ میں نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ، نہ مجھے زمانے کی روش کا کوئی خیال تھا۔ میں وہی کرتا رہا جو دل نے کہا اور دل نے جو کہا وہ میرے ضمیر کی آواز تھی!

شیر کشمیر کی گرفتاری سے پہلے کچھ واقعات رونما ہوئے جن کا تعلق میرے ساتھ تھا اور میری انسپکٹری کے ساتھ۔ مجھے زمانے کے تیور پہچاننے اور زمانے کے ساتھ ساز باز کرنے کا تجربہ حاصل تھا نہیں۔ زمانہ ساز طبیعت قدرت نے میرے لئے لکھی ہی نہیں۔ بہر کیف ایک دن میرے بڑے برادر آغا ناصر صاحب مجھ پر گھر پر ہی برس پڑے۔ ''تمہین کیا معلوم ہے انتظامی امور (Administration) کیسے چلائے جاتے ہیں۔ تم تو جامعہ سے آئے ہو۔ حالات خراب ہو گئے ہیں۔ لوگ جلوس نکال رہے ہیں۔ آپ کے خلاف، حکومت کے خلاف نعرے لگائے جا رہے ہیں۔ سکول بند کرنا کوئی بازی نہیں۔ تم ہائی سکول بند نہیں کر سکتے۔ خاص کر وری ناگ کا سکول۔ شیخ صاحب نے تمہیں کل بلایا ہے۔ چکھو اب

مزہ!'' دوسری صبح کو اجیت پرشاد جین صحن میں بیٹھے ہوئے تھے۔ مرزا افضل بیگ اپنے ماموں ذیلدار صاحب کے ساتھ تشریف لائے۔ ذیلدار صاحب نیشنل کانفرنس کے ضلع صدر تھے۔ اُن کا کافی اثر ورسوخ تھا۔ آغا ناصر صاحب، میرے برادر، ڈپٹی کمشنر انت ناگ بھی وہاں موجود تھے۔ میں بھی پہنچ گیا۔ بات چیت شروع ہوئی۔ میں نے شیخ صاحب کے سامنے واضح کیا کہ میرے پاس قطعی وجوہات تھے جن کی بنیاد پر میں نے سکول بند کیا۔ وہاں طلباء کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ اور بھی تعلیمی وجوہات تھے جو ہائی سکول کا بقاء مضحکہ خیز بناتے تھے۔ بیگ صاحب نہیں چاہتے تھے کہ ویری ناگ کا سکول بند کر دیا جائے۔ وہ شہباد ڈورو کا مدرسہ اس کے عوض بند کرانا چاہتے تھے۔ پس منظر یہ تھا کہ کابینہ اور سیاسی لیڈر شپ میں دھڑ بندی شروع ہوگئی تھی۔ بیگ صاحب کا ہاتھ شیخ صاحب کے ہاتھ میں تھا اور سید میر قاسم کا جھکاؤ بخشی صاحب کی طرف۔ میں اس سے بے خبر ویری ناگ کا سکول بند کر چکا تھا اور ڈورو کا سکول کھلا رکھنا چاہتا تھا۔ میرے پاس کوئی وجہ نہ تھی کہ میر قاسم کے ڈورو کا سکول بند ہو۔ شیخ صاحب نے کہا۔ ''میں اس حق میں نہیں کہ سیاست تعلیم کے ساتھ مداخلت کرے۔ مجھے اپنا انسپکٹر جو کہتا ہے وہی کروں گا''۔ مجھے شیخ صاحب کی باتیں بہت اچھی لگ رہی تھیں مگر میں اپنے برادر آغا ناصر صاحب کا چہرہ گھور رہا تھا بیگ صاحب کا بھی۔ ناصر صاحب بے قرار لگتے تھے مگر بیگ صاحب بہت سنجیدہ۔ شیخ صاحب دفعتاً بول اُٹھے۔ ''یہ وقت سمجھوتہ بازی کا نہیں۔ ہمیں اس وقت جلال سے کام لینا ہوگا۔ اس وقت بے رحمی کی جرأت کرو اور اس طرح کی للکار کا جواب دو۔ جرأت سے بھی زیادہ جرأت کرو۔'' مجھے اپنے برادر کا ڈر تھا کہ کہیں وہ مجھ پر برس نہ پڑیں۔ اُنہیں تو ڈپٹی کمشنر کی حیثیت سے انت ناگ کے ناموافق حالات کا سامنا تھا۔ مگر شیخ صاحب کا موڈ دیکھ کر میں اپنے پاؤں پر اور بھی مضبوطی سے کھڑا رہا۔ جب ہم نکل رہے تھے۔ بخشی صاحب موٹر میں بیٹھ رہے تھے۔ اُس نے مجھے کہا اور ناصر صاحب کو۔ ''بھول نہ جانا۔ یہ وقت ہے ہمت کا اور بے رحمی کا! یہ وقت سمجھوتہ بازی کا نہیں!''۔ ناصر

صاحب ضلع کے مجسٹریٹ بھی تھے اور ڈپٹی کمشنر بھی۔ وہ بیگ صاحب کے تحت بھی کام کر رہے تھے اور بخشی صاحب کے تحت بھی۔ بخشی صاحب کے ہاتھ میں ہوم تھا اور لا اینڈ آرڈر کی مشینری۔ میں نے سمجھ لیا کہ بخشی صاحب نے شیخ صاحب کے کلمات دہرائے اور اُن سے فائدہ اُٹھایا۔ وہ ناصر صاحب کو کہنا چاہتے تھے کہ سمجھوتہ نا کرنا اور ہمت سے اُن کا (بخشی صاحب کا) خیال رکھنا۔ رہا سوال میرا۔ میں اپنے تعلیمی کام میں مصروف تھا۔ جو قدم اُٹھاتا تھا، وہ اصولوں اور عوام دوستی کی بنیاد پر اُٹھاتا تھا۔ شیخ صاحب مجھ سے خوش اور میں اُن سے بہت خوش!

بخشی صاحب مرحوم دوست پرور انسان تھے۔ اُن کا کام کرنے کا طریقہ بڑا دلچسپ تھا مگر قابل تعریف۔ شیخ صاحب کی گرفتاری سے چار یا پانچ دن پہلے شیخ صاحب سے ملنے کے بعد اُنہوں نے مجھ سے کہا۔ ''کاپرین یا پلوامہ کی کسی جگہ پر سکول کا درجہ بڑھانے کی ضرورت ہے۔ میری گزارش کو زیر نظر رکھئے۔'' اُن کا لہجہ نہایت ہی نرم تھا اور مشفقانہ۔ میں نے کہا جناب ہم نے دوسرے سکولوں کا درجہ بڑھانا ہے اس لئے کاپرین اس وقت شامل نہیں ہو سکتا۔ اُنہوں نے ایک لفظ بھی نہ بولا اور وہ پیچھے ہٹے۔ بعد میں میں نے خوب قہقہہ مارا اور وہ بھی اپنی سادگی پر۔ شیخ صاحب کی گرفتاری کا حکم اُن کی جیب میں تھا۔ کس عمدگی سے وہ میرا امتحان لے رہے تھے۔ سات اگست کو شیخ صاحب کئی ہیڈ ماسٹروں کو مستقل بنانے والے تھے۔ شیخ صاحب نے انٹرویو بورڈ میں خواجہ غلام احمد عشائی، میرے ماموں آغا سید احمد سیکریٹری ایجوکیشن اور مجھے لایا تھا۔ عشائی صاحب جموں و کشمیر یونیورسٹی کے رجسٹرار تھے۔ وہ بڑے قابل آدمی تھے۔ شیخ صاحب نے اُن کو بلایا تھا اس لئے بھی کہ میں جلد باز ہوں۔ میں انٹرویو بورڈ میں بیٹھا تھا اور اُستادوں کا تعارف کرا رہا تھا۔ میں نے ایک اُستاد کو دیکھا جو حشیش کھاتا تھا اور درویشی کی طرف مائل تھا۔ وہ ترہگام سکول کا ہیڈ ماسٹر تھا مگر اُس کے سکول کی حالت بہت خراب تھی۔ بی اے، بی ٹی یہ اُستاد انگریزی پڑھاتا تھا۔ اُس نے sigh کا ترجمہ ''سسکیاں'' میں کیا تھا۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ sigh اور sob میں

کیا فرق ہے۔ کلاس ختم ہونے کے بعد میں نے اُسے ایک طرف لیا اور sigh اور sob میں فرق کرنے کو کہا۔ میں نے اُس سے کہا تھا کہ وہ sigh کا ترجمہ ''آہ'' اور sob کا ترجمہ ''سسکی'' میں کرنا چاہتا ہے؟ اُس نے کہا تھا کہ ان دولفظوں میں کوئی فرق نہیں۔ وہ ایکٹر تھا۔ اُس نے کہا sob سانس اندر لینے کو کہتے ہیں اور sigh سانس کے باہر نکلنے کو کہتے ہیں جیسے کہ ''ہُو'' کی آواز۔ بی اے، بی ٹی انگریزی پڑھاتا تھا! میں نے اُسے دیوار پر لٹکتے ہوئے ایک چارٹ کی طرف متوجہ کرایا، اس میں چقندر کی تصویر تھی۔ میں نے پوچھا کہ وہ کیا ہے۔ اُس نے کہا جناب مجھے معلوم نہیں، معافی دیجئے''۔ وہ بھی مستقل ہیڈ ماسٹر بننے کی فہرس میں شامل تھا۔ شیخ صاحب نے اُسے بتایا کہ اُس کا ریکارڈ بہت خراب ہے اور افسردگی پیدا کرتا ہے۔ اُسے یا تو تحقیقات کا سامنا کرنا پڑیگا یا تنزّل عہدہ۔ اُس نے کہا تنزّل عہدہ ٹھیک ہے۔ میں نے مداخلت کی اور بتایا کہ اگر وہ حشیش چھوڑ دیگا تو۔۔۔ ابھی تو میں نے پورا جملہ بھی نہ کہا تھا کہ اُس نے کہہ دیا۔ ''دیکھئے اشرف صاحب! میں آپ سے پیار کرتا ہوں مگر مجھے اپنے پیر کے ساتھ عہد و پیماں ہے اس لئے حشیش چھوڑ نہیں سکتا''۔ وہ بے چارا ہیڈ ماسٹری سے ہاتھ دھو بیٹھا[1]۔ مگر جلدی ہی نئے ڈائریکٹر نورالدین صاحب نے اُسے گاندربل میں ہیڈ بنادیا۔ گاندربل اُس کے گھر کے قریب تھا۔ شیخ صاحب جیل گئے اور لوگ پس پشت میرے خلاف باتیں کرنے لگے۔

میرے ماموں آغا سید احمد نے صادق صاحب کے مشورے کے خلاف خواجہ نورالدّین مرحوم کا انگلستان جانا ممکن بنایا تھا۔ اُن کے ذہن میں غالباً کوئی تھا جسے وہ انگلستان بھیجنا چاہتے تھے۔ اُن دنوں صادق صاحب آئین ساز اسمبلی کے چیرمین تھے۔ وہ

۱۔ اُس کے بعد ہی شیخ صاحب گرفتار ہوئے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کو نہ حشیش چھوڑنا پڑا اور نہ ہیڈ ماسٹری ہاتھ سے گئی۔ شیخ صاحب نے انٹرویو کرتے وقت ان صاحب سے کہا تھا کہ پندرہ لڑکوں میں سے صرف ایک لڑکا کیوں میٹرک میں کامیاب ہوا۔ یہ صاحب بولے "Sir, the II teacher Sarwanand Peer was frustorated."

آغا سید احمد کو بتاتے کہ سمندر پار کا برطانوی وظیفہ کس کو دیا جائے۔ آغا سید احمد شیخ صاحب کے زمانے میں کافی اختیارات کے ساتھ کام کر رہے تھے۔ اُس نے صادق صاحب کو بتایا تھا کہ نورالدّین صاحب کے نو بچے ہیں۔ اگر وہ انگلستان ڈپلوما کیلئے نہ گئے تو اُنہیں ترقی نہیں دی جاسکتی۔ نور صاحب ریاضیات میں ایم اے ہیں۔ اس کے علاوہ اُنہوں نے بی ایڈ بھی کیا ہے۔ اس لئے اُنہیں پہلا موقعہ دیا جانا چاہیے۔ اس کے علاوہ وہ انسپکٹر آف سکولز ہیں۔ وہ اس لئے بھی انگلستان جانے کے زیادہ مستحق ہیں۔ جب نورالدّین صاحب واپس آ گئے تو شیخ صاحب نے اُنہیں کہا کہ وہ ٹیچرس کالج میں کام کریں۔ مختار صاحب فُل برائٹ پر امریکہ چلے گئے تھے۔ ٹیچرس کالج میں پرنسپل کی جگہ خالی ہوگئی تھی۔ ناظم تعلیمات کی میرے ساتھ بنتی نہیں تھی۔ میں خودسر تھا اور اس لئے اپنی مرضی کے مطابق کام چلاتا تھا۔ وہ چار ماہ کے لئے امریکہ چلے گئے تھے۔ میں نے لازمی تعلیم کے بارے میں بہت کچھ پڑھا تھا۔ یہ بھی کہ پسماندہ سماج میں لازمی تعلیم کیسے پھیلا دی جائے اور اسے کیسے ترقی دی جائے۔ یونسکو (UNESCO) نے تقریباً پچاس کتابیں لازمی تعلیم پر شائع کی تھیں۔ جے پی نائیک بہت قابل آدمی تھے۔ عابد حسین صاحب نے لازمی تعلیم پر انڈین بک لکھی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ ایسی عمر کے بچوں کو لیا جائے جن کی تعداد کم سے کم ہو اور جس سے پیسہ بچایا جاسکے۔ لوگ چالیس فیصد، تیس فیصد، بنیادی تعلیم کے بارے میں باتیں کرتے تھے جس میں صرف پندرہ فی صد لڑکیاں آتی تھیں۔ ڈائریکٹر صاحب انفنٹ (Infant) سکولوں کی بھی بات کرتے تھے۔ اُن کی تجویز کسی عوامی مطالبے کی بنیاد پر نہیں تھی۔ میں نے اُن کے خلاف اپنا نوٹ لکھا تھا جو اُن کو بُرا لگا تھا۔ وہ مجھے طعنے دیتے تھے کہ میں اپنے قلم سے ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ میں ماہر تعلیم ہوں۔ اسی اثنا میں شیخ صاحب گرفتار ہوئے۔ اُسی دن پہلگام میں ہیڈ ماسٹرس کانفرنس ہو رہی تھی جس میں میں تقریر کرنے والا تھا۔ ڈاکٹر

اشرف صاحب[1] میرے گھر میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ انہوں نے کھڑکی سے سر باہر نکال کے اونچی آواز میں مجھے خبر دی کہ شیخ عبداللہ کو گرفتار کیا گیا ہے۔ اُنہوں نے آٹھ بجے کی خبر سُنی تھی۔ میں نے کہا مجھے کانفرنس میں جانا ہے اور میں نکل گیا۔ مہاراج بازار سرینگر پہنچتے پہنچتے میری موٹر کا کلچ (Clutch) ٹوٹ گیا۔ جوں توں میں نے اُسے موٹر گراجز تک پہنچادیا۔ گراجز والوں نے کہا کہ میرا چھکڑا بھی بلوائیوں نے خراب کردیا ہے اس لئے میں وہ بھی نہیں لے سکتا۔ میں چلتے چلتے سیدھا گھر پہنچا اور اس کے ساتھ ہی میری انسپکٹری بھی ڈوب گئی۔ ایک دو دن کے اندر اندر ہی ڈائریکٹر صاحب نے تین ہیڈ ماسٹروں کو جو شیخ صاحب کے حامی تھے سیاسی وجوہات کی بناء پر تبدیل کیا۔ ان میں سے ایک صاحب کو ریاسی بھیج دیا گیا۔ میں نے بخشی صاحب کو خط لکھا کہ میرے ہیڈ ماسٹروں کو مجھ سے پوچھے بنا ہی تبدیل کیا گیا ہے۔ لہٰذا میں اس بناء پر گزارش کرتا ہوں کہ مجھے بھی یہاں سے سبکدوش کیا جائے۔ پانچ منٹ کے اندر اندر نورالدّین صاحب تشریف لائے۔ دکھائی دیا کہ وہ میری جگہ سنبھالنے کیلئے منتظر تھے۔ مجھے ٹیچرس کالج کا ایکٹنگ پرنسپل بنادیا گیا۔ اس طرح میں نے اس کالج کی چھوٹی سی جگہ سنبھال لی۔ جب نورالدین صاحب تشریف لائے، اُنہوں نے کہا کہ وہ یہاں نہیں آنا چاہتے تھے مگر۔۔۔ میں نے کہا۔ ''دیکھئے نورالدین صاحب ہمارے درمیان کوئی رنجش نہیں۔ شیخ صاحب کو میری ضرورت تھی اور میں چلتا رہا۔ بخشی صاحب کو آپ کی ضرورت ہے اور آپ یہاں آئے۔ ہم آپس میں دوست ہیں۔ خدا حافظ''۔ میں خوش تھا کہ ساٹھ طلباء اور طالبات کے ساتھ میں جڑ گیا۔ ان میں کچھ ذہین تھے۔ میں نے انگلستان اور دیگر یورپی ممالک کے بارے میں گفتگو شروع کی اور تعلیم کو

۱۔ کمیونسٹ لیڈر ڈاکٹر اشرف انگلستان سے اپنی انگریز بیوی کے ساتھ واپس آئے تھے اور میرے گھر میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں نے شیخ صاحب کے ذریعے ولبھ بھائی پٹیل اور پنڈت نہرو پر اُس کی واپسی کے بارے میں دباؤ ڈلوایا تھا۔ اشرف صاحب چوٹی کے لیڈر تھے۔

بازی گاہ بنایا۔ میں نے اپنا اصلی کام شروع کیا اور وہ بھی حادثات کے طفیل۔ میں اُستادوں کا اُستاد بن گیا۔ یہ کام ایک خستہ حالت بلڈنگ میں شروع ہوا جو اُس کوچے کے بالکل نزدیک تھی۔ جو ڈاکٹر علی محمد جان کی رہائش کی طرف جاتا تھا۔ ۱۹۵۵ء میں تاہم ہمیں اُس جگہ منتقل کیا گیا جہاں گورنمنٹ کالج فار وومن کے ساتھ ہی مولانا آزاد روڈ پر آج کالج آف ایجوکیشن چل رہا ہے۔ اس کے بعد میری گھر والی کو اسی بلڈنگ میں بھیج دیا گیا۔ لڑکیوں کیلئے ہائی سکول اس میں منتقل کیا گیا تھا اور میری گھر والی اول مدرّسہ تھی۔ اس دوران غلام احمد مختار صاحب امریکہ سے واپس آئے۔ میں نے ایک دن اُن کو کھانے پر بُلایا۔ باتوں باتوں میں میں نے جان ڈیوی کا نام لیا۔ اُس نے کہا اُس کا خیال ہے وہ ڈیوی سے شکاگو میں ملے۔ ویسے جان ڈیوی چار سال پہلے فوت ہو چکے تھے۔

ٹیچرس ٹریننگ کالج میں کام کرنا روح افزا تھا۔ میں اپنی اصلی جگہ پر آ گیا تھا مگر گرداری لال ڈوگرہ، خواجہ غلام محمد صادق میر قاسم اور ڈی پی دھر صاحب بخشی صاحب سے ملے اور اُنہیں بتایا کہ آغا اشرف کا انسپکٹری سے ہٹنا اچھا قدم نہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ اُن کی چاہت تھی انتظامیہ کا سُدھار اور اس کا صحیح ڈھنگ پر چلنا۔ مگر ڈی پی صادق صاحب اور میر قاسم کے ذہن میں کچھ اور تھا۔ کمیونٹی ڈیولپمنٹ اور نیشنل اکسٹنشن کے پروگراموں کی کچھڑی خوب پک رہی تھی۔ روس کی طرح فیملی پلاننگ اور امریکہ کی طرح دیہات سدھار کی ہوائیں چل رہی تھیں۔ گرام سیوکوں (جنہیں ولیج لیول ورکز کہہ کے پکارا جاتا تھا) کی تعمیری سیوا سے بہت اُمیدیں جُڑی جا رہی تھیں۔ اُنہوں نے کافی پیسہ حاصل کیا تھا جو سیاسی فائدوں کیلئے استعمال کیا جا رہا تھا۔ پس مجھے بھیج دیا گیا کہ میں ان کاموں کیلئے انسانی وسیلہ تیار کروں۔ دو سو ولیج لیول ورکر، نو بلاک ڈیولپمنٹ افسر جن میں سے کچھ بعد میں اور بھی اوپر چڑھے اور نیشنل کانفرنس کے جنرل سیکریٹری شمس الدین صاحب جیسے لوگ میرے حوالے کئے گئے۔ ان میں سے ایک صاحب بھارت میں کسی جگہ ہائی کورٹ کے جج

ہو گئے۔ ان میں کچھ لوگ سیاسی غنڈے تھے۔ شالیمار میں سر مراتب علی شاہ کی پانچ عمارتیں تھیں۔ ایک میں ہم لوگوں نے اپنا کام شروع کیا۔ مجھے یاد ہے کہ وہاں ایک ذہین لڑکا تھا۔ اُس کی تصویر موجود ہے میرے پاس۔ وہ ریاست کے تمدّن کا ڈائریکٹر جنرل بن گیا۔ کیا شاندار نام ہے اُس کا، محمد یوسف ٹینگ! مگر تھا وہ گرام سیوک! پیر غیاث الدین میرے وائس پرنسپل تھے۔ موتی لال مصری صاحب بھی پڑھاتے تھے۔ مصری صاحب کمیونسٹ تھے۔ غیاث صاحب کے بارے میں کہتے ہیں کہ ترقی پسند تھے۔ موتی لال مصری یونائیٹڈ فروٹ کمپنی کے بارے میں باتیں کرتے اور گوتمالا میں امریکیوں کی مداخلت کے بارے میں بھی۔ صادق صاحب، ڈی پی در صاحب اور قاسم صاحب خوش تھے کہ وہ بائیں بازو کی قوّت بڑھا رہے ہیں۔ مگر جب بخشی صاحب آئے تو وہ برہم ہوئے۔ کتنے ذہین تھے وہ۔ اُنہوں نے کچھ سوال پوچھے۔ گوتمالا کو سامنے لایا گیا۔ وہ بہت افسردہ ہو گئے۔ اُنہوں نے کہا کہ ہندوستان کی خارجہ پالیسی کی باتیں کیا کرو۔ وہ حقیقت پسندی کا صحت مند تصور پیش کرنے پر زور دینے لگے۔ اُنہوں نے کہا گوتمالا کیوں؟ میں نے سوچا کہ مجھے تعلیم کیلئے تیار کیا گیا ہے اور میرا کام ہے کردار سازی مگر ستم ظریفی یہ ہے کہ مجھے کلچر سے ایگریکلچر لایا گیا ہے۔ میرا کام کردار بنانا ہے مگر یہاں بیلوں کو آختہ کرنے کا کام ہے۔ سب سے بڑا مذاق یہ ہے کہ مجھے علم کا نور پھیلانا ہے مگر یہاں مصنوعی طریقے سے گائیوں کو حاملہ بنانا ہے[1]۔ ڈاکٹر بھان صاحب نے جب یہ کہانی سنی تو کہا یہ Readers Digest کیلئے موزون ہے۔ چند مہینے کے بعد جب صادق صاحب ملے تو انہوں نے کہا مجھے انسپکٹر آف سکولز کا کام سنبھالنا چاہیے کیونکہ اس طرح اچھے استاد پیدا ہونگے۔ اس سے پہلے نورالدّین صاحب نے مجھے ایک ریستورانت میں چائے پر بلایا تھا اور کہا تھا کہ وہ باضمیر انسان کی

1. The irony of it all: from culture to agriculture, from character formation to castration of the bull, and to top it all, from the dissemination of knowledge to the artificial insemination of the cow..."

حیثیت سے کہتے ہیں کہ صادق صاحب مجھ سے ملنے والے ہیں۔ صادق صاحب اُن دنوں تعلیم کے منسٹر تھے۔ ۹ مئی ۱۹۵۵ء کو میں ٹیچرس کالج سرینگر کا پرنسپل بن گیا۔ میں اس کالج میں برابر پانچ سال کام کرتا رہا۔ ان پانچ سالوں میں میں نے اساتذہ کو تعلیم سے آراستہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی تاکہ قابل اور دردمند استاد پیدا ہوں۔ یہ نئی لہر تھی جس سے چھوٹے بڑے قریباً سب لوگ خوش ہوئے۔ فیضی صاحب اور پروفیسر ہمایوں کبیر بھی خوش ہوئے۔ ہمایوں کبیر کو تو فیضی صاحب نے میرے کالج میں لایا بھی۔ میں نے کالج میں اساتذہ کی ایک اچھی ٹیم بنائی تھی۔ میں جب کالج میں گھس گیا تھا تو صرف تین یا چار اُستاد تھے۔ میں نے نو دس اساتذہ کو لایا اور اُنہیں اپنے پاؤں پر کھڑا کر کے کھلی ہوا میں سانس لینے کی موثر تربیت دی۔ میں جب آیا تو ساٹھ طلباء اور طالبات کو پایا۔ پھر جلدی ہی چار سیکشنوں میں دو ڈھائی سو طلباء اور طالبات جمع ہو گئے۔ میں نے خود سند یافتہ امیدواروں کو داخلہ دے دیا۔ میں نے لائبریری کھلی چھوڑ دی اور اچھی کتابیں جمع کیں۔ اُستاد کتابوں کی دُنیا دیکھنے لگے۔[1] پڑھنے والے اچھی انگریزی جانتے تھے۔ ایک لڑکا بنرجی مصری تھا جو لکھنو سے پڑھ کے آیا تھا۔ دوسرا گردھاری لال لابرو جو بعد میں ریجنل انجینئرنگ کالج سرینگر میں ہیومنی ٹیز میں پروفیسر آف انگلش کی حیثیت سے کام سرانجام دیتا رہا۔ میں اپنے شاگردوں کی اہلیت اور قابلیت دیکھ کر پھولے نہ سماتا تھا اور سوچتا تھا کہ مجھے ہر وقت بے بہا دولت انسانوں کے روپ میں حاصل ہوتی ہے۔ وہ اُن سب کتابوں کو پڑھتے تھے جو میں نے انگلستان سے لائی تھیں۔ میرا ذہن اُن دنوں کتنا تازہ تھا۔ میں نے کارل مان ہائیم کی Diagnosis of Our Time لازمی قرار دی تھی۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں یہ کتاب بہت معنی خیز ہے۔ ۱۹۵۴ء میں میرے گھر والی اور میری بڑی بھابی بیگم نزہت

۱۔ یہ دُنیا کتنی پراسرار دنیا ہے۔ اس میں وسعت بھی ہے اور حیرت انگیز گہرائیاں بھی۔ یہاں بلا لحاظ مذہب وملت، رنگ ونسل، ملک وقوم، زمان ومکاں پاک روحوں سے ملاقات ہوتی ہے۔ ان روحوں کا تخلیقی کام کبھی رُکتا نہیں۔

آغا بھی کالج میں بی ٹی کیلئے بھیج دی گئی تھیں۔ میری والدہ چیف انسپکٹرس آف سکولز تھیں۔ بخشی صاحب نے اُنہیں کہا تھا کہ حکومت نو گرلز سکول کھولنے کے بارے میں سوچ رہی ہے۔ اُنہیں مسلمان گریجویٹ عورتیں درکار ہیں؟ میری والدہ گھر گھر گئی تھیں۔ تین شیعہ لڑکیاں، الطاف حسین صاحب کی تین بہنیں، صاحبزادہ محمود صاحب کی گھر والی اور بہن جمیلہ بیگم، نزہت آغا اور میری گھر والی بی ٹی کیلئے بھیجی گئی تھیں۔ جب ان مسلمان خواتین کو بی ٹی کے بعد ہیڈ مسٹرس بنایا گیا، کشمیری پنڈتوں کے تعلیم یافتہ سرکل میں منفی احساس کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اس وقت میں سوچتا ہوں کہ پنڈت لڑکیوں نے اُس وقت کیا سوچا ہوگا جب اُن جیسی ہی مسلمان لڑکیوں کو ہیڈ مسٹرس بنا دیا گیا تھا۔ ان تجربہ کار پنڈت عورتوں نے بھی اپنے اعصاب پر نو آموز مسلمان عورتوں کے افسر بننے کا بوجھ محسوس کیا ہوگا۔ مگر میں جانتا ہوں کہ بجز چار پانچ مدرسوں کے کشمیر میں عام طور پر اُردو زبان نہ صرف زبان کے طور پر پڑھائی جاتی تھی بلکہ ذریعہ تعلیم بھی تھی۔ پنڈت خواتین اُردو سے ناواقف تھیں۔ ہندی جانتی تھیں۔ یہ نازک معاملہ میں نے بھی ایک رپورٹ میں زیر بحث لایا تھا۔ میں اس دقت کو دور کرنے کیلئے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں برابر پانچ سال ہر دفعہ تیس سے پچاس پنڈت لڑکیوں کو داخل کرتا تھا۔ اُن کے ساتھ دو تین مسلمان عورتیں بھی ہوتی تھیں۔ ایک زمانے میں ساجدہ ضمیر احمد اور بیگم جلال الدین کالج کی وائس پرنسپلز ہوا کرتی تھیں۔ میرے جانے کے بعد اُن کو بھی اسی کالج کا پرنسپل بنایا گیا۔ واقعی بیگم جلال الدین بڑی قابل خاتون تھیں اور نفسیات (psychology) پر پورا عبور رکھتی تھیں۔

اسی زمانے کی ایک دلچسپ داستان! سردار ہربنس سنگھ یا تو سٹیٹ منسٹر تھے یا منسٹر مگر تعلیم کا قلمدان اُن کے پاس تھا۔ سردار صاحب سیدھے سادھے انسان تھے۔ ایک دن پورے دس بجے ہمارے کالج میں داخل ہوئے اور مجھے غیر حاضر پایا۔ میں نے اُنہیں نوٹ بھیجا کہ میں کشمیر بک شاپ میں کالج کیلئے کتابوں کا انتخاب کر رہا تھا، غیر حاضر نہ تھا۔ ایک

اوردن ٹورسٹ سنٹر ہال میں یونیورسٹی سنیٹ کی میٹنگ ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر کرن سنگھ صاحب چانسلر کی حیثیت سے میٹنگ کی صدارت کر رہے تھے۔ میری ایک طرف صاحبزادہ محمود پرنسپل بیٹھے ہوئے تھے دوسری طرف میری والدہ، چیف انسپکٹرس۔ میٹریکولیشن کے بہت ہی خراب نتائج نکلے تھے۔ ایس پی ہائی سکول کے نتائج زیادہ ہی خراب تھے۔ سردار صاحب اُٹھے اور بہت ہی طیش میں اُستادوں پر ٹوٹ پڑے۔ کہنے لگے کہ استادوں کی سالانہ ترقی روک دی جائیگی۔ میری والدہ میری نبض پہنچانتی تھی۔ اُنہیں معلوم تھا کہ میں اُٹھوں گا اور جوابی حملہ کروں گا۔ اُنہوں نے میری چٹکیاں لینا شروع کیں کہ میں نا بولوں۔ مگر میں نے کہا۔ ''جناب سردار صاحب، اس سے زیادہ کوئی چیز نامناسب نہیں کہ اُستادوں کو اُس چیز کے لئے سزا دی جائے جس کیلئے وہ ذمہ دار نہیں۔ کیا قصور ہے اُستادوں کا۔ بسکو سکول کے بچے اُن گھرانوں سے آتے ہیں جو امیر ہیں، جن کے گھرانے بہتر ہیں، جن کے پڑھانے کیلئے سکول سے باہر انتظامات ہیں، جہاں کلاس میں ۳۰ سے زیادہ طالب علم نہیں ہوتے۔ آپ اُن کا مقابلہ ایس پی سکول کے طلباء کے ساتھ کرتے ہیں؟ وہاں تو قصائیوں اور ڈرائیوروں کے بچے آتے ہیں اور پہلی دفعہ تعلیم کا نام سنتے ہیں۔ اُن کے گھر کے حالات اچھے نہیں ہوتے۔ اُن کے لئے گھر پر پڑھانے کا انتظام نہیں ہوتا۔ وہاں اسّی سے نوّے لڑکے کلاس میں ہوتے ہیں''۔ سردار صاحب برانگیختہ ہو گئے اور کرن سنگھ کو کہا کہ ''ہمیں اسے معطل کرنا چاہیے۔'' کرن سنگھ نے خوب قہقہہ مارا۔ تاہم مجھے معطل نہیں کیا گیا۔ میں کالج آف ایجوکیشن کا پرنسپل بنا رہا اور فرائڈ، مارکس اور ڈارون کے ساتھ ساتھ تاریخ کے آئینے میں سماج اور سماجی تبدیلیوں کو پڑھاتا رہا تا کہ اُستاد جدید دور میں انسانی ذہن کی تشخیص کر سکے اور تعلیم کو حالات حاضرہ کے ساتھ جوڑ سکے۔ سردار ہربنس سنگھ وزیر تعلیم ریاست جموں و کشمیر چاہتے تھے کہ امتحانی نتائج کی بنیادوں پر تعلیم کی عمارت تعمیر ہو جائے۔ یہ تضاد وہاں سے ہی چلا آ رہا ہے جہاں سے کوہکن کا افسانہ شروع ہوا اور قصۂ دار و رسن جو

حلاّج منصور کے خون سے بہاراں ہے!

کشمیر میں ہر مذہب اور ہر فرقے کے لوگ منسٹر بن گئے۔ پرنسپل کالج آف ایجوکیشن کی حیثیت سے مجھے اُن کے ساتھ نباہ کرنا پڑا۔ ان میں کیپٹن بھی تھے، میجر بھی تھے اور کرنل بھی۔ لداخ کا کوئی لاما خاص کر کوشک بکولا میرے نصیب میں نہ تھا۔ بہر کیف! آغا ناصر علی میرے بڑے برادر آئی، اے، ایس میں شامل ہو گئے تھے۔ ان کو اس نئی ترقی کا احساس ضرور ہوا تھا۔ ایک دن وہ میرے گھر آئے اور کہا "آپ میرے لئے مسئلہ پیدا کرتے ہیں۔ بخشی صاحب آپ کو پونچھ تبدیل کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ آپ کو کیا اعتراض ہے کہ میرے ساتھ بخشی صاحب کے پاس آو اور اُنہیں سلام کہدو۔ وہ آپ سے کوئی سیاسی کام نہیں لیں گے۔" میں نے کہا میں ضرور آؤنگا۔ بخشی صاحب سے ملنے کا پس منظر کچھ عجیب سا تھا۔ لگتا ہے کہ بخشی صاحب نے پنڈت شیام لال صراف وزیر تعلیم کو بتایا تھا کہ وہ ٹیچرس کالج کا معائنہ کریں۔ صراف صاحب یقیناً آ ہی گئے۔ میں جانبداری کے بغیر مگر یقین سے کہوں گا کہ اُس نے میرے ساتھ قابل مذمت سلوک کیا۔ جونہی وہ موٹر سے باہر آئے، میں نے آداب بجالائے۔ اُس نے میرے پیچھے کھڑے میرے چپراسی کی طرف دیکھا جو ہارون کے علاقے میں رہتا تھا۔ وہ چمڑے کی پشم دار ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔ صراف صاحب غصّے میں آ کر اُس پر ٹوٹ پڑے۔ "یہ ٹوپی پھینک دو۔ تمہیں پگڑی پہنے ہوئے آنا چاہیے تھا، مناسب قسم کی پگڑی"۔ بے چارے چپراسی نے اُسی وقت ٹوپی اُتار دی۔ جب صراف صاحب پہلی منزل پر چڑھ رہے تھے اُس نے دیکھا کہ سیڑھیوں پر ٹاٹ بچھی ہوئی تھی۔ اُس نے پھر غصّے سے بولا۔ "یہ کیا ہے"؟ میں نے کہا جناب یہ ٹاٹ ہے۔ وہ پھر بولے۔ "آپ نے گیسٹ ہاؤس دیکھا ہے؟ دو اطراف سے لکڑی پالش کی ہوئی ہوتی ہے اور بیچ میں چھوٹی پتلی دری"۔ میں نے کہا جناب ہم اس کی طرف توجہ دیں گے۔ میں سمجھ گیا کہ یا تو بخشی صاحب کے فرماں کے مطابق صراف صاحب ڈانٹ

بتا رہے ہیں یا وہ اُس بیاہ کا انتقام مجھ سے لے رہے ہیں جو پنڈت برادری کے خلاف میرے ہاتھ سے ہوا تھا، یعنی دُرگا کا بیاہ۔ جو کچھ بھی حقیقت تھی مگر ڈانٹ پڑی مجھے۔ سٹاف روم میں چائے کیلئے جانے کے وقت تک صراف صاحب کا غصہ ذرا ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ اُسی وقت اُس نے مجھے ایک خوبصورت مگر عجیب وغریب مشورہ دیا۔ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر اُس نے کہا سمجھ لو کہ یہاں گلے کے نیچے میرا سینہ نیچے کی طرف چاک ہے۔ اس چاک پر زِپ لگا ہوا ہے اور اندر دل کے قریب میں نے اسپنج رکھا ہوا ہے۔ دن بھر میرے اوپر جو گذرتی ہے وہ اسی اسپنج میں جمع ہوتی ہے۔ شام کے وقت جب میں گھر پہنچتا ہوں تو زِپ نیچے اُتار کر اسپنج میں جمع دن کے سارے بخارات بھینچ لیتا ہوں جس طرح پانی۔ پھر اسپنج اپنی جگہ پر رکھتا ہوں اور آرام سے سوتا ہوں۔ اس طرح میری زندگی کامیاب اور آرام دہ بنتی ہے۔'' اس کے بعد ایک دن پرنسپل صاحبان کی میٹنگ میں میں نے خوب قہقہہ مارا۔ کبھی کبھی میں بہت ہنستا ہوں۔ کیا کروں۔ اس میٹنگ میں صراف صاحب پرنسپلوں سے خطاب کر رہے تھے۔ اُن کی کوشش تھی کہ صحیح انگریزی بولیں۔ مگر اُن کی زبان سے اچانک نکلا "Thanks Gods"۔ میں اپنے اوپر قابو پا نہ سکا اور زور زور سے قہقہہ مارا۔ مس محمودہ احمد علی بھی میٹنگ میں بیٹھی تھیں۔ اُن دنوں صادق صاحب منسٹر نہیں تھے۔ اُنہوں نے ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس بنائی تھی۔ صراف صاحب بولتے گئے، بولتے گئے، کہتے گئے کہ یہ ہوا، وہ ہوا، وغیرہ وغیرہ۔ "And What Nots"۔ میرا قہقہہ gods کے بعد Nots سے اور بھی بھڑک اٹھا۔ صراف صاحب غصے میں بولے۔ ''آپ کیوں ہنس رہے ہیں؟'' میں نے کہا۔ جناب محمودہ جی مجھے ۱۹۵۳ء کا ایک مذاق یاد دلا رہی ہیں۔ صراف صاحب نے فرمایا۔ ''اچھا، اچھا، سمجھا''۔ صراف صاحب یہ مسالہ ڈالکر بخشی صاحب کے پاس جاتے تھے اور میرا پتا کاٹنے کی کوشش کرتے تھے۔ میں سمجھتا ہوں اُنہوں نے کالج کے دورے کو اپنے رنگ میں ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ شاید بخشی صاحب کے ذہن میں صراف صاحب کی

باتیں جمع تھیں۔ جب میں اُن کے پاس پہنچا، وہ باغ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آغا ناصر صاحب دور ایک طرف کھڑے تھے۔ وزیر تعلیم صراف صاحب بھی دس بیس گز دور کھڑے دیکھ رہے تھے کہ بخشی صاحب میرے ساتھ بہت قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ بخشی صاحب اس طرح سے میرے ساتھ باتیں کر رہے تھے جس طرح دوست۔ اُنہیں معلوم تھا کہ ۵۳ء سے ۵۸ء تک مجھے تکلیف دی گئی تھی۔ مگر بذات خود وہ نیک آدمی تھے۔ اُنہوں نے میرے ساتھ اچھا برتاؤ کیا تھا۔ ہوائی اڈے کی کہانی میں کہہ چکا ہوں۔ مگر ایک دن میں اور مجیب صاحب پہلگام میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ انہوں نے آم کی دو ٹوکریاں بھیجی تھیں، ایک مجیب صاحب کیلئے اور دوسری میرے لئے۔ اُنہیں دوست بنانے کی قابل ستائش اہلیت تھی۔ میں اُن کا ممنوں تھا۔ میں چونکہ اُن کے بغل میں بہت قریب بیٹھا تھا، اُنہوں نے کہا۔ ''لوگ میرے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ کمیونزم کا لٹریچر شاگردوں میں بانٹتے ہیں اور کمیونزم پھیلاتے ہیں۔''[1] میں نے کہا جناب میں اُستاد ہوں۔ میرا کام سوشلزم یا سرمایہ داری نظام کا ڈھنڈورا پیٹنا نہیں۔ البتہ تاریخ پڑھانا، تاریخ کا پس منظر سمجھانا میرا فرض ہے۔ اُنہوں نے آپ کو شاید یہ نہیں بتایا ہے کہ میں چار آنے کی کتاب The Origins of the Family بھی پڑھاتا ہوں جو اینگلز (Angels) نے لکھی ہے۔ میرا مقصد ہے یہ سمجھانا کہ تاریخ کا پہیہ کیسے گھومتا ہے۔ اس سے اُستادوں کا زندگی سے متعلق ایک مصدّق نظریہ بنتا ہے۔ اُنہوں نے آپ کو نہیں بتایا کہ میں نے امریکہ کے پروپیگنڈے کو بھی درسیات میں شامل کیا ہے۔ The God that Failed اس کی زندہ مثال ہے۔ یہ کتاب اُن تین آدمیوں کی داستان ہے جو پہلے کمیونسٹ تھے اور پھر کمیونزم سے بیزار ہوئے۔ میں کسی کو کمیونسٹ نہیں بناتا۔ بخشی صاحب نے پھر کہا کہ لوگ اُنہیں کہتے ہیں کہ آغا اشرف

۱۔ میری انسپکٹری کے دوران بلراج پوری نے بھی اخبار میں لکھا تھا کہ انسپکٹر آف سکولز کشمیر میں کمیونسٹ لٹریچر تقسیم کر رہا ہے۔ یہ بات میں نے بعد میں سُنی تھی۔

رشوت لیتا ہے۔ اُنہوں نے اُنہیں جواب دیا کہ نور محمد زیادہ راشی ہے یا آغا اشرف۔ یاد رہے کہ نور صاحب صادق صاحب کے پرائیویٹ سیکریٹری رہ چکے تھے۔ بخشی صاحب نے اپنا کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ وہ مجھ سے کچھ نہیں چاہتے۔ مظفر صاحب اور ناصر صاحب روز ان کے پاس آ کر بیٹھتے ہیں، وہ مجھ سے قرب چاہتے ہیں اور کچھ نہیں۔ بخشی صاحب کے ساتھ یہ ملاقات سرکاری اعتبار سے آخری تھی۔ میں پرائم منسٹر بخشی صاحب سے پھر کبھی نہیں ملا اور نہ اُنہوں نے مجھے پونچھ بھیج دیا۔

ٹیچرس کالج کے ایام کا ایک اور واقعہ ہے ونوبا بھاوے کا کالج میں آنا۔ وہ شاید ۱۹۵۸ء میں آئے تھے۔ (مجھے اچھی طرح یاد نہیں)۔ میں اُن سے ملا تھا اور اُنہیں کالج تشریف لانے کی دعوت دی تھی۔ اُس سال ہمارا پروجیکٹ گاندھی تھا۔ ہم نے مہاتما پر اچھا خاصا کام کیا تھا۔ تصویریں بنائی تھیں۔ طلباء اور طالبات سے مضامین لکھوائے تھے اور گاندھی جی کی رنگ رنگ باتوں کو جمع کیا تھا۔ ونوبھاوے گاندھی جی کے چیلے تھے۔ اُنہوں نے آنے کیلئے مشکل ترین شرط رکھی۔ کہا کہ وہ صبح کے چار بجے آئیں گے۔ میں نے سوچا کہ کچھ طالب علموں اور اُستادوں کو کالج کے سٹاف روم اور بڑے کمروں میں ٹھہرائیں گے۔ طلباء اور اساتذہ کی یہ ٹیم رات بھر کافی (coffee) پیتی رہی، سینڈوچ کھاتی رہی اور جوں توں کر کے رات کٹ گئی۔ صبح چار بجے ونوبا بھاوے آ گئے اور تیز تیز چلتے۔ اُن کے ساتھ جنرل یادوناتھ سنگھ اور کچھ لوگ تھے۔ سرینگر کے میئر (Mayor) بھی اُن کے ساتھ تھے۔ ونوبا بھاوے بیٹھے اور وہ سب چیزیں دیکھیں جو ہم نے گاندھی جی پر تیار کی تھیں۔ اب صبح ہو گئی تھی اور کشمیر کے لافانی گویّے بھانت بھانت کے بھجن، ڈالی ڈالی چہچہا رہے تھے۔ اُن کی مُدھر آوازوں سے گردوپیش گونج اُٹھا تھا۔ ونوبا بھاوے نے بھی زبان کھولی اور کہنے لگے۔ ”یہ مت سوچو کہ گاندھی واد برمہا ہے یا کوئی چھل یا مایا۔ آپ کو پتہ ہے کہ آج کل کا بچہ گاندھی جی سے بھی زیادہ عقل مند ہے۔ آپ نے کسی گاؤں کا مکان جلتا ہوا دیکھا ہوگا۔ سب سے لمبا انسان کسی بچے کو اپنے کاندھوں پر

اُٹھالیتا ہے۔ چونکہ بچہ کاندھوں پر ہوتا ہے وہ دور دور تک دیکھ سکتا ہے۔ وہ بتا سکتا ہے کہ کس مکان کو آگ لگی ہے۔ آج کا بچہ گاندھی جی کے کاندھوں پر سوار ہے۔ اس لئے آگے بھی دیکھ سکتا ہے اور پیچھے بھی اور دور دور تک''۔ یہ کہہ کر بس وہ چلا گیا۔ گویا آندھی کی طرح آیا اور طوفان کی طرح چلا گیا۔ کتنا عجیب معاملہ تھا صبح چار بجے کسی کالج کو دیکھنے کیلئے جانا۔

میں اگرچہ ٹیچرس کالج کے معیار جدید ترین سطح پر نہ لا سکا تاہم ہر وقت طلباء اور طالبات کے ساتھ ساتھ کالج کے اساتذہ نے نئی زندگی، نیا طرزِ عمل محسوس کیا۔ ہر سال کالج میں کوئی نیا رنگ، کوئی نئی روش، کوئی نئی بات ہوتی تھی۔ کوئی بھی شخص اُکتاہٹ محسوس نہ کرتا تھا۔ چنانچہ طلباء اور طالبات کو تاریخ عالم کے بدلتے ہوئے اور پھیلتے ہوئے رُخ سے واقف کرانے کیلئے میں نے ایک کارآمد طریقہ اختیار کیا تھا۔ ہم کسی کلیدی (key) پروجیکٹ کا انتخاب کرتے تھے اور اس کے اردگرد طلباء، طالبات اور اساتذہ مختلف قسم کا مواد جمع کرتے تھے۔ اس کی مدد سے ایسا سامان تیار ہوتا تھا جس پر نمائش کا اہتمام ہوتا تھا۔ نمائش کلیدی پروجیکٹ کے مختلف پہلوؤں پر دلالت کرتی تھی۔ اس طرح ۱۹۵۵ء میں ہم نے انسانی حقوق[1]، ۱۹۵۶ء میں قدیم انسان (کس طرح دھیرے دھیرے ارتقاء کی منزلین

۱۔ ۱۹۳۴ء کی بات ہے کہ میرے نانا آغا سید حسین سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور سے منگواتے تھے اور میں پڑھتا تھا۔ حالانکہ میں گیارہ بارہ سال کا لڑکا تھا۔ اس میں ایک دفعہ جواہر لال نہرو اور ایچ جی ویلز (H.G.Wells) کے درمیان اختلاف سامنے آئے۔ اُن دنوں نہرو انسانی حقوق کی بڑی وکالت کرتا تھا اور وہ بھی ویلز کے پاس۔ وہ اُس اقتصادی نظام پر بھی گفتگو کرتا تھا جس کا مدعا عام انسانوں کی خوشحالی اور بہبودی ہے۔ ویلز نہرو کا جواب طنز آمیز الفاظ میں دیتا تھا اس لئے کہ انگریز گو کہ احساسِ کمتری کا شکار ہے مگر اپنی گھبراہٹ چھپانے کیلئے اکثر زبان کی تلوار سے کاٹتا ہے۔ ہمیں دراصل یہ کہنا ہے کہ مہاتما گاندھی نے بھی اس بحث میں اپنی رائے پیش کی تھی۔ میں نے اسے ایک البم سے حاصل کیا تھا جس میں تصاویر تھیں اور جو ۱۹۴۸ء میں چارٹر آف ہیومن رائٹس (Charter of Human Rights) پر بنایا گیا تھا۔ ان تصویروں میں گاندھی جی کی ایک تصویر تھی جس کے نیچے لکھا ہوا تھا:
میں نے ماں کے قدموں میں سیکھا کہ حقوق کوئی چیز نہیں۔ اگر کوئی چیز ہے تو وہ ہے فرائض۔ اگر فرائض اچھی طرح نبھائے جائیں تو اُن ہی سے ہی حقوق جنم لیتے ہیں۔ (بقیہ اگلے صفحے پر)

طے کرتا رہا)، ۱۹۵۷ء میں امریکہ، سوویت روس، چین اور ہندوستان اور ۱۹۵۸ء میں مہاتما گاندھی پر نمائش کا اہتمام کیا تھا۔ ایک سال ہمارے طلباء اور طالبات مختلف کمروں میں کام کر رہے تھے۔ کتابیں جمع کر رہے تھے اُن کا مطالعہ کر رہے تھے، اٹلس دیکھ رہے تھے، خاکے اور نقشے بنا رہے تھے، لغات اور قاموس (Encyclopaedia) استعمال کر رہے تھے اور اس طرح تحقیق سے اپنے دعوے ثابت کر رہے تھے۔ کرن سنگھ صاحب غیر رسمی طور پر آئے اور اچانک۔ اُنہوں نے سب کچھ دیکھا۔ میں نے اُنہیں دعوت دی کہ وہ نمائش کے دن افتتاح کیلئے تشریف لائیں۔ وہ آ گئے اور اُنہوں نے فرمایا۔ صادق صاحب بھی بنفسِ نفیس موقعے پر موجود تھے۔

> کچھ دن پہلے میں ٹیچرس کالج میں داخل ہوا۔ میں نے دیکھا کہ کالج بہترین علمی مشاغل کے شوق میں تن من سے محو ہے۔ ٹیچرس کالج ہمارے تعلیمی اداروں کی بوریت ختم کرنے کا عظیم شوق اپنے کاندھوں پر اُٹھائے بیٹھا ہے۔ ان علمی مشاغل سے چار سال میں قدیم انسان، گاندھی جی، انسانی حقوق، روس، چین، امریکہ اور بھارت کی تمدنی سرگرمیاں زیر بحث آئی ہیں اور ان پر فنی اور تخلیقی تحریریں وجود میں آئی ہیں۔

یہ تقریر ویلش ناتھ پریس نے چھاپ دی تھی۔ اس کے منیجر نے مجھے چار دن پہلے مطلع کیا تھا کہ وہ کرن سنگھ صاحب کی تقریر چھاپ رہے ہیں۔ یہ نمائشی تقریبات دھوم سے منائی

(گزشتہ سے پیوستہ)

(I learnt at the feet of my mother that there are no rights but only duties, and from duties well done, issue all rights).

یہ اقتباس یونسکو کے پیداہ کردہ البم میں موجود تھا جسے میں نے انسانی حقوق پر نمائش کیلئے استعمال کیا تھا۔ میرے شاگردوں نے مہاتما گاندھی کی تصویر اس طرح بنائی تھی کہ وہ اپنے دو ہاتھوں کو اپنی بھانجیوں کے شانوں پر رکھے ہوئے تھے۔ میں گاندھی کے یہ بول گاہے گاہے دہراتا آیا ہوں اور آج بھی دہراتا ہوں جب نہ گاندھی رہے اور نہ فرائض کی کوکھ سے حقوق کا جنم۔

جاتی تھیں۔ چارٹرینگ سکول ہمارے ساتھ ملحق تھے۔ ان کے ذمّے بنیادی استادوں کی تربیت تھی۔ یہ سکول بھی ہماری نگرانی میں نمائش میں حصہ لیتے تھے۔ ان سکولوں میں قریباً دو دوسو اور ٹیچرس کالج میں قریباً ایک سو پچاس اُستاد اور اُستانیاں زیرِ تربیت رہتی تھیں۔ پانچ ساڑھے پانچ بجے شام کے قریب احدوز کے بنائے ہوئے چائے کے جام حرکت میں آتے تھے۔ کچھ شرفاء، کچھ نامور شعراء، کچھ دانشور مہمانوں کی حیثیت سے شرکت کرتے تھے۔ وہ بھی چائے کی گرمی کے علاوہ اپنی تجربہ کار ذہنی سخاوت سے دلوں کو گرماتے تھے۔ یہ گرمئی فضا دیہات کے رہنے والے اُستادوں کیلئے زیادہ انوکھا، مسرت افزا ماحول مہیّا کرتی تھی اور وہ شام کو گھر لوٹتے تھے۔ دیہات کے اُستاد شاید زندگی میں پہلی دفعہ علم و دانش اور فکر و فلسفہ کے کرتب دیکھ کر زندگی کے نئے دریچوں سے آئی ہوئی شعاعوں کا نور دیکھتے تھے۔ اپنی اپنی جگہوں پر اس نور کی قوّت بھی آزماتے تھے۔ یقیناً کالج میں تمدّن کی آتشبازی ہوتی تھی۔ نمائش دیکھی بھی جاتی تھی اور اُس میں اُستاد اپنی محنتوں کے پھول بن بھی دیکھتے تھے۔

ٹیچرس کالج کے میرے ایّام میں پیسے وافر (abundant) نہیں ہوتے تھے۔ میں منسٹروں اور کئی اہم لوگوں سے پیسے وصول کرتا تھا تاکہ کچھ کام ہو۔ ۱۹۵۶ء میں سالانہ جلسے میں خواجہ غلام محمد صادق موجود تھے۔ میں نے اُن سے درخواست کی "جناب کیا میں اعلان کروں کہ آپ ہمارے کالج کی لائبریری کو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (Encyclopaedia Britannica) فراہم کر رہے ہیں؟" انہوں نے کیا "ضرور"! سخات کا ثبوت دیتے ہوئے اُنہوں نے دو ہزار روپے دیدئے جس سے ہم نے قابوس (Encyclopaedia) خریدا۔ سب سے اچھا کوئی کام اگر میرے ہاتھوں نے انجام دیا تو وہ کالج کی لائبریری کے لئے کتابیں چن چن کے جمع کرنا تھا۔ سردار گیان سنگھ کا "کشمیر بک شاپ" انگلستان یا امریکہ کے چھوٹے چھوٹے کتاب گھروں جیسا تھا۔ کشمیر بک شاپ نئی کتابوں کی تشہیر کرتا تھا۔ "ہند بک شاپ"

بھی ٹیچرس کالج کے نزدیک ہی تھا۔ لوگ جاتے تھے اور ہمارے لئے کتابیں خرید کر عطیہ دیتے تھے۔ ہند بک شاپ کب کا بند ہو چکا ہے مگر کشمیر بک شاپ میں جانا اب دل نہیں چاہتا۔ وہاں اب کچھ بھی نہیں۔ لوگ پڑھتے ہی نہیں۔ علم کے چراغ بجھ گئے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ سردار گیان سنگھ میری لائبریری کیلئے چن چن کر شاندار کتابیں لاتے تھے۔ اب گیان سنگھ کے بیٹے کے سر گباش ہونے کے بعد اُس کا دوسرا بیٹا اس کتاب گھر کو چلانے کی کوشش کرتا تھا۔ پچھلے دن معلوم ہوا کہ کسی کاغذ بیچنے والا مسلمان صاحب نے اسے اپنے ہاتھوں میں لے لیا ہے۔ سردار صاحب کے ساتھ اُس کی کتابوں کی چھٹی ہو گئی ہے۔

میں ٹیچرس کالج کا پرنسپل تھا۔ اے۔ اے۔ اے فیضی نے ایک کلب کھولا تھا جس کا نام اتھی نیم (Atheneum) رکھا گیا تھا۔ اس کے سولہ ممبر تھے جن میں ڈاکٹر کرن سنگھ بھی تھے۔ ایک کارڈ بنایا گیا تھا جس میں درج تھا: کون؟ کب؟ کہاں اور کیا؟ یعنی کون کس کتاب کا ریویو (Review) کریگا؟ ریویو کب پڑھا جائیگا؟ کس جگہ پڑھا جائیگا اور کس وقت؟ کتاب کیا ہوگی اور کس قسم کی ہوگی؟ ۱۹۵۸ء میں میرے کالج میں دعوت کا اہتمام تھا۔ اُن دنوں ایک کتاب ''ڈاکٹر جواگو'' نے میرے ذہن پر قبضہ جمایا تھا۔ میں نے اس کتاب کے قریباً پندرہ ریویو جمع کئے تھے۔ ایک ریویو ایڈمنڈ ولسن (Edmund Wilson) کا تھا جو بیس صفحوں پر مشتمل تھا۔ ولسن امریکہ کا سب سے بڑا نقاد تھا اور وہ اُس وقت زندہ تھا۔ جب میں نے ڈاکٹر جواگو کا ریویو کیا۔ پرنسپل محمودہ احمد علی وہاں ہی تھیں، ڈاکٹر کرن سنگھ اور دوسرے ممبر بھی پابندی سے موجود رہتے تھے۔ صادق صاحب ناراض ہو گئے کہ میں نے ڈاکٹر جواگو پر ریویو کیوں لکھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بخشی صاحب اور صادق صاحب الگ ہو گئے تھے اور صادق صاحب کی منسٹری بھی گئی تھی۔ صادق صاحب کے ساتھ میرے دوستانہ تعلقات تھے۔ اُن کے ہاتھ صاف تھے مگر ڈاکٹر جواگو سے اُن کی مہربانیاں کافور ہو گئیں۔ اُنہوں نے اپنی جگہ فیصلہ کیا کہ میں دائیں بازو کی طرف مُڑ گیا ہوں یا یوں کہئے کہ میں امریکہ کا

جاسوس بن گیا ہوں۔ یہ اندازہ ان کے لئے پکّا ہو گیا جب میں ۱۹۶۰ء میں فُل برائٹ پر امریکہ چلا گیا۔

میں ۱۹۶۴ء میں امریکہ سے واپس آ گیا۔ میری جیب میں ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری تھی۔ خواجہ غلام محمد صادق کا مراج پلان اور موئے مقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بازیابی کی پاداش میں ریاست کے پہلے چیف منسٹر ہو گئے تھے۔ امریکہ سے واپس آ کر میرے اور صادق صاحب کے درمیان نہ دوستی کی بنیاد باقی تھی اور نہ دوستی۔ ڈاکٹر جواگو کے ریویو نے قصّہ تمام کر دیا تھا۔ تاہم دکھائی دیتا ہے کہ صادق صاحب نے مسٹر علی محمد طارق کو ایک دن میرے پاس بھیج دیا۔ طارق صاحب صادق صاحب کی کابینہ میں تھے۔ ۱۹۳۰ء کے زمانے میں جب میں سکول میں پڑھتا تھا تو طارق ینگ عبداللہ کے نام سے جانے جاتے تھے۔ وہ جوشیلے تھے اور آتش بیاں اور شیخ صاحب کا پیغام لوگوں تک پہنچانے میں کافی مددگار ثابت ہوئے تھے۔ جب میں امریکہ سے واپس آیا اور گاندھی نگر جموں میں مقیم تھا تو علی محمد طارق صاحب میرے بڑے برادر آغا ناصر صاحب کے ساتھ میرے پاس آ گئے۔ اُسے صادق صاحب کے ساتھ میرے تعلقات کا علم تھا۔ اُس نے کہا کہ صادق صاحب چاہتے ہیں کہ میں ڈائریکٹر انفارمیشن بنوں۔ میں نے ہنسنا شروع کیا۔ میں نے کہا کہ میں نے زندگی کے پچیس سال صَرف کئے ہیں وہ بننے کیلئے جس کی مجھے چاہت ہے۔ میں جامعہ گیا، ذاکر صاحب کی صحبت میں بیٹھا، انگلستان گیا، امریکہ گیا۔ میں نے اپنا روپیہ پیسہ خرچ کیا، قرضہ کیا، امریکہ میں چار سال نہ جانے کیا کیا سختیاں جھیلیں۔ واپس اس لئے آیا کہ من پسند تعمیری اور تخلیقی رول ادا کروں۔ میں ڈائریکٹر انفارمیشن بن کے کروں گا کیا؟ ناصر صاحب نے طارق صاحب سے کہا ''میں نے آپ کو کہا نہیں کہ وہ آپ کی بات سنے گا نہیں؟'' پھر طارق صاحب نے ایسی بات کہی کہ صرف رسیدہ لوگ ہی کہہ سکتے ہیں۔ ''ہم آپ کو بچانا

چاہتے تھے مگر تمہاری تقدیر میں خواجہ نورالدّین کی غلامی لکھی ہے"۔ یقیناً یہ میری تقدیر تھی کہ صادق صاحب جیسے شریف النفس دانشور، شائستہ اور سب لیڈروں میں سب سے زیادہ متحمل مزاج شخص نے بھی غلام احمد مختار جیسے جوشیلے کارکن اور خواجہ نورالدین کو یونیورسٹی پر نازل کردیا۔ ذاکر حسین کالج کے پرنسپل محمود صاحب بیگ کو کشمیر کا ایجوکیشنل ایڈوائزر بنایا گیا۔ میں انسپکٹر رہ چکا تھا۔ ٹیچرس کالج کا پرنسپل رہ چکا تھا۔ انگلستان اور امریکہ کی تعلیمی فضاؤں میں سات سال اُڑتا چلا آیا تھا۔ کشمیری تھا مگر بیگ صاحب ایڈوائزر بنے کیونکہ مشفق دوست صادق صاحب نے ڈاکٹر جواگو کے الزام میں میرے دروازے بند کئے۔ پس جب جموں وکشمیر یونیورسٹی سرینگر میں ڈیپارٹمنٹ آف ایجوکیشن کھلنے کی بات چلی تو میں نے پروفیسر کی اسامی کیلئے درخواست بھیجدی۔ ڈاکٹر کرن سنگھ نے مجھے بتایا کہ آدھ گھنٹے تک بحث ہوتی رہی کہ آغا اشرف کو پروفیسر بنایا جائے کہ نہیں۔ اُس وقت کشمیر یونیورسٹی میں عبدالقادر سروری مرحوم (اُردو) کے سوا کوئی پروفیسر نہ تھا۔ پروفیسر جان محمد ریاضی میں، پروفیسر اپورب سومناتھ انگریزی میں، پروفیسر محمد سلطان وانٹ انگریزی میں، پروفیسر ستیہ بھوشن پولٹیکل سائنس میں اور پروفیسر منسارام پوری حساب میں ریڈر تھے۔ خواجہ غلام السیّدین کو ماہر کی حیثیت سے بُلایا گیا تھا۔ ڈاکٹر کرن سنگھ اور سیدین صاحب نے مجھے پروفیسر بنایا۔ میں نے ڈیپارٹمنٹ آف ایجوکیشن کھول دیا۔ سندھ کالج بمبئی کے ایڈوانی صاحب اُس وقت کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے اور مشہور ومعروف مورّخ کے ایم پانیکر کی جگہ لے گئے تھے۔ مختار صاحب نے میرے پروفیسر بننے سے پہلے ہی پچاس طلباء اور طالبات میرے شعبے میں داخل کئے تھے۔ سیدین صاحب نے انٹرویو میں جب مجھ سے پوچھا کہ میں کتنے اُمیدواروں کو داخلہ دوں گا تو میں نے کہا مختار صاحب نے پہلے ہی پچاس داخل کئے ہیں۔ وہ حیران ہوگئے۔ مجھے بھی معلوم نہیں تھا کہ پچاس طلباء اور

طالبات کے ساتھ کیا کام کیا جا سکے۔ پھر قدرت کا کرنا کہ مختار صاحب اپنی دوسری بیوی اور نوزائیدہ بیٹی ڈیزی کے ہمراہ ہوائی حادثے میں ہونی ہینگ پر وفات پا گئے۔ میں نے داخلہ منسوخ کیا اور صرف پندرہ اُمیدواروں کو لے لیا۔ اس طرح میری خودمختاری شعبہ تعلیم کو بنانے کیلئے شروع ہوئی۔ بعد ازاں لوگوں پر دباؤ پڑ گیا کہ وہ اور طلباء اور طالبات کو داخل کریں۔ داس صاحب میرے وقت میں سائنس کے پروفیسر تھے مگر اُس کے پاس بقول اُن کے خوردبین کم تھیں مگر دباؤ تھا کہ زیادہ لڑکوں کو داخل کریں۔ وہ شکایت کرتے کہ اُن کے پاس چالیس اُمیدوار ہیں۔ اس شکایت کے باوجود وہ بدستور زیادہ طلباء اور طالبات کو اپنے شعبے میں داخلہ دیتے۔ میں نے کبھی چودہ پندرہ اُمیدواروں سے زیادہ داخل کئے نہیں۔ میرے شعبے میں کم اُمیدوار تو ہوتے تھے مگر اُن کے ساتھ کام کرنا مسرت افزا بھی ہوتا تھا اور فائدہ مند بھی۔ میں جو کتابیں اور رسائل اُن کیلئے مہیا کرتا، وہ ان کے ذہنی دریچے کھول دیتے۔ تین سال کے اندر اندر شعبہ تعلیم کی لائبریری اچھی خاصی لائبریری بنی۔ مختار صاحب نے وفات سے پہلے مجھے دہلی جانے اور دس پندرہ ہزار روپے کی کتابیں خریدنے کیلئے کہا۔ میں سیدھے رام کرشنا والوں کی دکان میں گھس گیا، سیڑھیوں پر چڑھا اور گرد میں ڈٹی ہوئی کتابیں نکال نکال کر چالیس ہزار روپے کی کتابیں جمع کیں۔ اس میں میرا سفر خرچ شامل تھا۔ یونیورسٹی والوں نے بل ادا کیا۔ میری لائبریری کتابوں سے آراستہ ہوئی۔ پھر میں نے مغرب سے تقابلی تعلیم (comparative education) کے علاوہ تعلیم کے دوسرے شعبوں کیلئے جرائد منگائے اور انسٹنٹ آرٹ اینڈ سائنس پریس Instant Art and Science Press سے چین اور روس کے جرائد کا انگریزی ترجمہ منگایا۔ ان سب جرائد اور تدریسی مواد پر میں جلدیں چڑھاتا تھا اور اپنے شاگردوں کے لئے تعلیم سے متعلق تازہ ترین حقائق فراہم کرتا تھا۔ تقابلی تعلیم کے طلباء اور طالبات خاص کر اس سے بہت

فائدے اُٹھاتے تھے۔ جارج ایس کونٹس، برک مین، ایڈمنڈ جے کنگ، نکولاز ہانس جیسے ماہرین کی تحریروں سے ایم ایڈ کے طلباء اور طالبات کی آنکھیں کُھل گئی تھیں۔ وہ سیاست، سماجیات، اقتصادیات، تاریخ، نسل، قوم اور دیگر چیزوں کو تعلیم کے ساتھ مربوط پا کر ایک نہایت وسیع نقطۂ نظر سے دیکھنے کے عادی ہو گئے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میرے رفقاء اساتذہ کو بہت اچھی طرح لکھ پڑھ کر میرے شاگردوں کے ساتھ بحث و مباحثہ کرنے کیلئے اپنے آپ کو تیار کرنا پڑتا تھا۔ یہ بحثیں کبھی کبھی کلاس روم سے باہر بھی چائے نوشی کے دوران یا تفریحی دوروں کے درمیان ہوا کرتی تھیں۔ سب لوگ، اساتذہ اور شاگرد مضامین کے دائروں سے نکل کر ان میں حصہ لیتے تھے۔ ہمارے شعبے کا تعلیمی اور تحقیقی کام بلا شبہ ایک ایسا روپ اختیار کر گیا تھا کہ اس میں روایات بھی تھیں، تجربے بھی تھے اور مزید مزید چیزوں کو جاننے کا اشتیاق بھی۔ ذوق و شوق اور گرمئ تجسّس ہمارے کام کے ساتھ ہر گھڑی شامل رہتی تھی۔ گھر جا کر بھی ہم تدریسی عمل کی آواز بازگشت سنتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک دن ریاست کے گورنر بھگوان سہائے کی رہائش گاہ پر جب چند اساتذہ کی میٹنگ ہو رہی تھی تو گورنر صاحب نے کھلے الفاظ میں ہماری اچھی کارکردگی کی سراہنا کی تھی۔ اُنہوں نے کہا تھا کہ ہمارا شعبۂ تعلیم ہر دم ہمہ تن مصروف رہتا ہے اس لئے شیطان مصروف صفیں کاٹ نہیں سکتا اپنا کام چلانے کیلئے۔ اُنہوں نے کہا تھا کہ اس شعبے کی نفیس تعلیم و تربیت کا نتیجہ یہ ہے کہ وہاں نہ نقل ہے اور نہ کوئی اور بدنظمی۔ یہ سب اپنی جگہ پر ٹھیک مگر جب نورالدین صاحب داخل ہوئے تو پروفیسر جگرناتھ دراور پروفیسر تیرتھ رام کے ساتھ مل کر شعبہ تعلیم کو مولانا آزاد روڈ سرینگر کے کنارے کالج آف ایجوکیشن میں جلاوطن کر دیا۔ اُنہوں نے اُس وقت کے صاحبانِ اقتدار کو بتایا کہ میرا یونیورسٹی میں رہنا خطرے سے خالی نہیں۔ بھگوان سہائے سمجھ گئے کہ جس وقت میری ترقی کی بات چل رہی تھی، اُسی وقت میرا یونیورسٹی میں رہنا

خطرناک قرار دیا گیا۔ صاحبانِ اقتدار یہ بھی چاہتے تھے کہ اُس سال میرے شعبے میں کوئی ایڈمشن نہ ہو۔ مگر داخلہ لینے والوں میں سے دو تین اُمیدوار عدالت میں فریاد لیکے چلے اور عدالت نے داخلہ بند کرنے کی ممانعت کی۔

شعبہ تعلیم میں میں نے اپنا سٹاف خود ڈھونڈھنے کی کوشش کی۔ اس ضمن میں پروفیسر چونی لال وشن کی مثال دی جاسکتی ہے۔ وہ کہیں دلّی میں پڑھا رہے تھے۔ میں نے اُنہیں اپنے شعبے میں جگہ دی۔ پروفیسر وشن قابل، محنتی اور ہوشیار مغز ہیں۔ اُنہوں نے امریکہ کی ییل (Yale) یونیورسٹی میں پروگرام لرننگ (Programme Learning) اور سیبر نیٹکس (Cybernatics) میں مہارت حاصل کی تھی۔ میرے شعبے میں آکر ہی اُنہوں نے اچھا کام شروع کیا اور اچھے نتائج دکھائے۔ تعلیم میں نئے خیالات پر بحث کی اور کوشاں رہے کہ ان خیالات کو عملی روپ دیا جائے۔ اُن کے تحت دو مقالوں کے بارے میں پروفیسر منموہن ورما[1] نے بتایا کہ ان پر آسانی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری دی جاسکتی ہے۔ میں پروفیسر ویشن کے کام سے بہت خوش تھا اور اُن کے اپنے شعبے میں ہونے سے بھی۔ پروفیسر ویشن اب اچھا سکول چلا رہے ہیں اور نندریش کالج آف ایجوکیشن بھی۔ ان کے سکول اور کالج میں ۲۰۰۰ سے زیادہ طلباء اور طالبات تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اُن کے سکول دو دفعہ جلائے گئے مگر دو دفعہ اُنہوں نے اُن کی بہتر تعمیر کی۔ ویشن صاحب کے ہونہار لڑکے نے اپنی نوکری چھوڑ کر اچھا خاصا کمپیوٹر کالج Computer Lab بنایا ہے جسے وہ چلا رہے ہیں۔ عرفان کاٹھواری فانونڈیشن نے ویشن صاحب کو حال ہی میں پچاس ہزار روپے کا ایوارڈ دیا۔

یونیورسٹی کے ان ایام کی ایک جان سوز کہانی ہے طالب علموں میں بدنظمی اور نقل کی وبا

۱۔ ورما صاحب اڈنبرا سکاٹ لینڈ میں تربیت پا چکے ہیں۔ آر ایس ایس کے ساتھ منسلک رہے ہیں۔ مسلمان عورت سے شادی کی ہے۔ اُن کی تحریریں آرگنائزر (Organizor) میں چھپتی تھیں۔ وہ ہندی کی شاعرہ مایا دیوی کے برادر ہیں۔ مایا دیوی کو ہندی کیلئے ایوارڈ ملا ہے۔

کا پھیلاؤ۔ خواجہ نورالدین صاحب وائس چانسلر کی کرسی پر بیٹھ گئے تھے۔ دو پروفیسر صاحبان میرے پاس آئے اور کہا کہ نقل خطرناک صورت اختیار کر چکی ہے۔ ہمیں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنا نہیں چاہیے بلکہ کچھ مثبت قدم اُٹھانے چاہیں۔ مجھے کہا گیا کہ آنجہانی پروفیسر کاچرو (کمسٹری) کو کسی نقل کرنے والے نے تھپڑ بھی مارا ہے۔ ہم نے محاذ کھڑا کیا اور نقل کے خلاف تحریک شروع کی۔ میرا اپنا بیٹا اس کا شکار تو ہوا مگر میں نے پروانہ کی۔ یونیورسٹی میں سٹرائیک شروع ہوئی۔ بھگوان سہائے صاحب نے میٹنگ میں کہا کہ یہ سٹرائیک کا معاملہ کیا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ جناب سٹرائیک تو اس بات پر ہے کہ بارہ اُمیدواروں میں سے فزیکس میں ایک اُمیدوار سکنڈ ڈویژن میں پاس ہوا ہے۔ اسی بات پر سٹرائیک کی گئی ہے۔[1] میں نے اپنے شعبے میں کبھی نقل ہونے نہ دی تھی اس لئے مجھ پر عتاب نازل ہوا تھا۔ میرے ایک دوست تھے، دُھلے منجھے، دانشور کشمیر، ڈی این کول صاحب۔ کشمیر پولیس کے سربراہ تھے۔ اُن کی گھر والی ایک دو دفعہ ایم ایڈ کے امتحان میں گر گئی تھی۔ پھر اُسے امتحان میں اور شامل ہونا پڑا۔ مجھے کہا گیا کہ زالوجی کا ایک پروفیسر اس امتحان کا اعلیٰ نگراں ہوگا۔ میں نے صاف انکار کیا۔ کول صاحب کی گھر والی بدقسمتی سے پھر گر گئی۔[2]

۱۔ فزیکس ڈیپارٹمنٹ میں ۲۰ اُمیدوار امتحان میں شامل ہوئے تھے۔ جونہی امتحان شروع ہوا تھا، اُمیدواروں نے بنچ بجانے شروع کئے تھے اور ''آوٹ آف کورس، آوٹ آف کورس'' کا شور بپا کیا تھا۔ پھر پرچہ بدلایا گیا تھا۔ نئے سوالات سب اُمیدواروں کی جیب میں منصوبے کے عین مطابق تھے۔ نتیجہ یہ کہ وہ اُمیدوار فسٹ ڈویژن میں اور ایک سیدھا سادھا سکنڈ ڈویژن میں پاس ہوا تھا۔

۲۔ یونیورسٹی میں نقل کی وبا منصوبہ بند طریقے پر چل رہی تھی تو میں ایک دن جونہی اس کے خلاف لڑنے یونیورسٹی پہنچا، مجھ پر طلبا نے حملہ کیا۔ میرے خلاف مظاہرے ہوئے کہ مجھے یونیورسٹی کے معاملات میں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔ مطلب یہ کہ میں نقل کرنے کے راستے میں حائل کیوں ہو رہا ہوں۔ عبدالعزیز صاحب بھدرواہی بلوائیوں کو سمجھاتے رہے کہ وہ بدتمیزی سے باز آئیں اور بلوانہ کریں۔ پروفیسر این این رینہ، جن کا بائیں بازو کی طرف جھکاؤ تھا، مجھے سمجھاتے رہے کہ مجھے ناموافق حالات کے ساتھ لڑنے سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا۔ اس طرح میرے دوستوں نے مجھے سمجھایا کہ یہ سب باتیں مجھے مشتعل بنانے کیلئے کی جارہی ہیں تاکہ منصوبہ بند طریقے سے میری ترقی کے راستے بند کئے جائیں۔ ہوا بھی ایسا ہی۔

پانچ چھ سال کشمیر یونیورسٹی کا کوئی کنووکیشن (Convocation) ہوا ہی نہیں۔ ۱۹۷۲ء میں پروفیسر محمد مجیب میری بیٹی کی شادی پر تشریف لائے۔ میں نے اس موقعے کو غنیمت سمجھا اور اپنے ایم ایڈ شاگردوں کا خود ہی اپنے شعبے میں کنووکیشن جیسا اجلاس بلایا۔ اس اجلاس میں ایم ایڈ کے پرانے نئے سب طلباء اور طالبات شامل ہوئے۔ سپریم کورٹ کے جسٹس غلام محمد، اُن کی گھر والی اور بیٹی، بی امان اور نشاط رحمٰن بھی شریک ہوئے۔ مجیب صاحب نے میری گزارش پر خطاب کرنے کی آمادگی ظاہر کی۔ ''تعلیم ایک مورّخ کے زاویہ نگاہ سے'' (A Historians Approach to Education) موضوع منتخب ہوا۔ خطیب بھی شاندار اور خطاب بھی! مجیب صاحب نے تین اہم چیزوں کا اپنی تقریر میں ذکر کیا۔ ایک یہ کہ مسلمان کی تعریف اپنے خطاب میں وضع کی۔ فرمایا۔ ''مسلمان کریم النفس ہے جس طرح دریا، فیّاض ہے جس طرح سورج اور مہمان نواز ہے جس طرح زمین''۔ دوسری یہ کہ ''امام غزالی نے کہا ہے کہ عشق کرنا ہو تو خدا کیلئے کرو اور اگر نفرت ضروری ہو تو وہ بھی خدا کے لئے کرو۔ ہم کیسے دیانت داری کا ساتھ دیں گے اگر بددیانتی کی مذمّت نہ کریں''۔ تیسری بات یہ ہے کہ انسان مذہب کے بارے میں وسیع القلبی (Broadmindness) نہیں دکھا سکتا اگر وہ خود اُس کا حامی نہ ہو اور وہ بھی عملی طور پر۔ یہ اجلاس میرے شعبے کی تاریخ میں لکھنے کے لائق ہے۔ کیونکہ ایک طرف یونیورسٹی تاریکیوں میں گری ہوئی تھی تو دوسری طرف میرے اپنے دن مخالفتوں اور سازشوں میں اس طرح گرے ہوئے تھے کہ کوئی ایسا کام ممکن نہ تھا۔ پھر بھی ہم نے اپنی طرف سے تقسیم اسناد کا اجلاس نہ سہی ایک شاندار اجتماع ضرور کیا۔ جس میں نامور مورّخ پروفیسر مجیب عاشقانِ علم و دانش سے مخاطب ہوئے۔ اس کی صدارت گورنر بھگوان سہائے نے کی۔

گورنر بھگوان سہائے بڑے کارآزمودہ منتظم تھے۔ اُنہوں نے کشمیر میں بڑے بڑے لوگوں کے درمیان رقابت دیکھی۔ نیز تعلیم کیلئے بھی کچھ کرنا ضروری سمجھا۔ اس لئے انہوں

نے مسٹر جے پی نائیک کو لایا اور بھگواں سہائے کمیٹی تشکیل دیکر نائیک صاحب کو اس کا چیرمین بنایا۔ ایک زمانے میں گاندھی جی نے بقول خواجہ محمد عباس اپنے ''ضمیر کے محافظ'' ڈاکٹر ذاکر حسین کو اسی طرح ری آرگنائزیشن کمیٹی کا چیرمین بنوایا تھا۔ تیس سال کے بعد بھگواں سہائے نے جے پی نائیک کو چُن لیا اپنی کمیٹی کا چیرمین بننے کیلئے۔ نائیک صاحب کے ساتھ کام کرنا غیر معمولی تھا اور میرے لئے سعادت کا باعث۔ اُنہوں نے کوٹھاری کمیشن میں مسٹر پارتھا سارتھی کے دوش بدوش گرانقدر کام انجام دیا تھا۔ پس میں نے ۱۹۷۲،۷۱ء کا بیشتر وقت بھگواں سہائے کمیٹی کے ساتھ گذارا۔

اسی دوران صادق صاحب نے ڈاکٹر جواگو کہانی پھر تازہ کی۔ وہ اس داستان کو بھولنے والے صاحب نہیں تھے۔ جب کبھی اُنہوں نے بھگواں سہائے کے ساتھ بات کی تو جواگو کہانی دہرائی۔ بھگواں سہائے ہمارے گورنر تھے مگر ذاکر صاحب اور جامعہ کی وجہ سے مجھ میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ مگر اُنہیں کشمیر کے سیاسی دائروں کے متعلق تھوڑا بہت علم حاصل ہوا تھا۔ اُنہوں نے مجھ سے کہا کہ میرے بارے میں اُنہوں نے صادق صاحب کے ساتھ تذکرہ چھیڑا تھا۔ گورنر صاحب نے پوچھا کہ ڈاکٹر جواگو والا معاملہ کیا ہے؟ میں نے کہا کہ معاملہ معمولی ہے مگر مضحکہ خیز۔ اُس نے میری بات سن کر قہقہہ مارا۔ اس کے اور میرے رشتے ۱۹۷۵ء تک بدستور قائم رہے اور اچھی طرح۔ وہ میرے اچھے دوست تھے جو بیتے دِنوں کی کہانیاں کہتے تھے۔ وہ مجھے کھانے پر بلاتے خاص کر ٹراوٹ مچھلی کھِلانے کیلئے اور ہم خوب باتیں کرتے۔

اب ہم ۱۹۷۱ء کی سٹوری پر پہنچ جائیں گے۔ بنگلہ دیش کا طوفان آیا تھا۔ صادق صاحب علیل تھے۔ سید میر قاسم قائم مقام وزیر اعلیٰ تھے۔ کالج آف ایجوکیشن سرینگر میں بنگلہ دیش پر میٹنگ بلائی گئی۔ میر قاسم نے مجھے بولنے کیلئے کہا۔ میں نے جذباتی انداز میں بنگلہ دیش پر رائے دی۔ میری تقریر دوبار نشر ہوئی۔ ایک بار ریڈیو کشمیر سرینگر پر اور دوسری بار

آل انڈیا ریڈیو دلّی پر۔ اس کے بعد ایک دن جب میں بھگواں سہائے کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا تو انٹلی جنس بیورو کے ایک افسر مہتا سنگھ صاحب نمودار ہوئے۔ وہ لیکچر کے بعد کالج آف ایجوکیشن آئے تھے اور مجھ سے ملے تھے۔ اُن دنوں میرا دفتر کالج آف ایجوکیشن میں ہی ہوا کرتا تھا۔ اُن کے ہاتھ میں ایک بریف کیس تھا۔ اُس میں سے اُنہوں نے نوٹوں کے بنڈل نکال دئے اور کہا کہ وہ میرا لیکچر دو تین زبانوں میں لاکھوں کی تعداد میں چھاپنا چاہتے ہیں۔ اس لئے وہ بنڈل مجھے دینا چاہتے تھے۔ میں نے کہا "معاف کیجئے بنگلہ دیش میں انسانیت کا خون بہہ رہا ہے اور میں اُس خون کے عوض پیسہ لے لوں۔ آپ میرا لیکچر چھپوانا چاہتے ہیں تو ریڈیو کے ڈائریکٹر مسٹر مانی سے اس کی کاپی لیجئے۔ میرا حق تصنیف آپ کی جیب میں ہے۔ میں نے اس قسم کا پیسہ زندگی بھر کبھی چھوا تک نہیں۔" جب میں نے مہتا سنگھ کے سامنے بھگواں سہائے کو اپنے لیکچر کے انجام کی کہانی سنائی تو وہ اُس پر برس پڑے اتنا کہ مہتا سنگھ صاحب کا وہاں سے نکلنا دشوار ہو گیا!

یہ دور میرے لئے عبوری دور تھا۔ یہاں کشمیر میں ایک شنگلو صاحب رہتے تھے۔ اُن کا بڑا بھائی دلّی میں مقیم تھا۔ میں بھی دلّی میں تھا۔ بڑے شنگلو صاحب نے فون کیا کہ میں ریڈیائی تقاریر کا سلسلہ دلّی سے شروع کروں تو The Quest for National Identity نوازش ہوگی۔ میں نے معذرت ظاہر کی کیونکہ میں اُسی دن جموں اور سرینگر کے لئے روانہ ہو رہا تھا۔ میں نے کہا اگر مناسب ہو تو میں جموں سٹیشن میں اپنی تقریر ریکارڈ کرا سکتا ہوں صبح سات بجے جب میں سرینگر کیلئے روانہ ہو جاؤں گا۔ مگر شنگلو صاحب کو جموں سٹیشن سات بجے صبح کھلوانے کا انتظام کرنا ہوگا۔ اور صدا بند کاپی جموں سے دلّی منگانی ہوگی۔ وہ راضی ہو گئے۔ میں شام کے وقت جموں پہنچ گیا۔ میں کیلاش ناتھ کول صاحب کے پاس رات بھر ٹھہرا۔ دیر گئے میں نے تقریر لکھی اور صبح سات بجے ریکارڈ کروائی۔ اُسی دن جب میں سرینگر پہنچا تو رات کے ساڑھے نو بجے آل انڈیا ریڈیو سے یہی تقریر نشر ہو گئی۔

اس کے بعد جب میں دلّی گیا تو پی، این در صاحب نے کہا کہ میری تقریر کے دلّی میں خوب چرچے ہو رہے ہیں۔ چنانچہ وزیر اعظم ہندوستان مسز اندرا گاندھی کے دفتر نے کشمیر یونیورسٹی کو لکھا کہ وہ آغا اشرف علی کو نہرو میموریل میوزیم اینڈ لائبریری کا ممبر بنانا چاہتے ہیں۔ کشمیر یونیورسٹی سمجھتی تھی کہ اُنہوں نے مجھے یونیورسٹی سے باہر مولانا آزاد روڈ پر پھینک دیا ہے پھر اچانک The Quest for National Identity کا دلّی سے نشر ہونا اور پرائم منسٹر کے دفتر سے خط آنا یونیورسٹی کیلئے زلزلہ ثابت ہوا۔ کشمیر یونیورسٹی کے رجسٹرار صاحب نے مجھے بتایا کہ خواجہ نورالدین وائس چانسلر نے اُسے کہا کہ وہ آغا اشرف کو ممبر بننے جانے کیوں دیں گے۔ رجسٹرار نے کہا وزیر اعظم کا خط اور ہمارا انکار، یہ تو یونیورسٹی کی جبروت کی تاریخ میں نیا باب ہوگا۔ وی سی صاحب نے ''اچھا جانے دیجئے اُسے، اُسے جانے دیجئے'' کہہ کر اپنی تشویش کم کردی۔ دوسرے دن اُنہوں نے مجھے اپنے دفتر بلایا، دو سال سے رُکا ہوا میرا کار ایڈوانس سولہ ہزار روپے چیک کی صورت میں میرے ہاتھ میں رکھ دیا۔ صادق صاحب کا ڈاکٹر جواگو والا معاملہ دفن ہوگیا مگر میرے ساتھ ناروا برتاؤ کشمیر ایڈمنسٹریشن کی تاریخ میں رقم ہوگیا۔ کتنے ہی سیاہ ایام میری اور میرے گھر والوں کی زندگی مشکل بناتے رہے۔ ۱۶۰۰۰ ہزار کا چیک ملا اور اسی کے ساتھ میری اکثر ماڈل فیٹ (FIAT) گاڑی سڑک پر چلنے لگی۔ نہرو میموریل میوزیم اینڈ لائبریری کی دو میٹنگوں میں میں نے دلّی میں شرکت کی۔ وہاں بڑے بڑے لوگ تھے۔ وجے لکھشمی پنڈت، رامیش تھاپر، ڈاکٹر کرن سنگھ، جواہر لال یونیورسٹی کے ایک پروفیسر جو سیاسیات کے ماہر تھے اور حیدر آباد کے رہنے والے تھے۔ کُل دس بارہ شخصیات حصہ لے رہی تھیں۔ رامیش تھاپر اُن دنوں Mainstream کا ایڈیٹر تھا۔ حیدر آباد کے پروفیسر بعد میں جامعہ کے پرو وائس چانسلر بن گئے۔

بنگلہ دیش کا طوفان ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ ٹیگور ہال سرینگر میں جلسہ بلایا گیا تھا۔ ارجُن اروڑا مرکزی کابینہ سے آگئے تھے۔ ڈی، پی، در نے اُنہی دنوں انڈو سوویت معاہدہ

کروایا تھا۔ یہ جلسہ اسی معاہدے کے زیر اثر ہو رہا تھا۔ بھگوان سہائے اور سید میر قاسم بھی موجود تھے۔ قاسم صاحب نے ہال میں مجھے دیکھا، اپنے پاس انگلی کے اشارے سے بلایا اور تقریر کرنے کو کہا۔ اور بھی مقرّر تھے۔ میں نے تقریر کی۔ جب میں سٹیج سے نیچے اُترا بھگواں سہائے نے مجھے گلے لگایا۔ قاسم صاحب نے اپنی تقریر میں بار بار میری تقریر کے حوالے دئے۔ جب میں تقریر کر رہا تھا، کشمیر کے دو ماہرینِ تعلیم ہال سے باہر چلے گئے۔ میں اُن کا نام لینا نہیں چاہتا۔ اس پر میرے مرحوم فرزند آغا شاہد علی نے امریکہ سے خط بھیجا جس میں بیگم اختر کا گایا ہوا یہ شعر لکھا ہوا تھا

ہم کو مٹا سکے یہ زمانے میں دم نہیں

اس طرح میں بُرے ایام کے نرغے سے باہر نکل آیا تھا۔ انہی دنوں خواجہ غلام محمد صادق کا انتقال ہوا۔ میں اُن دنوں چندی گڑھ میں یونیورسٹی امتحان لے رہا تھا۔ بنگلہ دیش کی لڑائی کی وجہ سے میں سرینگر نہ آسکا تھا۔ میں جب واپس آیا تو کالج آف ایجوکیشن میں اپنے شاگردوں کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا۔ ''بنگلہ دیش کے لوگوں پر کیا کیا گذری تھی، مگر دس دن میں سارا معاملہ طے ہوگیا۔ ہمارے اوپر تین دباؤ تھے وہ سب ختم ہوگئے۔ ایک پاکستان کا دباؤ تھا۔ ہمیں کہا جا رہا تھا کہ ہم پاکستانی ہیں مگر اب کشمیریوں کو پاکستان کی تسلّی ہوگئی۔ میرے خادم نے گھر پر مجھ سے کہا کہ جو پاکستان مشرقی پاکستان کو اپنے ساتھ رکھ نہ سکا وہ ہم کشمیریوں کو اپنے ساتھ کیسے رکھ سکتا ہے۔ دوسرا دباؤ تھا بنگلہ دیش کے ریفوجیوں کا۔ اُن کی تعداد قریباً ایک ڈیڑھ کروڑ تھی۔ وہ ہمارے ملک کے مسلمانوں کیلئے کافی بوجھ تھا۔ وہ اپنے گھروں کو واپس چلے گئے اور اُن کا واپس جانا بجائے خود ایک معجزہ تھا۔ تیسرا دباؤ وہاں[1] وومنز کالج کے اندر تھا۔ وہ بھی ختم ہوگیا''۔ یقیناً یہ ذاتی احساس تھا مگر تھا صحیح اور صورت حال

۱۔ میرا ڈیپارٹمنٹ کالج آف ایجوکیشن میں محبوس تھا۔ اس کالج اور وومنز کالج کے بیچ میں صرف ایک گلی ہے۔ جب میں نے ''وہاں وومنز کالج'' کہا میرا ہاتھ اُس کالج کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

کے عین مطابق!

ڈیپارٹمنٹ آف ایجوکیشن یونیورسٹی کا خاصا اچھا شعبہ بن گیا تھا۔ میں نے اپنی ساری صلاحیتیں اس کے نذر کردی تھیں۔ میں کتابیں لالا کے پڑھواتا تھا، تحقیق کا خاصا کام کرواتا تھا، بحثیں کراتا تھا، مشکل سوالات کے جواب تلاش کراتا تھا، اپنے شاگردوں کے اندر برادری، حمیت اور انسانی ہمدردی کے جذبات اُبھارتا تھا، دیانت داری سے کام کرنے کی مشقیں کراتا تھا، سماجی حالات کے آئینے میں تعلیمی مسائل کے حل تلاش کراتا تھا۔ میرے شاگرد دیر دیر تک لائبریری میں کام کرتے تھے۔ لائبریری کم سے کم چھ بجے تک کھلی رہتی تھی۔ پرانے شاگرد بھی نئے شاگردوں کے ساتھ یونیورسٹی کے اندر اور باہر ملتے تھے اور تعلیم، دانش اور زندگی کو اجتماعی ذہن سے سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ ایک برادری بن گئی تھی اور میرا شعبہ اُن سب اداروں کے ساتھ جڑ گیا تھا جن اداروں میں یہ سب لوگ اور ان کے رفیق، ان کے دوست کام کرتے تھے۔ کسی کسی وقت میرے اور میرے شاگردوں کے درمیان ایسی بحثیں چھڑتی تھیں، جن کا حل ڈھونڈھنے کیلئے سخت محنت سے کام کرنا پڑتا تھا۔ کسی وقت دیہات اور دیہاتی زندگی کے ایسے مسائل تعلیم کے ساتھ جُڑ جاتے تھے کہ ہمارا اپنا ذہن بھی نئی نئی جہتوں کی طرف مبذول ہوتا تھا۔ پھر نئی سوچ اور نئے وتیرے سامنے آتے تھے اور زندگی کی حرکی سرشت اور بھی نشوونما پانے لگتی تھی۔ اس طرح تعلیم ڈگری حاصل کرنے اور امتیازات کا افتخار حاصل کرنے کے علاوہ ایک حیات ساز عمل بن گئی تھی۔ شعر وادب اور فلسفیانہ گفت وشنید آگ پر پٹرول چھڑکنے کا کام کرتے تھے۔ ہم سب اکٹھے سیکھنے سکھانے کے عمل سے زندگی کے مزے بھی لیتے تھے۔ نہ میرا نہ میرے شاگردوں کا جی کرتا تھا کہ کوئی اور دوسرا کام کریں۔ تعلیم عبادت بن گئی تھی! اسی دوران جب میرا کام عروج پر تھا، کالج آف ایجوکیشن میں، جہاں میرا شعبہ محبوس تھا، کھچڑی پک گئی۔ ان دنوں شملہ اگریمنٹ ہوا تھا اور سہائے کمیٹی کا کام ہو رہا تھا۔ کھچڑی پکانے والے یہ لوگ میرے

ہاتھوں سے پلے ہوئے میرے ساتھی تھے۔ اُنہوں نے سوچا کہ آغا اشرف یہ کھچڑی اُس وقت کھائیں گے جب اس کے شاگردوں کے راستے میں رُکاوٹیں ڈال دی جائیں گی اور اُنہیں محنت سے کام کرنے نہ دیا جائیگا۔ کھچڑی کھا کر آغا جذباتی ہو جائیگا۔ وہ مسئلے کو آگے لے جائیں گے اور آغا کی ساری پونجی لٹ جائیگی۔ واقعہ یہ تھا کہ کالج کا لائبریری چلانے والا (جو دن کا خاصا بڑا حصہ سرینگر کافی ہاؤس میں گذارتا تھا اور اُس شور وغل میں پلتا تھا جسے کافی ہاؤس جانے والے دانشوری کہتے تھے) چار بجے کے بعد کالج سے غائب ہو گیا۔ میں جذباتی ہو گیا اور اُس کے پرنسپل کے ساتھ اونچے لہجے میں بات کی۔ دوسرے دن کالج کا ایک پروفیسر (جو چلتے چلتے، اُٹھتے بیٹھتے گردن ہلا ہلا کے دائیں بائیں دیکھتا تھا) بھگوان سہائے کے پاس فریاد لیکے چلا گیا۔ اُس نے گورنر صاحب سے کہا کہ میں نے پرنسپل صاحب کے ساتھ ناروا سلوک کیا ہے اور یہ کہ صادق صاحب مجھ سے پہلے ہی ناراض ہیں۔ میں جب کالج پہنچا تو یہ لوگ کالج میں فتنہ کرنے کیلئے کمر کسے ہوئے تھے۔ میں نے قاسم صاحب کو روئیداد سنائی۔ اُنہوں نے معاملے کی اصلیت سمجھ لی اور پروفیسر جے این در کو ہدایت دی کہ پرنسپل صاحب کو کالج آف ایجوکیشن سے تبدیل کیا جائے۔ در صاحب میرے پاس آئے۔ میں نے اُنہیں مشورہ دیا کہ پرنسپل صاحب کو تبدیل نہ کیا جائے کیونکہ ایسا کرنا ذاتی عناد سمجھا جائیگا۔ میرے لئے صرف اتنا کافی ہے کہ میرے شاگردوں کو لائبریری سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی اجازت دی جائے اور دیر دیر تک کام کرنے کی۔ اس طرح پرنسپل کا تبادلہ رُک گیا! اس زمانے میں میرے راستے میں اور مشکلیں پیدا ہو گئیں۔ کشمیر کے مسلمان سماجی اجتماعوں اور دعوتوں پر مجھے جملے کسنے لگے۔ ''بنگلہ دیش کی طبیعت کیسی ہے؟، بنگلہ دیش کا اب کیا حال ہے؟'' ''جیسور کبھی نہیں گرے گا'' وغیرہ! سماجی مجلسوں اور شادیوں پر سیاست پکانا کتنی عجیب بات ہے مگر دراصل یہ ناکہ بندی کے طریقے تھے جو مسلمانانِ کشمیر نے میرے لئے اُن دنوں وضع کئے تھے!

ٹیچرس کالج سرینگر میں پرنسپل کی حیثیت سے اور پوسٹ گریجویٹ ڈیپارٹمنٹ آف ایجوکیشن میں پروفیسر کی حیثیت سے شاید ہی کوئی دن ایسا گزرا ہو جب میں نے دس بجے کلاس میں پڑھانا شروع نہ کیا ہو۔ فلسفہ تعلیم ہو یا تعلیمی عمرانیات، تقابلی تعلیم ہو یا کوئی اور مضمون یا موضوع، میں پڑھاتا رہا اور پڑھاتا رہا۔ میں اسی سے اپنے ذہن کو زندہ رکھ سکا۔ اسے نے مجھے کشمیر اور کشمیر سے باہر کی زندگی کے ساتھ جوڑ کے رکھا۔ اسی نے مجھے اپنے شاگردوں کے قریب لایا۔ وہ میرے دل میں اُترتے گئے اور میں اُن کے دلوں میں۔ اس وقت بھی لمحہ بہ لمحہ میرے شاگرد گویا یہیں کہیں میرے آس پاس ہوتے ہیں اور میرے ساتھ علمی، سماجی، سیاسی، اقتصادی، تمدنی اور روحانی معاملات پر گفتگو کرتے ہیں۔ تعلیم ایک نہایت ہی عمدہ ذریعہ ہے دل جیتنے کا اور دلوں میں گھر کرنے کا۔ میں نے یہ حقیقت ڈاکٹر ذاکر حسین سے ملتے ہی محسوس کی تھی۔ یہ احساس روز بروز گہرا ہوتا جا رہا ہے اس وقت بھی جبکہ میں اپنے احباب اور اپنے شاگردوں سے بڑھاپے کے ایام میں ملتا رہتا ہوں یا تنہائیوں میں اپنے من کی دُنیا میں ڈوبا رہتا ہوں۔ سرکاری عہدوں پر فائز میں نے شاگردوں کے دل و دماغ سے جو رابطہ رکھا، وہ میری زندگی کی انمول کمائی ہے۔ اگر میں اپنا احتساب کروں کہ میں نے زندگی میں کون سا بہترین کام کیا ہے تو وہ یہی جواں دِل اور جواں دماغ شاگردوں کے ساتھ سمبندھ ہوگا۔

بھگوان سہائے کمیٹی کے رپورٹ کے شائع ہونے کے ساتھ ہی وزیر اعلیٰ سید میر قاسم اور بھگوان سہائے نے فیصلہ کیا کہ میرا ایجوکیشن کمشنر بننا حکومت کے کردار اور مفاد کے مدنظر مناسب نہ ہوگا۔[1] اس لئے مجھے ڈائریکٹر ٹریننگز اینڈ کریکولا بنایا گیا۔ اس کے ساتھ ہی بورڈ آف سکول ایجوکیشن کے کام چلاؤ چیرمین کے فرائض بھی مجھے سونپ دئے گئے۔ اُس وقت

۱۔ میرا گماں ہے کہ وہ اس لئے مجھے کمشنر نہ بنا سکے کیونکہ ٹریننگ کالج میں میرے خلاف بلوا ہوا تھا جس کا ذکر پہلے ہی آچکا ہے۔

عبدالغنی لون صاحب مرحوم سٹیٹ منسٹر آف ایجوکیشن تھے۔ اُنہوں نے کہا کہ وہ وفاداری سے میرے کام کو چلنے دیں گے اور آزادی کے ساتھ۔ لگتا ہے کہ قاسم صاحب نے اُن سے اس سلسلے میں ملاقات کی تھی۔ چیرمین بورڈ کا کام مجھ سے پہلے منسٹر خود ہی کرتے تھے مگر اب معاملہ میرے ہاتھ میں آ گیا۔ میں نے دیکھا کہ بورڈ کا ٹیکسٹ بک والا کام آسان نہیں تھا۔ پروفیسر ستیہ بھوشن، جو پولیٹیکل سائنس کے پروفیسر رہ چکے تھے، مجھ سے ملے اور کہا کہ میں درسی کتابوں کے سلسلے میں کیا کر سکوں گا۔ کیا کتابیں اچھی طرح سے وقت پر تیار ہونگی؟ کتابیں چھپوانے کا کام رشوت ستانی کی زد میں آ گیا تھا۔ یہ سونے کی کان تھی جس پر سبوں کی نظریں لگی ہوئی تھیں۔ جب میں نے بورڈ ہاتھ میں لے لیا تو صرف پانچ لاکھ سمیت کتابوں کا چارج سنبھالا۔ بورڈ کی بلڈنگ پُر اسرار وجوہات کی بناء پر جلائی گئی تھی۔ اس لئے میرے لئے مشکلات کچھ کم نہ تھے۔ جلدی ہی معاملہ اتنا بہتر ہوا کہ شیخ صاحب بہت خوش ہوئے۔ اس کا تذکرہ بعد میں فی الحال یہ کہ تعلیم کا وہ مزاج بدل چکا تھا جو میں نے انسپکٹری کے دوران سکولوں میں دیکھا تھا۔ وہ سکت، وہ ضبط بھی نہ رہا تھا جو جاگیردارانہ نظام کے ایام میں تعلیم میں دیکھا جا سکتا تھا۔ مدرسوں کی تعداد بڑھ گئی تھی اور اُستادوں کی تقرریاں بھی ہوئی تھیں۔ خاص کر سیاسی بنیادوں پر اور رشوت کے دروازوں سے، مگر ان میں خاکبازی کا سبق پڑھایا جا رہا تھا۔ میرا کام یہ نہیں تھا کہ ان سکولوں کی حالت خاص کر تعلیمی اعتبار سے سدھاروں۔ اس کیلئے علیٰحدہ ڈائریکٹر تھا۔ میں تو ٹریننگز کا ڈائریکٹر تھا اور بورڈ کا کام چلاؤ چیرمین۔ میں زیادہ سے زیادہ اُستاد کی تربیت سے اور درسی کتابوں کے ذریعے حالات کا سدھار تلاش کر سکتا تھا۔ اور یہ کام میں نے کیا۔ تفصیل ذرا آگے۔ پہلے کچھ اہم واقعات۔

میں نے جب ڈائریکٹریٹ میں کرسی سنبھالی تو ریاسی کا ایک شخص میرے پاس یہ روئیداد لے کے آیا کہ اس کے مکان کا کرایہ سالہا سال سے بند رکھا گیا ہے۔ اُس کا مکان ریاسی کے ٹریننگ سکول کا ہوسٹل تھا۔ بیگم معراج قریشی ڈپٹی ڈائریکٹر ایجوکیشن تھی۔ اُس

نے اس ہوسٹل کا معائنہ کیا تھا۔ اُسے دریافت ہوا تھا کہ مکان خستہ حال ہے اس لئے اُس نے اس کا کرایہ بند رکھا تھا۔ ریاسی کا یہ مالک مکان وہی شخص تھا جس کے ۴۴ افراد خانہ ۱۹۴۷ء میں جموں کے ہندوؤں نے تہہ تیغ کئے تھے۔ بہرحال کسی سکیم کے تحت ڈائریکٹر ٹریننگز کو ولز (Wills) جیپ ملی تھی۔ یہ بائیں طرف چلائی جاتی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں خود ریاسی جاؤں گا اور مکان اور ہوسٹل کا معائنہ بھی کروں گا اور اصلی حالات بھی دریافت کروں گا۔ اُن دنوں مشہور و معروف افسر این کے مکارجی جموں و کشمیر ریاست کے چیف سیکریٹری تھے اور جے پی نائیک صاحب نے بھگوان سہائے کمیٹی رپورٹ میں اہم رول ادا کیا تھا۔ جب میں جیپ میں جا رہا تھا تو کٹڑہ میں اس کی بریک فیل ہوگئی۔ میرے ساتھ جموں کے دو افسر آئی ڈی سونی اور شرما صاحب تھے۔ اُنہوں نے کہا کہ واپس جائیں۔ میں نے مانا نہیں۔ اُن دنوں سڑک پرانی گلمرگ روڈ کی طرح خراب اور پہاڑی تھی۔ میں نے زندگی پر کھیلتے ہوئے ہاتھ کی بریک استعمال کی۔ جب ہم ریاسی پہنچے تو شرما اور سونی صاحب فوراً مندر چلے گئے تاکہ پوجا کریں کہ صحت و سلامت ریاسی پہنچ گئے۔ میں مکان اور ہوسٹل دیکھنے گیا جو ابھی نہ گرا تھا اور نہ حد سے زیادہ خستہ حال تھا۔ مالک مکان اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کی دیکھ بال کر رہا تھا مگر مشکل زندگی گزار رہا تھا۔ میں واپس آیا اور قطعی فیصلہ کیا کہ اس غریب کی مدد کروں گا۔ رشوت کا معاملہ اتنا سنگین ہوگیا تھا کہ ایجوکیشن سیکریٹری[1] نے مجھے بتایا کہ کرایہ کیس کی فائیل کھوگئی ہے۔ یہ شاید اس لئے کہ اُس

۱۔ یہ افسر لوگ بھی کون سا دل و دماغ لیکے اس دنیا میں آتے ہیں۔ کشمیر انتظامیہ کے ایک جانے پہچانے بڑے افسر میرے پاس آئے اور دوسرے اپنے سے بڑے افسر کے لئے سفارش کی کہ اس کی بیٹی کو بی، اے کے کسی مضمون میں Reappear آیا ہے، اُسے بی، ایڈ میں داخلہ دیا جائے۔ میں نے کہا بخشی صاحب کے زمانے میں بہت سے ناموزون اور نامناسب کام کئے گئے ہیں مگر بی، اے کے بغیر بی، ایڈ میں کسی کو داخلہ نہیں دیا گیا۔ میں ایسا گھٹیا کام کسی بھی صورت میں نہیں کرسکتا۔ دکھانا یہ ہے کہ رشوت ستانی اور کنبہ پروری نے لوگوں کو اندھا بنایا تھا اور ان کی دیانت چھین لی تھی۔ جب یہ بڑے افسر ایسی مذموم سفارش لیکر میرے پاس آئے تھے، میں نے شرم کے مارے اپنا سر جھکا کے رکھا تھا جب وہ میرے ساتھ بات کر رہے تھے۔ میں اُن دنوں ڈائریکٹر ٹریننگ و اینڈ کریکولا تھا۔

وقت تک اٹھتالیس ہزار روپے (48,000) کرایہ جمع ہوگیا تھا۔ مجھے سیکریٹری صاحب کے رویّے سے ایسا نفسیاتی صدمہ پہنچا کہ میں سوچنے لگا کہ میں نے یونیورسٹی کا شعبہ تعلیم چھوڑا ہی کیوں۔ اب کیا کیا جاسکتا تھا اس کے بغیر کہ فکر کو دھوئیں میں اُڑانا شروع کریں۔ میں نے پچاس سال کی عمر میں پہلی دفعہ سگریٹ کا بڑا ڈبہ منگوایا اور دھواں پھونکنے لگا۔ اسی دوران ایجوکیشن ایڈمنسٹریشن میں ایک مثبت تبدیلی آئی۔ آر سی رینہ صاحب ریذیڈنٹ کمشنر دہلی واپس آگئے اور تعلیم کے کمشنر بن گئے۔ میں نے کرایہ کا معاملہ اُن کے ساتھ اُٹھایا اس کے باوجود کہ یہاں کا سنڈیکیٹ[1] رینہ صاحب کو چاہتا نہیں تھا۔ میں نے کرایہ کا معاملہ طے کرایا۔ میں نے رینہ صاحب کو کہا کہ اگر مکان بوسیدہ تھا تو کرایہ بند کرنے سے پہلے حکومت کو مکان خالی کرانا چاہیے تھا۔ مگر ہوا یہ کہ ہوسٹل میں اساتذہ بدستور رہتے آئے مگر کرایہ بند رہا۔ رینہ صاحب نے فیصلہ کیا کہ کرایے کا پیسہ نکال دیا جائے۔ ڈائریکٹر ٹریننگز اور مالک مکان کے نام پر بنک میں رکھا جائے۔ جونہی مالکِ مکان مکان کی مرمت کریگا، پیسہ واگذار کیا جائے گا۔ اس طرح سے کرایے کا مسئلہ حل ہوگیا مگر میرے سگریٹ چالو رہے۔

ڈائریکٹر تو میں بن گیا تھا مگر جموں میں مجھے ٹھہرنے کی جگہ ملی نہ تھی۔ میں جموں میں پنڈت کیلاش ناتھ کول کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ پی، ڈبلیو، ڈی کے ایک مکان میں ٹھہرتے تھے۔ اُنہوں نے میری مشکل محسوس کرتے ہوئے پیشکش کی کہ میں اُن کے پاس ٹھہروں۔ میں بے گھر تھا، اس لئے اُنہوں نے کہا اور میں نے ڈیرہ لگایا۔ وہ نیچے رہنے لگے اور میں اُوپر۔ ہر روز جب ہم دفتر سے واپس آتے تو دیکھتے کہ بجلی ہی نہیں۔ کول صاحب کی عادتیں بڑی دلچسپ تھیں، کھانے کی بھی۔ میں نے اُن کی صحبت میں بہت کچھ سیکھا۔ بجلی نہ ہوتی تو وہ مجھے سورن تھیٹر لے جاتے اور ہم روز ''بوبی'' فلم دیکھتے۔ وہ اس فلم کے متوالے ہوگئے

۱۔ سنڈیکیٹ ساری افسر شاہی پر چھایا ہوا تھا۔ صادق صاحب مرحوم کو اس نے بند کر کے رکھا تھا۔ اس میں فائنانس سیکریٹری، پلاننگ سیکریٹری اور جنرل سیکریٹری شامل تھے۔

تھے۔ایک دن میں جا نہ سکا۔اُدھر دفتر میں میں نے دھیرے دھیرے اپنا طریقہ وضع کرنا شروع کیا۔میں نے ضابطوں (Rules) کو ایک طرف چھوڑنا شروع کیا اور یہ افسر شاہی تمدن کے خلاف تھا اور ناقابل قبول۔میں فائیل پر لکھتا تھا کہ میں ضابطوں سے ہٹ کر کسی مسئلے کو کسی طرح حل کرتا ہوں یا کسی کام کے راستے میں حائل رکاوٹ کو کیسے دور کرتا ہوں۔ اس لئے ضابطوں سے ہٹنا ذاتی مفاد نہیں ہوتا تھا۔سید میر قاسم چیف منسٹر تھے۔اُن کے ساتھ میرے اچھے تعلقات تھے۔اُن دنوں سے ہی جب ہم ایس پی کالج میں پڑھتے تھے۔ میں اُن کے شانے پر ہاتھ رکھ کر افسر شاہی کے بنائے ہوئے ضابطوں کو بالائے طاق رکھتا تھا مگر کام کرتا تھا عوامی بہبود کا۔کبھی کبھی میں محسوس کرتا ہوں کہ میری روش انتظامیہ کے مزاج کے ساتھ اور اس کے اصولوں کے ساتھ میل نہیں کھاتی تھی۔یہ ۱۹۷۳ء کا زمانہ تھا۔

میرا پی اے (پرسنل اسسٹنٹ) میرے دفتر میں گاہے گاہے مجھے مشورہ دیتا تھا کہ مجھے کبھی کبھی منسٹر صاحب کے گھر جانا چاہیے۔میں جواب دیتا تھا کہ جس دن اُنہیں میری ضرورت ہوگی تو مجھے بلائیں گے۔[1] اُن دنوں مفتی محمد سعید ایجوکیشن منسٹر تھے۔ایک دن اُنہوں نے مجھے بلا ہی لیا اور میں چلا گیا۔وہ جموں میں چیف منسٹر کے مکان کے ساتھ ہی ایک چھوٹے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔کشمیری پنڈتوں جیسا مارپیچ سامنے رکھا ہوا تھا اور تمباکو پی رہے تھے۔حقے کے اوپر گول گول چلم میں کوئلہ سلگ رہا تھا۔مفتی صاحب تمباکو نوشی میں سرمست۔کہنے لگے ''شیخ صاحب کے ساتھ آپ کے تعلقات کیسے ہیں؟'' میں نے کہا۔''جیسے آپ کے ساتھ''۔اُنہوں نے اپنا کلام جاری رکھا۔''میر قاسم نے مجھے کہا ہے کہ میں یہ بات آپ تک پہنچاؤں کہ آپ یونیورسٹی واپس چلے جائیں۔مگر فی الحال نہیں۔شیخ صاحب کو آنے دیجئے وہی اب آپ کا فیصلہ کریں گے۔'' میں نے کہا ''ٹھیک

۱۔ یہ نہیں کہ میں مغرور تھا اور اس لئے نہیں جاتا تھا۔مجھے غرور ناپسند ہے۔مگر میں چاپلوسی کو بھی ناپسند کرتا ہوں۔جامعہ کے دنوں میں بھی مجھے چاپلوسی ناپسند تھی۔حالانکہ ذاکر صاحب قد آور، خوددار اور باضمیر شخصیت تھے جن کی طرف دیکھتے ہی ادب اور احترام کا خیال رکھنا پڑتا تھا۔

ہے"۔ وہ پھر کہنے لگے۔ "آپ مجھے جانتے نہیں؟" میں نے کہا جناب مجھے تو موقع ہی نہ ملا۔ اُس نے کہا "آپ کو یاد نہیں۔ ۱۹۵۲ء میں جب آپ انسپکٹر سکولز تھے، ہم آپ کے پاس خزاں کے موسم میں آئے۔ ہم آپ سے آپ کے دفتر میں ملے اور کہا۔ ہم غریب لڑکے ہیں۔ سرمائی چھٹیوں میں میٹرک پاس کرنے کیلئے پرائیویٹ ٹیوٹر کے پاس پڑھ نہیں سکتے۔ سرمائی چھٹیوں میں انگریزی اور حساب پڑھانے والے اُستادوں کو ڈیوٹی پر لگا دیجئے تا کہ ہم پڑھ سکیں۔ آپ دوسرے دن علی الصباح دس بجے ہمارے سکول میں داخل ہوئے۔ آپ نے ہیڈ ماسٹر گنگا درر ینہ کو اور ریاضی اور انگریزی پڑھانے والے اُستادوں کو بلایا اور اُنہیں ہدایت دی کہ وہ ساری سرمائی چھٹیوں میں باضابطہ طور پر پڑھاتے رہیں۔ اُن کو ایک مہینے کی رعایتی رخصت دی جائیگی۔ اُس سال بجبہاڑہ سکول کے گیارہ لڑکے میٹرک میں شامل ہوئے۔ صرف دو پاس ہوئے۔ ایک میں، دوسرا کوئی اور۔" مفتی صاحب یہ کہہ رہے تھے اور میں تیس سال کے بعد بھی اپنے کام سے لطف اُٹھا رہا تھا۔ یہ سب اپنی جگہ پر صحیح مگر مفتی صاحب مجھے پسند نہیں کر رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ میں یونیورسٹی واپس چلا جاؤں۔

اور پھر شیخ صاحب آئے دھاڑتے ہوئے "حرام خورو تمہارا یوم الحساب آ گیا۔" شیر کی یہ دھاڑ جموں سیکریٹریٹ کے سامنے سُنائی دی اس بازگشت کے ساتھ کہ ۱۹۵۳ء میں شیخوں مارا گیا جس کا نہ کوئی جواز تھا اور نہ کوئی پاکیزہ روایت۔ اُسی دن شام کو میں قریب سے حالات کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ میں گیسٹ ہاؤس میں گیا جہاں مرزا محمد افضل بیگ مرحوم ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں نے اُن سے کہا کہ ۱۹۵۳ء سے میں نے دیکھا ہے کہ ہر ایک انسان ہر دوسرے انسان کو گرانا چاہتا ہے اور گرا کر اُس کے کارنامے منہدم کرنا چاہتا ہے۔ یہ سلسلہ وار ہوتا چلا آیا ہے۔ دوستی کا سوال پیدا نہیں ہوتا اور نہ ہمدم یا ساتھی کا۔ مگر شیخ صاحب کے ساتھ آپ کی دوستی قائم رہی ہے۔ بیگ صاحب نے جواب دیا۔ "آغا صاحب چند روز پہلے انڈونیشیا کے سفیر ایک جگہ ہمارے ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔ اُنہوں

نے کہا کہ ہماری دوستی اُن کے اخلاقی بقا کی قوت ہے"۔ پہلے ہی دن شیخ عبداللہ نے مغرور اعلیٰ افسروں کو نکال باہر کر دیا۔ جے این درڈائریکٹر سپورٹس تھا۔ اُس نے مجھے کہا کہ شیخ صاحب کاغذی شیر دکھائی دیتے ہیں۔ مگر حقیقت حال نے کچھ اور ثابت کر دیا۔ شیخ صاحب نے بارہ اعلیٰ افسروں کو ریاست سے باہر تبدیل کر دیا۔

ابھی شیخ صاحب سے پھر سے حکومت سنبھالنے کے سلسلے میں پارتھا سرتھی بیگ مذاکرات ہو ہی رہے تھے کہ ایل، کے جہانے شاید شیخ صاحب کے کہنے پر ایک مجلس ٹورسٹ سنٹر سرینگر میں بُلائی۔ اس میں چوراسی لوگوں نے مقالوں پر مقالے پڑھے اور بحثیں کیں کہ نقل کی وبا کو کیسے روک دیا جائے۔[1] بنرجی اُس وقت چیف سیکریٹری تھے۔ جونہی شیخ عبداللہ نے دوبارہ عنانِ حکومت ہاتھ میں لی اُنہوں نے اعلان کیا کہ آج سے نقل نہ ہوگی۔ وہ رنبیر سنگھ ہائی اسکول جموں کے بہت بڑے ہال میں اچانک آ گئے۔ میں اتفاق سے وہاں پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ میں زور زور سے چلّا رہا تھا کہ اُمیدوار اپنے موزون سے نقل کا مواد نکال باہر کریں۔ اُمیدوار سپرویژن (Supervision) کا مذاق اُڑاتے ہوئے، ہُو ہُو کی آوازیں نکال رہے تھے۔ سامنے ایک بڑی میز تھی جس پر نقل کے مواد کا ایک بڑا سا ڈھیر بن گیا تھا جو شیخ صاحب نے دیکھا۔ اُنہوں نے میری چیخیں بھی سُنی ہوں گی۔ تیسرے دن اُنہوں نے مجھے جموں و کشمیر سٹیٹ بورڈ آف اسکول ایجوکیشن کا ہمہ وقت چیرمین مقرر کر دیا۔ پروفیسر ستیہ بھوشن کو کمشنر ایجوکیشن بنا دیا گیا۔ اس طرح میرا ۱۹۷۵۔۱۹۸۰ کا تخلیقی کام شروع ہوا۔ ۱۹۵۲ء میں ہی میں وہ کام کرنا چاہتا تھا مگر وقت کی تلوار کی کاٹ کے سامنے کچھ نہ چلی۔

سکنڈری سطح پر انگریزی اور ریاضی لازمی مضمون ٹھہرائے گئے تھے۔ لندن یونیورسٹی کے پروفیسر لاریس سے میں نے گزارش کی تھی کہ وہ اس بات پر اپنی رائے دیں کہ کیا دو

۱۔ جس طرح رشوت سماجی زندگی اور ثقافت کیلئے زہر ہے اُسی طرح نقل تعلیم و تربیت، کردار سازی، شخصیت کی تعمیر اور اخلاقیات کیلئے زہر ہے۔ یہ انسانی زندگی میں اسی طرح زہر بھر دیتی ہے جس طرح کسی ندی میں چھپا ہوا سانپ تیراک کی نس نس میں اپنی کاٹ سے زہر بھر دیتا ہے۔

مضامین لازمی قرار دینا کسی قوم کے تعلیمی نظام کے لئے مناسب ہے۔ لارلیس کی جب چٹھی آئی تو میں نے جموں وکشمیر یونیورسٹی کے رجسٹرار خواجہ غلام احمد عشائی مرحوم کو دکھائی۔ عشائی صاحب کو خط پڑھ کر صدمہ ہوا جب اُنہوں نے لارلیس کا جواب پڑھا۔ اُنہوں نے لکھا تھا کہ دسویں جماعت میں اگر کوئی طالب علم ریاضی میں فیل ہوجائے تو باقی تین مضامین میں اُسے آگے بڑھنے دیا جائے۔ صرف ایک مضمون کیلئے اُسے روک کے رکھنا کتنا بے معنی اور لاحاصل ہے۔ اس طرح بیس سال کام کرتے کرتے مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ تعلیم میں کون سی چیزیں فوری توجہ کی مستحق ہیں۔ چیرمین بن کے مجھے موقع ملا کہ کچھ کام کروں۔

ہم نے میٹرک کا نتیجہ نکالا۔ صرف آٹھ فیصد طلبا اور طالبات پاس ہوگئے۔ گورنر صاحب رنجیدہ ہوگئے۔ میں شیخ صاحب کے پاس گیا۔ اُنہوں نے کہا کہ کوئی رعایت دی نہ جائے اور نہ کوئی سمجھوتہ بازی کی جائے۔ وہ اُس وقت ایک لمبے ڈائنگ ٹیبل کے پاس انگور کھا رہے تھے۔ نہ مجھے انگور دئے اور نہ کسی اور کو۔ میں نے ایک ہفتے سے انگور نہیں دیکھے تھے۔ شیخ صاحب کو جوش دلانے کیلئے میں نے کہا۔ ''جب میں نے یونیورسٹی چھوڑ دی اور ڈائریکٹر ٹریننگ کری کیولا کی کرسی سنبھالی، میں نے قاسم صاحب سے کہا کہ ہمیں تعلیم میں یہ کام کرنے چاہیں۔ میں نے کن کن اُن اقدامات کے نام لئے جو ترجیحی طور پر کئے جانے لازمی تھے۔ قاسم صاحب میرے اچھے دوست تھے۔ اُنہوں نے لافانی کشمیری زبان میں یہ کہتے ہوئے 'اب آپ کو یہ سب کچھ میرے ہی وقت میں کرنا ہے' ہتھیار چھوڑ دئے۔ میں نے سمجھ لیا کہ وہ میرے مجوزہ اقدامات کو عملی جامہ پہنانا نہیں چاہتے۔ شیخ صاحب سُن رہے تھے۔ اُنہیں میری باتیں پسند آئیں۔ میں اُن کا پسندیدہ کامریڈ تھا۔ اُنہوں نے ۱۹۵۰ء میں مجھے انگلستان بھیجا تھا۔ فوراً بول اُٹھے۔ ''اب آگے بڑھو''۔ میں نے کہا میں کوئی تبدیلی نہیں لاؤنگا جب تک آپ کل آٹھ بجے آل انڈیا ریڈیو کشمیر پر بچوں سے خطاب نہ کریں گے۔ اُنہوں نے بتایا کہ میں اُنہیں سمجھاؤں کہ اُنہیں کیا کرنا ہے۔ میں

نے کہا اگر آپ چاہتے ہیں تو پہلے میں گورنر سے ملوں گا۔ اُنہوں نے اجازت دی۔ پھر میں نے شیخ صاحب سے کہا کہ اگر کوئی اُمیدوار میٹرک میں انگریزی یا ریاضی میں فیل ہو جائیگا، اُسے فیل قرار نہیں دیا جائیگا۔ کوئی اُمیدوار چار مضمونوں میں پاس ہو جاتا ہے تو اُسے پاس قرار دیا جائیگا۔ اگر وہ انگریزی میں فیل ہو جائے تو وہ تب تک گیارہویں جماعت میں داخلہ نہیں لیگا جب تک انگریزی پاس نہیں کریگا۔ اسی طرح اگر کوئی ریاضی میں فیل ہو جاتا ہے مگر باقی چار مضامین میں پاس ہوتا ہے تو اُس کو بھی پاس قرار دیا جائیگا مگر وہ گیارہویں جماعت میں ریاضی نہیں پڑیگا۔ باقی چار مضامین میں وہ اپنی تعلیم جاری رکھ سکے گا۔ پہلے تو یہ تھا کہ انگریزی یا ریاضی میں فیل ہوا تو بس فیل قرار دیا گیا اور دوسرے سال نئے سرے سے پانچوں مضامین میں امتحان میں شامل ہونا ضروری۔ اس نئے امتحانی ڈھانچے سے جو لوگ انگریزی میں پاس نہیں ہوتے وہ پھر بھی میٹرک پاس کہلاتے۔ وہ پولیس والے، پٹواری، منشی یا اور بیسوں کام کر سکتے۔ دوسرے دن شیخ صاحب نے روز ویلٹ (Roosevelt) انداز سے بچوں سے خطاب کیا کہ ہماری امتحانی حکمت عملی بدل گئی اور اب بچوں کے مشکلات بہت حد تک حل ہو گئے۔ اب اُن کو پھر سے اُن مضامین میں شامل نہیں ہونا پڑیگا جن میں وہ پاس ہوئے ہوں۔ شیخ صاحب کی تقریر کی صدائے بازگشت میں مشہور و معروف تعلیمی ماہر چے پی نائیک نے بھی حصہ لیا۔ اُنہوں نے "شیخ صاحب ہم آپ کو سلام کہتے ہیں" تار میں لکھ بھیجا۔ اُنہوں نے کہا کہ وہ بھی ایسی ہی امتحانی پالیسی ہندوستان بھر میں رائج کرنا چاہتا تھا اور مدت سے۔ یہاں کچھ لوگ کچھ وقت کے بعد شیر کشمیر کے پاس گئے اور اُنہیں کہا کہ میں اُن کو غلط راستے پر ڈال رہا ہوں۔ میں نے پہلا کیل اُن کے سر میں ٹھونک دیا تھا۔ وہ پبلک کے مفاد کا ہر کوئی کام غلط قرار دیتے تھے۔ شیر کشمیر بدستور مجھ پر بھروسہ کرتے رہے، اس کے بعد بھی!

ہماری توجہ اس کے بعد پرائمری ایجوکیشن کے پہلے دو تین سالوں کی طرف مبذول ہوئی۔ بچے اس دوران قریباً کچھ نہیں سیکھتے تھے اس لئے کہ ایک تو کتابیں درسیات کے

جدید طریقوں پر لکھی نہ گئی تھیں، دوسرے پڑھانے کے طریقے دقیانوسی تھے۔ میں آکسفورڈ پریس والوں سے ملا اور اُن سے کہا کہ ڈیوڈ ہارس برا کی کتابوں کے طرز پر جموں و کشمیر ریاست کے لئے کتابیں تیار کرائی جائیں تو نوازش ہوگی۔ اُنہوں نے مثبت جواب دیا۔ مگر مجھے ایسا لگا کہ اُن کی تیار کردہ کتابیں ہمارے لئے کافی مہنگی ثابت ہوجاتیں۔ میں نے ہارس برا سے براہِ راست تعلق پیدا کیا اور اُن سے کہا کہ وہ کتابوں کی تیاری میں ہماری دستگیری کریں۔ میں نے اُنہیں پرائمری ایجوکیشن پر اپنا مشیر قائم کیا۔ ہم نے بہت پیسے خرچ کر کے کتابیں بنوائیں۔ کالج آف ایجوکیشن سے کچھ ٹرینڈ گریجویٹ اُستاد بنگلور بھیج دئے گئے جہاں کہیں آس پاس درج فہرس ذاتوں کے لئے ڈیوڈ نے سکول کھولا تھا۔ اس سکول میں اُنہوں نے تربیت پائی۔ اُنہوں نے موقعے پر وہاں تجربہ بھی حاصل کیا کیونکہ وہ ڈیوڈ کی کارکردگی اور اس کے سکول کی تعمیری و تخلیقی پوزیشن سے واقف ہوئے۔ یہ اُستاد ہمارے پرائمری سکولوں میں پڑھانے والے اُستادوں اور استانیوں کی تربیت کے وسیلے بن گئے۔ طریقہ یہ رہا کہ پہلے بنیادی تربیت کاروں (key persons) کو تربیت دی جائے۔ پھر اُن کے ذریعے نزدیک و دور پرائمری سکولوں میں کام کرنے والے استادوں اور استانیوں کو تربیت دی جائے۔ اس طرح ہارس برا کا پروگرام مسلسل دو سال تک تحریک کی طرح چلتا رہا۔ ڈیوڈ نے کہا کہ اس پروگرام کو صرف ایسے اُستاد چلا سکتے ہیں اور کامیاب بنا سکتے ہیں جنہیں ایثار ہو اور خدمت کا جذبہ اور یہ دونوں چیزیں اس کی رائے میں ہندوستان میں ناپید ہیں۔ شیخ صاحب کو کہا گیا کہ میں بورڈ کا پیسہ برباد کر رہا ہوں۔ اُنہوں نے ڈاکٹر رئیس احمد وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی، پروفیسر ستیہ بھوشن کمشنر ایجوکیشن اور مسٹر اینڈ مسز ہارس برا کو کھانے پر بلایا۔ باتوں باتوں میں ڈیوڈ میر تقی میر کے شعر سناتا رہا۔ اچانک بجلی بند ہوگئی اور اس کے ساتھ ہی گفتگو کا دھارا بدلا۔ مسز ڈورین ہارس برا نے کہا کہ ''ہم نے پچیس سال درج فہرس ذاتوں کے ساتھ بغیر بجلی اور پانی کے اُس گاؤں میں کام کیا

جوسرحد پر کرناٹک اور کولر ڈسٹرکٹ کے بیچ میں واقع ہے۔ ڈیوڈ ہارس برا کو بتایا گیا کہ اس جگہ کام کرنا مشکل ہے کیونکہ وہاں کے حالات اچھے نہیں۔ اُسے مشورہ دیا گیا کہ یہ کام دہلی میں ہونا چاہیے جہاں اچھے حالات ہیں اور جہاں وہ اچھی کارکردگی دکھا سکتے ہیں۔ ڈیوڈ نے مانا نہیں۔ اُس نے برٹش کونسل سے استعفیٰ دیدیا جہاں اُن کی تنخواہ خاصی اچھی تھی۔ اُس نے مشکل علاقے میں تھوڑی سی زمین لی اور سکول کھولا۔ اُس نے وہاں کے لوگوں کو اپنایا اور اُن کے رنگ میں اپنے آپ کو رنگ لیا۔ میرا خیال ہے ڈیوڈ نے اس کام سے ہندوستان میں سلطنتِ برطانیہ کے سب گناہوں کا بوجھ اُتار دیا۔ اس بوجھ میں لارڈ کلائیو کے اعمالِ بد بھی شامل ہیں۔

ایک دفعہ علی گڈھ میں بحث میں حصہ لیتے ہوئے تقریر بازی کے کرتب دکھاتے ہوئے میں نے کارل مارکس کا حوالہ دیا تھا مگر کلائیو کا نام بھی اس میں آیا تھا۔ کارل مارکس کے یہ بول میں نے دہرائے تھے۔ ''بورژوا تہذیب کے فسق کی انتہاء اور اس کی وحشیانہ خصلت ہماری آنکھوں کے سامنے ننگی ہوگئی ہے۔ گھر میں تو یہ قابلِ احترام خوش آئندہ سرسبز خول میں نمودار ہوتو جاتی ہے مگر نوآبادیات میں اس کا ننگا پن ظاہر ہوجاتا ہے۔ اگر ہم خود اُس بڑے ڈاکو کے بیان سے فائدہ اٹھائیں جس کا نام لارڈ کلائیو تھا، کیا بورژوا تہذیب نے وہاں ہندوستان میں کھلے ظالمانہ استحصال سے کام نہیں لیا جہاں محض رشوت ستانی اُس کی حرص کے لئے ناکافی ثابت ہوئی؟'' ذاکر صاحب نے ۱۹۴۱ء میں ڈاکٹر راجندر پرشاد کو ایک میٹنگ میں کہا تھا۔ ''ہم کب تک اس سیاسی ریگستان میں ہل چلائیں''؟ مگر میں نے بورڈ آف سکول ایجوکیشن میں ایمرجنسی اختیارات سے کام لیکر سیاسی بنجروں میں ہل چلا دیا۔ ایک وقت میرے بھائی ناصر صاحب نے بتایا کہ اگر میں دلّی میں ہوتا تو میری بوٹیاں بنائی جاتیں۔ مجھے محسوس ہونا چاہیے کہ چیف سیکریٹری گورنمنٹ کا وقار ہوتا ہے۔ میں نے پوری کابینہ کے سامنے جرأت کے ساتھ بات کی تھی۔ یہ کلام ناصر صاحب کی زبان سے نہ نکلا تھا بلکہ افسر شاہی کی علیل تہذیب کی وضاحت کیلئے دفعتاً ظاہر ہوا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ شیخ

صاحب نے کابینہ کی میٹنگ بلائی تھی جس میں مرزا محمد افضل بیگ، ڈی ڈی ٹھاکور، پلاننگ کمشنر نور محمد صاحب، فائنانس سیکریٹری علی محمد لنکر صاحب، ہمارے ڈائریکٹر صاحبان بھی شامل تھے۔ گو کہ یہ بڑی اہم میٹنگ تھی مگر تھی یک رُخی۔ شری پوشکر ناتھ صاحب چیف سیکریٹری بھی موجود تھے۔ ٹھاکور صاحب تعلیم کا قلمدان سنبھالے ہوئے تھے۔ ناتھ صاحب نے فرمایا "میری تجویز ہے کہ ہمیں پنجاب یونیورسٹی کے ۱۹۴۷ء کے پہلے کے مثالی ایام کی طرف واپس جانا چاہیے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جاڑے میں طویل مدت کی چھٹیاں ہوتی تھیں۔ اس دوران طلباء اور طالبات کو خوب لکھنے پڑھنے کا موقع ملتا تھا۔ پھر وہ امتحانات میں شامل ہوتے تھے۔ شیخ صاحب نے بات سُنی اور میری طرف مخاطب ہوکر بولے۔ "آپ کا کیا خیال ہے اس بارے میں"۔ میں نے کہا جناب آپ کے چیف سیکریٹری شاید یہ محسوس نہیں کرتے کہ وہ اقلیتوں کی طرفداری کر رہے ہیں۔ پہلی اقلیت طالب علموں کا وہ جتھہ ہے جو دربار مُو کے عفریت کے ساتھ بے گھر ہو جاتا ہے۔ بہت آسان ہے اگر طلباء کے اس دوسو سے پانچ سو جتھے کیلئے ایک چلتا پھرتا ہائی سکول کھولا جائے مگر بہت مشکل ہے اگر پانچ لاکھ بچوں کو اُن کی خاطر ناحق سزا دی جائے۔ میرے لئے یہ تجویز ناقابل قبول ہے۔ دوسری اقلیت اُن اُستادوں کا جتھہ ہے جو طلباء اور طالبات کو امتحان کے لئے تیار کرنے میں لگ جاتا ہے اور اس طرح خوب پیسہ کماتا ہے۔ مارچ میں امتحانات کے بعد طلباء اور طالبات دو چار مہینے تک بے کار رہ جاتے ہیں اور نتائج کا انتظار کرتے کرتے اُن کے ذہن نہ جانے کیا کیا سوچتے رہتے ہیں۔ پھر دو چار مہینے تک پڑھائی کا کام سکولوں میں شروع ہو جاتا ہے اور موسمی حالات دھیرے دھیرے مخل ہو جاتے ہیں اور سردیوں کی وجہ سے کام کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ سکولوں میں گرمیوں کا انتظام نہیں، بہت سے سکول کھڑکیوں کے شیشوں سے بھی محروم ہیں۔ کچھ وقت گرمائی یا فصلی تعطیلات میں بھی ضائع ہو جاتا ہے۔ صادق صاحب کے وقت میں گنگولی کمیشن نے سالہا سال اس میں لگادئے

کہ دُنیا میں معقول ٹائم فریم کیا ہوتا ہے سکولوں کے کام کرنے کا۔ تمام تعلیمی نظام اس طرح کام کرتے ہیں کہ آٹھ نو مہینے کیلئے پڑھائی لکھائی کا کام ہوا ہو۔ پھر امتحانات، پھر تعطیلات جن میں طالب علم آزادی کی سانس لیتے ہیں اور اپنا اپنا بچا ہوا وقت مشاغل میں گذارتے ہیں۔ تعطیلات کے دوران امتحانات لینے والی ایجنسی اُستادوں کو کام پر لگاتی ہے۔ پھر دو ڈھائی مہینوں کے اندر اندر نتائج نکلتے ہیں اور شیڈول کے مطابق پھر کام شروع ہو جاتا ہے۔ میں نے کہا کشمیر پنجاب یونیورسٹی کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔ ٹائم فریم پنجاب کے طلباء اور طالبات کیلئے بنایا جاتا تھا نہ کہ سردیوں سے ٹھٹھرنے والے طلباء اور طالبات کیلئے۔ پنجاب یونیورسٹی کی مثالیت نے کشمیری طالب علموں کے لئے الگ امتحان تک کا بھی انتظام کبھی نہیں کیا تھا۔ وہاں بچے جولائی سے اپریل تک اچھی طرح پڑھائی کرتے تھے۔ مارچ اپریل میں امتحانات لئے جاتے تھے۔ اپریل سے جولائی تک سکول بند رہتے تھے۔ ان ہی گرمائی تعطیلات میں نتائج نکلتے تھے اور جولائی سے پھر کام شروع ہو جاتا تھا۔ یہ ٹائم فریم پنجاب کیلئے مناسب تھا۔ ہمارے لئے نہیں! جس وقت میں بول رہا تھا شیخ صاحب کسی بھی صورت میں میری طرف نہیں دیکھتے تھے۔ وہ تو یا دائیں دیکھتے تھے یا بائیں۔ وہ میرے اندرون اور میری نیت سے خوب واقف تھے۔ وہاں سردار رنکیل سنگھ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ کافی سینئر آدمی تھے اور سٹیٹ منسٹر فار ایجوکیشن۔ اُنہوں نے درسی کتابوں کا معاملہ کھڑا کیا۔ میں نے کہا جب جے پی نائیک اور کچھ دوسرے حاکموں نے جموں میں درسی کتابوں سے متعلق فیصلہ لے لیا تو رنکیل سنگھ صاحب گیسٹ ہاؤس جموں میں موجود ہی تھے نہیں۔ مگر میں اُنہیں بتانا چاہوں گا کہ درسی کتابیں اُس وقت مہیا کی جاتی ہیں جب نیا تعلیمی سال شروع ہوتا ہے۔ چھٹیوں میں طلباء اور طالبات غیر درسی کتابیں پڑھتے ہیں۔ وہ زندگی میں اپنے معیار کے مطابق حصہ لیتے ہیں اور مشاغل سے دل بہلائی کرتے ہیں۔ اُنہیں امتحان کے خوف میں مبتلا کرنا انصاف نہیں بلکہ جرم ہے۔ ویسے امریکہ اور دیگر ترقی یافتہ ممالک میں درسی کتابیں

گھر لے جانے کی اجازت ہی نہیں دی جاتی۔ آخر سکول کس واسطے؟ اگر سکول میں سیکھنے سکھانے کا کام نہیں ہوسکتا، گھروں پر کیسے ہوسکتا ہے۔ خاص کر اُن گھروں پر جہاں نہ لوگ پڑھے لکھے ہیں اور نہ کوئی ایسا انتظام ہے جو پڑھنے لکھنے کے کام میں مدد دے سکے!

شیخ محمد عبداللہ کو میرے بورڈ آفس لال منڈی آنا تھا۔ میں نے بورڈ کے سیکریٹری اور جوائنٹ سیکریٹری کو ہدایات دی تھیں کہ سارا کام اچھی طرح سے کیا جائے۔ سب کچھ کیا گیا مگر سٹیج ابھی کھڑا نہیں کیا گیا تھا۔ میں نے اپنی نگرانی میں فی الفور سٹیج کے بغیر ہی کرسیاں لگوادیں۔ میں نہ سیکریٹری صاحب کا نام لوں گا اور نہ جائنٹ سیکریٹری کا مگر دونوں اندر ہی اندر سے میرے ساتھ تعاون نہیں کر رہے تھے۔ (وہ افسر شاہی کا تجربہ حاصل کر چکے تھے اور اس رنگ میں خوب رنگ گئے تھے)۔ درسی کتابوں کو نئے رنگ میں چھپوایا جارہا تھا اور بورڈ کی حالت بدل چکی تھی۔ شیخ صاحب تشریف فرما ہوئے اور کرسی پر بیٹھ گئے۔ سب لوگ اُنہیں اچھی طرح دیکھ سکتے تھے کیونکہ اُنکی مثالی قد درازی کشمیر کو تحفہ میں ملی تھی۔ میں نے اُنہیں بتایا کہ بورڈ کی مالی حالت چار لاکھ سے ستتھر لاکھ ہوگئی ہے پھر میں نے کہا کہ ہمارے سیکریٹری صاحب سولہ دن میں سبکدوش ہورہے ہیں۔ میں اُنکی خدمات کیلئے اُن کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ان خدمات نے میرے ہاتھ مضبوط کئے اور میں نے اس مضبوطی سے اپنے فرائض انجام دئے۔ بورڈ کی طرف سے میں اُن کے تئیں نیک خواہشات کا اظہار کرتا ہوں۔ سیکریٹری صاحب کا خیال تھا کہ میں اُن کیلئے نوکری کی معیاد بڑھانے کی درخواست کروں گا خاص کر اُس خدمت کے عوض جو اُنہوں نے شیر کشمیر کی آمد کے دن جائنٹ سیکریٹری کے ساتھ مل کر انجام دی تھی۔ شیخ صاحب راضی خوشی چلے گئے اور سیکریٹری صاحب ریٹائر ہوگئے۔

مرحوم شیخ محمد عبداللہ مجھ سے ۱۹۷۷ء میں بھی خوش تھے۔ میں اُن کے پاس جاتا تھا اُس وقت بھی جب وہ علیل تھے۔ میں اُن کو سناتا تھا کہ میں بورڈ میں کیا کر رہا ہوں۔ لوگوں نے اُن کے پاس جانا بند کیا تھا۔ وہ بستر علالت پر تھے۔ لوگ سمجھتے تھے کہ وہ شاید گذر رہے ہیں مگر جب وہ صحت یاب ہوئے تو اُنہوں نے مجھے بلایا۔ انہوں نے کہا کہ وہ مجھے وائس

چانسلر بنانا چاہتے ہیں۔ میں نے کیا کہ میں نے بورڈ میں درسیات کا کام شروع کیا ہے۔ اُنہوں نے پھر ڈاکٹر رئیس احمد کو دلّی سے بلایا اور وائس چانسلر بنایا۔ اس کے ساتھ ساتھ شیخ صاحب نے مجھے بتایا کہ وہ جموں سے پبلک سروس کمیشن کیلئے ایک ممبر کی تقرری کرنے والے ہیں اور اُن کے پیش نظر پروفیسر نذیر احمد خان اور پروفیسر اقبال ہیں۔ وہ نذیر صاحب کو چاہتے ہیں مگر لوگ کہتے ہیں کہ نذیر صاحب دن دھاڑے دفتر میں شراب پیتے ہیں۔ میں نے کہا معاف کیجئے وہ کبھی شراب کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ مگر اُن کے چہرے سے شرابیوں جیسا غرور جھلکتا ہے۔ وہ محض اُن کی عادت ہے۔ پس نذیر صاحب پبلک سروس کمیشن کے ممبر بن گئے اور پھر اس کے چیرمین۔ میں دوسرے لوگوں کی بھی مدد کرتا تھا۔ بورڈ میں ہمارے ایک ڈپٹی سیکریٹری تھے، سید اکبر جلالی۔ اُن کی کارکردگی میں کوئی خاص بات نہیں تھی جس کی بنیاد پر اُن کی مدد کی جاسکتی تھی۔ ہم نے سُنا کہ اُن کی صاحبزادی کو بمبئی میں جراحی کی ضرورت درپیش ہے۔ ڈاکٹر علی محمد جان نے بمبئی کے کسی جراح کا نام تجویز کیا تھا جو دل کی بیماری سے واقف تھا۔ میں نے اُسے ایک لاکھ روپے دلایا اور صاحب زادی کا علاج کروایا۔

چیرمین بورڈ کی حیثیت سے میں نے انگلستان سے پروفیسر محمد مجیب کی کتاب The Indian Muslims کی پچاس کاپیاں منگوائی تھیں۔ میرا مقصد تھا کہ یہ کتاب ہائر سکنڈری سکولوں میں بھیجی جائے تاکہ ان مدارس میں تاریخی باد بہاری چلے اور پڑھنے والوں کے ذہن کھل جائیں۔ قیاس تھا کہ وہاں سے بورڈ کو کچھ feedback ملے اور اس طرح علمی معاملات میں کچھ گفتگو شروع ہو جائے۔ مگر مجھے ۱۹۸۰ء میں کمشنر بنایا گیا اور ایک مضحکہ خیز قدم اُٹھایا گیا۔ پروفیسر اندر جیت سنگھ اور پروفیسر سوز نے اس کتاب کی ایک کاپی شیر کشمیر کو بھیج دی۔ شیخ صاحب کو کتاب پڑھنے کا وقت ہی کہاں تھا۔ خاص کر اُس وقت جب سیاسی بادیہ نوردی اور خرابی صحت سے اُن پر دباؤ پڑ گیا تھا۔ دوسری کتاب این ڈی قریشی صاحب سیکریٹری ایجوکیشن کو بھیج دی گئی۔ تیسری کاپی اُلٹے بانس بریلی کو کا وظیفہ

پڑھتے پڑھتے میرے پاس پہنچی اور دونوں افسروں کے دستخط اپنے ماتھے پر ثبت کئے ہوئے۔ میں بورڈ پر چلا گیا اور چار کاپیاں خرید لیں اور اپنے چار بچوں کو امریکہ بھیج دیں۔ ایک کاپی پر لکھا۔ ''یہ کتاب کسی بھی ہندوستانی مسلمان کیلئے ضروری ہے تاکہ اُس کے ذہن کے دریچے کھل جائیں اور وہ اپنے آپ کو پہچان سکیں یہ جانتے ہوئے کہ ہندوستان میں ۱۰۰۰ سال کے اسلامی دور میں ہوا کیا۔'' ایل کے جہا گورنر ریاست جموں وکشمیر نے اسی دوران مجھے مشورہ دیا کہ میں اینل سیل Anil Seal کے ساتھ ٹیلی ویژن پر گفتگو کروں تاکہ یہاں لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ تعلیمی اداروں میں داخلے کی کیا صورت ہونی چاہیے اور نقل کتنی مذموم روایت ہے جس کا قلع قمع ضروری ہے۔ سیل ٹری نٹی کالج میں تاریخ کے پروفیسر تھے۔ گفتگو کے اختتام پر برسبیلِ تذکرہ میں نے اُن سے کہا کہ تاریخ کی کوئی کتاب ہے جو آزادی کے بعد ہندوستان میں چھپی ہو اور آپ کو پسند آئی ہو۔ اُس نے کہا شک کے بغیر The Indian Muslims پروفیسر مجیب کی اُنہیں بہت پسند آئی ہے اور اُس کتاب نے اُنہیں بہت متاثر کیا ہے۔ جمال قدوائی صاحب ایک دفعہ جامعہ کے وائس چانسلر تھے۔ اُنہوں نے کہا کہ پروفیسر سلام آئے تھے۔ قدوائی صاحب نے جب اُن کو کھانے پر بلایا تو اُنہوں نے کہا کہ کھانا بعد میں پہلے اُنہیں نوازشاً پروفیسر مجیب صاحب[1] کے پاس لے جایئے۔ وہ اُن کے ہاتھ چومنا چاہتے ہیں۔ اُنہوں نے دی انڈین مسلمز پڑھی تھی اور کتاب پڑھ کر مدہوش ہوئے تھے۔ مجیب صاحب کو معلوم تھا کہ سلام کون ہیں۔ جب سلام صاحب اُن کے پاس چلے گئے، مجیب صاحب نے ہاتھ ملایا مگر سلام صاحب نے ہاتھ ملا کر اُن کے ہاتھوں پر بوسے ثبت کئے اور واپس آ گئے۔

۱۔ کے، پی، ایس مینن نے کہا کہ آکسفورڈ میں مجیب صاحب اُن میں سب سے زیادہ شریف النفس اور نیک خُو صاحب تھے۔ مجیب صاحب نے کہا کہ مینن نے آکسفورڈ میں فسٹ کلاس مگر اُنہوں نے خود سیکنڈ کلاس حاصل کیا تھا۔ حبیب صاحب پیچھے رہ گئے تھے اس لئے کہ فرانسیسی زبان پر اُن کی پوری گرفت نہیں تھی۔

ایک اور باب پڑھیے! بورڈ کے چیرمین کی حیثیت سے میں نے آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کے ذریعے جموں وکشمیر کیلئے ایک ایٹلس اور ایک چھوٹی موٹی انگریزی اُردو ڈکشنری تیار کروائی تھی جس میں ۱۰۰۰ بنیادی الفاظ کے ساتھ ساتھ تصویریں بھی دی گئی تھیں۔ یہ تعلیمی مواد اُستادوں کی آنکھ کھولنے اور طلباء اور طالبات کی بنیادی اہلیت بڑھانے کیلئے تیار کرایا تھا۔ رنگوں سے اس کی جاذبیت اور دلچسپی بڑھائی گئی تھی۔ اسی طرح ''دنیا کی کہانی'' جیسی چھوٹی مگر بہت ہی پُرمعنی تاریخی کتاب جامعہ والوں سے منت سماجت کر کے حاصل کی گئی تھی اور نہایت کم قیمت پر ہزاروں کی کتاب میں چھپوائی گئی تھی۔[1] غرض یہ تھی کہ پڑھانے والوں اور پڑھنے والوں کا زاویہ نگاہ وسیع ہو اور فکر کی اچھی خاصی تربیت بھی ہو۔ مجیب صاحب کی ''روسی ادب کی تاریخ'' دوسری کتاب تھی جو اسلیئے چھپوائی گئی تھی تا کہ کشمیر کے طالب علموں اور طالبات کے اندر ادبی شعور پیدا ہو اور وہ دھیرے دھیرے دنیائے ادب میں قدم رکھ سکیں۔ جرمنی کے عظیم ترین مفکّر وولف گانگ گائٹے کی کتاب ''فواسٹ'' کا اُردو رُوپ بھی نہایت مشکل سے حاصل کر کے چھپوایا گیا تھا تا کہ مذہب اور فلسفہ اکٹھے مل کر ہمارے طالب علموں اور طالبات کے ذہنی تانے بانے تیار کریں۔ اس کتاب کے بارے میں امریکہ میں مقیم یوسف بڈھ صاحب نے مجھے کہا کہ پیش لفظ کے ۴۰ صفحے اتنے شاندار ہیں کہ فکر میں تلاطم پیدا کرتے ہیں۔ ان صفوں میں فوسٹ کا تاریخی اور تدریجی فکری ارتقاء بھی دکھایا گیا ہے۔ ذاکر صاحب کی معرکتہ الآرا کتاب ''تعلیمی خطبات'' بھی چھپوا کر خاص کر استادوں کیلئے مہیا کی گئی تھی۔ یہ کتاب اُستادوں کی رگوں میں نیا خون بھر لیتی ہے اور اُن میں عزت نفس اور غیرت پیدا کرتی ہے۔ انسان سازی، قوم نوازی، کردار اور شخصیت کی تعمیر کیلئے بھی یہ کتاب بہت ہی مفید اور کارآمد ہے۔ ذاکر صاحب اور مجیب صاحب کے کچھ خطبات بھی جمع

۱۔ اس کی قیمت صرف چھ روپے تھی۔ اگر میں اس وقت تعلیم کا سربراہ ہوتا تو میں قرار دیتا کہ بارہویں جماعت میں اس کتاب میں پاس ہونا لازمی ہے۔ میں ٹیچرس ٹریننگ اداروں میں بھی اس کو لازمی قرار دیتا۔

کئے گئے تھے تاکہ پڑھنے والوں کے سامنے اعلیٰ قدریں اور اعلیٰ مقاصد رکھے جائیں تاکہ سوتے ہوئے جاگ اُٹھیں۔ یہ مواد ہزاروں روپے خرچ کر کے چھپوایا گیا تھا تاکہ محکمہ تعلیم کے حوالے کیا جائے اور اُن کے ذریعے مدرسوں میں مفت تقسیم کیا جائے۔ حسرت ہے کہ جب میں کمشنر کی حیثیت سے سکولوں میں پہنچا، میں نے دیکھا کہ یہ سارا مواد غائب کر دیا گیا تھا۔ استاد بھی تابناک نور سے محروم کر دئے گئے تھے اور شاگرد بھی۔ اگر شیر کشمیر نے ''حرام خوروں کا حساب'' لیا ہوتا تو ہماری محنت اکارت نہ جاتی اور ہمارا شوق ٹھٹھر نہ جاتا۔ ذرا سوچئے یہ عفریت کہاں سے نازل ہوئے تھے جنہوں نے یہ نور تاریکیوں میں بدل ڈالا تھا۔

میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں کہ پروفیسر رئیس احمد کے آنے سے پہلے شیخ صاحب مجھے وائس چانسلر بنانا چاہتے تھے۔ دوسری بار جب وائس چانسلر بنانے کی بات اُٹھی تو پروفیسر ستیہ بھوشن نے شیخ صاحب کو پٹی پڑھائی کہ این سی آر ٹی کتابوں کے رائج کرنے سے جو مشکلات پیدا ہو گئے ہیں وہ آغا صاحب کمشنر ایجوکیشن کی حیثیت سے حل کر سکتے ہیں۔ اس لئے وہ خود جموں یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو گئے اور میں اُن کی جگہ شیخ صاحب کے حکم سے کمشنر بنا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہماری مروّجہ سکولی کتابیں فرسودہ تھیں اور وقت کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتی تھیں۔ مگر این، سی، آر، ٹی سے لائی گئی کتابیں اتنی مشکل تھیں کہ اساتذہ کو اُن کو چلانے کیلئے زبردست تربیت و تعلیم کی ضرورت تھی۔ میں ڈان کیوتے اس کے لئے بھی رضامند ہو گیا۔ بورڈ چھوڑ دیا اور آ گیا تعلیم کے وسیع میدان میں۔ ہم اُستادوں کی تعلیم و تربیت کے کام میں لگ گئے۔ میں نے دہلی سے قابل آدمیوں کو لایا اور اُن سے سماجی علوم پر کتابیں زبان کے اعتبار سے آسان بنوا دیں۔ دہلی کے لوگوں میں صدیق الرحمٰن قدوائی کا نام خصوصاً لیا جا سکتا ہے۔ یہ جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے اُردو کے پروفیسر تھے۔ اُن کو شان سے اور آرام سے لال منڈی پر واقع بورڈ کے گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرایا گیا۔ ہندی کیلئے بھی ایک قابل شخص کو لایا گیا۔ میں نے خواتین سے بھی استانیوں کو تربیت دلائی تاکہ

انگریزی، حساب اور سائنس کی بات سکولوں میں چلے۔ یہ بڑی پیش قدمی تھی۔ اُن دنوں میری گھر والی کشمیر میں ڈپٹی دائریکٹر ایجوکیشن تھی۔ اُوڑی کے محمد شفیع صاحب وزیر تعلیم تھے۔ اُنہوں نے مکمل تعاون دیا اور اُن کی مہربانی سے ٹریننگ پروگرام اچھی طرح سے چلے۔ وہ سرمائی شدّتوں کے باوجود سنٹروں میں جاتے تھے اور کئی جگہوں پر خود بخاری جلاتے تھے اور اس طرح کشمیر کی تعلیمی انتظامیہ میں ایک بہترین روایت قائم کرتے تھے اور شاندار مثال مگر جلدی ہی حالات نے نہ جانے کس طرح پلڑا کھایا۔ زونل ایجوکیشن آفیسر، ہیڈ ماسٹر اور دیگر منتظمین نے سرد مہری سے کام لینا شروع کیا۔ جب تک ست لال رازداں اور گوکل ناتھ موجود تھے وہ مسلمان فرماں رواؤں کے بچوں کو کشمیر کی کرسیوں پر بیٹھنے کیلئے تیار کرتے تھے۔ عام شہری (سرینگر کے شہری خاص کر) خراٹے لیتے تھے۔ میں نے بالکل ست لال، گوکل ناتھ کا پروگرام حساب اور سائنس موتی لال وکیل، ووکھلو اور برج لال کول کے ذریعے دور دراز دیہات تک پہنچایا۔ ہارس برا کی تحریک "ذرا سوچئے" سے بھی کھلبلی مچی کیونکہ تعلیم کے ساتھ سوچنے اور عقل سے کام کرنے کی تحریک شروع ہوئی۔ ہارس برا کا گلا بورڈ میں بھی گھونٹ دیا گیا اور وہ ساری محنت ضائع کر دی گئی۔ حساب اور سائنس کا ویکٹ فیلڈ میں گرا دیا گیا۔ جو مڈل کلاس رَس گُلے کھا رہا تھا، اُس نے سمجھ لیا کہ اب چھالیا پر گزارا کرنا ہوگا۔ اسلئے اُنہوں نے اپنے کارندوں کے ذریعے رکاوٹیں کھڑی کر دیں۔ اس کی کچھ اور وضاحتیں!

فضا مکدّر کرنے میں امیر کاروباری پختہ کار اور سرکاری اہلکار اکٹھے مل گئے تھے۔ پہلے اُنہوں نے نقل عام کرائی تا کہ عام لوگوں کے بچوں کی عادتیں خراب کی جاسکیں اور وہ تقاوی قرضوں اور بن کمائے پیسوں کی طرح تعلیم میں بھی پڑھنے لکھنے کی بغیر ہی سند حاصل کر سکیں۔ دوسرا فائدہ یہ تھا کہ نقلی سند یافتہ لوگ آسانی کیساتھ چمچے بن جاتے ہیں اور جی حضوری۔ اُن کا کردار علیل ہوتا ہے۔ اس لئے وہ بندروں کی طرح ناچتے ہیں اور اپنے آقاؤں کی ہر بات مانتے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ قابلیت (merit) کا کوئی

شریک پیدا نہیں ہوتا اور یہ آسانی سے اچھے مدرسوں میں پڑھنے سے جھولی میں پڑ جاتی ہے۔[1] جب نقل کو شیخ صاحب کی وجہ سے زخ پہنچ گیا، تو سائنس، ریاضی اور جدید طرز پر لکھی گئی سماجی علوم کی کتابوں کو عام ہونے نہ دیا گیا۔ اس سلسلے میں ایک اعلیٰ افسر کی کہانی پر معنی ہے اور سننے کے لائق۔ انہوں نے مجھے اس لئے بلایا کہ میں اس کی اولاد کیلئے بورڈ آف سکول ایجوکیشن میں نمبرات کا انتظام کراؤں۔ مجھے معلوم نہیں کہ اُس کی اولاد لڑکا تھی یا لڑکی مگر وہ چاہتے تھے نمبرات۔ ایک چیف منسٹر صاحب کے زمانے میں بھی ایک پروفیسر صاحب نے جو بعد میں سیکریٹری بنائے گئے تھے، ایک منظور نظر کیلئے بھی اتنے زیادہ نمبرات رکھوائے تھے کہ دور سے دکھائی دیتا تھا کہ نمبرات نقلی ہیں۔ پروفیسر صاحب ہوشیار پنڈت تھے اس لئے اُنہوں نے حکمران کو بھی خوش کر دیا تھا مگر نقلی نمبرات کا بھانڈا ابھی پھوڑ ڈالا تھا۔ میں نے تو بڑے افسر سے انکار کیا تھا مگر مجھے معلوم تھا کہ نہ تھرڈ ڈویژن مسئلہ ہے اور نہ سکنڈ کیونکہ نیا کشمیر کے پلے ہوئے کارندے کسی نہ کسی کسی طرح انتظام کرتے ہیں اور اولاد کو منصبوں پر بٹھانے کیلئے۔ اگر یہاں ہندوستان میں کام نہ چلا، تو منصب داری کیلئے کچھ عرصے کیلئے باہر بھی بھجوانا پڑا تو کیا ہوا۔ کبھی کبھی پسماندہ لوگوں اور پسماندہ علاقوں کی بنیادوں پر بھی اولاد کو نیا کشمیر کی تھالی سے چیدہ چیدہ غذائیں کھلوانے کا انتظام کیا جاتا تھا۔[2]

۱۔ آج نقل نہیں۔ آج کو چنگ سنٹر ہیں اور ایسے مدرسے جن میں گھڑی گھڑی یونٹ ٹیسٹ لئے جاتے ہیں اور بچوں کی توجہ ہاں/نہیں جوابات کو رٹنے کی طرف مبذول کرائی جاتی ہے۔ سوچنے سمجھنے، مشاہدہ کے ذریعے فکری اور تنقیدی صلاحیتیں بیدار کرنے، تخلیقی تعلیم حاصل کرنے کے امکانات اُکھاڑ دئے جاتے ہیں۔ پھر فیل پاس کا مخصہ اور Distinction کی بدعت پیدا کر کے نشہ آور دوائیاں کھلوائی جاتی ہیں یا جنسی کھیل تماشے رچائے جاتے ہیں۔

۲۔ اس طرح کشمیر میں بھی انسان کے جسم پر پلنے والے طفیلی کیڑے پیدا ہو گئے۔ شیر کشمیر ان ہی لوگوں کو کبھی ''پوہرہ کوکہ'' (جلے ہوئے چاول کے سخت ٹکڑوں پر پلنے والے گندی نالیوں کے کیڑے) یا ''حرام خور'' کہتے تھے۔ ان کی وجہ سے کشمیر میں اچھی خاصی تعلیم کا انتظام کبھی ہو نہ پایا اور تعلیم کے ذریعے اعلیٰ مقاصد کا حصول ممکن نہ ہو سکا۔ تعجب کی بات ہے کہ جب میں نے کہا کہ اچھے اُستادوں کو اچھا کام کرنے کیلئے زائد سالانہ ترقی دیجائے تو شفیع صاحب اور سیکریٹری ایجوکیشن بھی اکڑ گئے۔ میں نے طوفانی سمندر میں ناؤ چلائی تھی۔ دیکھا کہ میں اکیلا رہ گیا تھا۔

مگر مجھے معلوم ہے کہ یہ کشمیر میں ہی نہیں ہو رہا تھا۔ ہندوستان کی دیگر ریاستوں میں بھی خاص لوگوں کیلئے انگریزی اور عام لوگوں کیلئے جدید زبانیں تعلیم کا ذریعہ تھیں۔ اس طرح اوپری طبقے کے لوگ اپنی اپنی ترقی کے سامان بہم کرتے تھے۔ افریقہ اور دوسری جگہوں پر بھی خاص طبقہ عام لوگوں پر طفیلی کیڑوں کی طرح پلتا رہا۔ جمہوریت اور سماجی جاگرتی سے مشکل پیدا ہوگئی جس وجہ سے نفاست مقدار اور مساوات کے ساتھ ایک ہی خط مستقیم میں لائی نہ جاسکی۔

میں کمشنر کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہا تھا کہ کشمیر میں اسلام کی چودھویں صدی کی سال گرہ منانے کا اعلان ہوا۔ اسلام پندرہ ویں صدی میں داخل ہوا تھا۔ اس سلسلے میں ٹورسٹ سنٹر سرینگر میں بہت بڑی نمائش کا انتظام ہو رہا تھا۔ ہم نے سوچا کہ ہم بھی کچھ تخلیقی کام کر دکھائیں اور کالج آف ایجوکیشن سرینگر میں اس کی تیاری کریں۔ ''سائنس اور ثقافت کو اسلام کا عطیہ'' ہماری نمائش کا عنوان بنا۔ میں نے تعلیم میں کام کرنے والے تمام چیدہ چیدہ فنکاروں کو یکجا کیا اور کام شروع کیا۔ صبح سے شام تک ہمارے فنکار اور ہمارے اُستاد کام کرتے رہے۔ محنت شاقہ کے بعد بیس کمروں میں نمائش کا سامان رکھا گیا۔ آئیل پینٹنگز (Oil Paintings) تیار کروائی گئیں، مقالے لکھوائے گئے، اسلامی تہذیب وتمدن پر مستند کتابوں کی نمائش کی گئی۔ پہلے شیخ صاحب میرے اس قدم پر ناراض تھے مگر میں نے اُنہیں آمادہ کیا کہ وہ نمائش کا افتتاح کریں۔ محمد یوسف ٹینگ صاحب جو ٹورسٹ سنٹر میں نمائش کے انتظامات کر رہے تھے، اِدھر اُدھر لوگوں سے کہہ رہے تھے کہ آغا صاحب کو اُن کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے تھا۔ وہ جو بھی کام کالج آف ایجوکیشن میں کر رہے ہیں۔ یہاں ٹورسٹ سنٹر میں آنا چاہیے''۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ٹینگ صاحب میرے شاگرد تھے جب وہ ویلج لیول ورکر کی حیثیت سے میری نگرانی میں تربیت پا رہے تھے۔ ٹینگ صاحب کی نمائش کی خاص بات یہ تھی کہ اُنہوں نے بقول اُن کے حضرت عثمانؓ خلیفہ

سوم کے وقت کا ایک قرآنی نسخہ حاصل کیا تھا اور اُسے نمائش میں رکھا تھا۔ بہر حال جب شیر کشمیر کالج آف ایجوکیشن کے صحن میں مرسڈیز گاڑی سے باہر نکلے، تھوڑی تھوڑی بارش ہو رہی تھی۔ شیخ صاحب لمبا سا چوغہ پہنے ہوئے تھے۔ گاڑی سے اُترتے ہی اُنہوں نے کہا کہ وہ صرف پندرہ منٹ گذار سکتے ہیں۔ میں نے کہا صرف پانچ منٹ گذاریئے تا کہ نمائش کا افتتاح ہو۔ جونہی وہ ہال میں داخل ہوئے میں نے ساری بتیاں بند کرائیں۔ پھر ہال کو قمقموں سے روشن کرایا۔ کالج آف ایجوکیشن کے پرنسپل نے استقبالیہ پڑھا۔ شیر کشمیر نے نہ صرف نمائش کا افتتاح کیا بلکہ ہر کمرے میں شوق سے ہمارے کام کا جائزہ لیا اور اس کی سراہنا کی۔ اس طرح پندرہ منٹ کے بجائے دو گھنٹے گزار دئے اور خدا کے حوالے رخصت ہو گئے!

اسلام کی سائنسی اور ثقافتی ترقی اور احسان مندی کی نقاب کشائی کے بعد میں نے نمائش کا یہ سارا سامان جموں پہنچا دیا۔ میں نے وہاں بھی ایک اور نمائش کرنے کا پروگرام بنایا۔ ''قدیم ہندوستان میں مہاتما بدھ، سائنس اور ریاضیات'' پروگرام کا عنوان ٹھہرا۔ ہمارے کارکنوں نے دو مہینے جموں میں خوب کام کیا اور عہد رفتہ کی داستان مقروں شکل اختیار کر گئی۔ میں نے شیخ صاحب سے کہا کہ ہم جموں میں ایک طرف اسلامی ثقافت کے نمونوں کو پیش کر رہے ہیں اور دوسری طرف ہندوستان کی پرانی عظمت پر نمائشی سامان دکھا رہے ہیں۔ آپ تشریف لائیں اور افتتاح کریں۔ اُنہوں نے صاف انکار کیا۔ نتیجہ یہ کہ وہ سامان تتر بتر ہو گیا۔ ہماری محنت اکارت گئی۔ جمال قدوائی صاحب وائس چانسلر جامعہ ملّیہ اسلامیہ دلّی نے پیش کش کی کہ ہم یہ نمائش جامعہ میں کریں۔ میں نے اُن سے معذرت چاہی۔ بہر حال شیخ صاحب کے بدلتے ہوئے تیور دیکھ کر میں نے فیصلہ کیا کہ میں مستعفی ہو جاؤں گا۔ شیخ صاحب نے سُنا تو مجھے اپنے پاس بلایا۔ فرمایا ''میں سُن رہا ہوں کہ آپ نے قرآنِ شریف پڑھ کر استعفیٰ دیدیا۔ اس کا مطلب کیا ہے۔ میں نے کہا

''جناب آپ نے ایک دن مجھے میرواعظ مولوی فاروق کے پاس بھیج دیا تھا تاکہ میں اسلامیہ سکول کے بارے میں اسے مفید مشورے دوں۔ اُنہوں نے مجھے قرآن شریف کی پانچ سو کاپیاں دکھائیں جو سعودی عرب کے شاہ نے اُنہیں بھیج دی تھیں۔ ایک کاپی میں نے اُٹھائی اور کھولی۔ جو آیت میں نے دفعتاً پڑھی اُس کا ترجمہ عبداللہ یوسف علی نے یوں کیا تھا۔ Speak the truth even if it were against yourselves۔ مجھے یاد آیا کہ میری تاریخ پیدائش دو سال کم لکھی گئی تھی۔ میں اصلاً ساٹھ سال کا ہو گیا ہوں۔ اس لئے میں نے سبکدوش ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔ شیخ صاحب نے پھر فرمایا'' آپ نے مصمم ارادہ کیا ہے چھوڑنے کا؟'' میں نے کہا'' جناب بالکل سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے مگر میں آپ کا کامریڈ ہوں۔ آپ کسی وقت مجھے حکم دے سکتے ہیں اور میں آپ کی گلیاں صاف کرنے کیلئے آجاؤں گا۔'' شیخ صاحب نے زیادہ سنجیدگی کے ساتھ کہا'' یہ گلیوں کی بات ذرا سمجھایئے''۔ میں نے کہا گاندھی جی سے ایک دن کہا گیا کہ'' اگر آپ کو ہندوستان کا وائسرائے بنایا جائیگا تو آپ کیا کریں گے''؟ اُنہوں نے کہا کہ'' وہ سارا دن وائسرائے کی رہائش گاہ کے ساتھ منسلک چوتھے درجے کے ملازمین کے باطل خلا (latrines) صاف کرانے میں گذاریں گے''۔

مگر مجھے ایک اور حقیقت نے استعفیٰ دینے کی طرف مائل کر دیا تھا۔ اکونٹنٹ جنرل کا دفتر جلایا گیا تھا۔ کچھ پرنسپلوں اور پروفیسروں نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ تاریخ پیدائش بدلا کر اپنی ملازمت میں توسیع کرائیں گے۔ میں نے ایک دن اُن کی میٹنگ میں اُن سے کہا کہ وہ میٹرک پاس کرنے کی تاریخ بتائیں۔ اُنہوں نے کہا کہ'' مدت گزرنے کے ساتھ ساتھ بھول گئی ہے''۔ میں نے رنبیر سنگھ ہائی سکول سے پنجاب یونیورسٹی کا گزٹ منگوایا اور یہ معاملہ اعلیٰ سطح پر حکومت کی نوٹس میں لایا۔ معلوم ہوا کہ تاریخ پیدائش بدلانے کا معاملہ حکومت کیلئے مسائل پیدا کر سکتا تھا اس لئے حکومت اسے طشت از بام کرنے کیلئے تیار نہیں

تھی۔اس لئے میں نے استعفیٰ پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔

میں سرکاری میٹنگوں میں شیخ صاحب کی موجودگی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے بہت جرأت کے ساتھ بات کرتا تھا۔ایک دن محمود الرحمٰن صاحب نے بھی میرے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے اس بات کا تذکرہ کیا۔بورڈ میٹنگوں میں بھی میرا ایسا ہی رویہ رہتا تھا۔میں ہمیشہ ۱۹۵۲ء ۱۹۵۳ء کا حوالہ دیتے ہوئے شروع کرتا تھا۔شیخ صاحب نے میرے دل پر ایک گہری چھاپ ڈالی تھی مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جو کچھ ہوا تھا، میں نہ اُس کا خیال رکھتا تھا اور نہ پروا کرتا تھا۔اسلئے بھی سرکاری اہل کار، منسٹر، اور حکومت سے باہر بھی ذاتی مفادات کا خیال رکھنے والے لوگ مجھ سے خائف بھی رہتے تھے اور میرے راستے میں روڑے اٹکاتے تھے۔شیخ صاحب کے جیل جانے سے انتظامیہ کا موڈ بدل گیا تھا اور خرابیاں شروع ہوگئی تھیں۔مگر جب وہ ۱۹۷۵ء میں واپس آئے، میں نے دیکھا کہ دیانت داری پھر سے حکومت کا اصول نہ بن سکی۔روز روز دیانت دارانہ کام مشکل سے مشکل بنتا گیا اور مختلف قسم کی اجارہ داریاں شروع ہوئیں۔جب وہ آخری سفر پر چلے گئے، مجھے بھی کہا گیا کہ ان کی وفات پر شائع ہونیوالی ایک یادگار کتاب کیلئے مضمون لکھوں۔یہ کتاب جسٹس ہدایت اللہ نے شائع کی تھی۔جسٹس ہدایت اللہ ہمارے وائس پریذیڈنٹ بھی رہ چکے ہیں اور تعریف کے محتاج نہیں۔میں نے لکھا تھا کہ شیخ محمد عبداللہ بہت بلند قامت شخصیت تھی اور بہت عظیم۔جن لوگوں نے تحریک آزادی میں حصہ لیا اُن میں اُن کی ذات تابندہ تر ہے۔اُنہوں نے ہمیں بیدار کیا۔مگر میں نے یہ بھی لکھا کہ ہندوستان میں، پاکستان میں رشوت ستانی آرٹ بن گئی ہے مگر یہاں جموں وکشمیر میں نہ انس۔

محمد شفیع صاحب اُوڑی ہمارے منسٹر تھے۔وہ پہلے پہلے بہت ہی اچھے طریقے سے پیش آتے تھے اور حوصلہ افزائی کرتے تھے۔جوں جوں وہ پختہ ہوتے گئے، اُنہوں نے بھی رُخ بدل ڈالا۔اُن کے دل میں اس دن کانٹا چبھ گیا جب شیر کشمیر نے میرے سامنے اُنہیں ڈانٹ سنائی۔میں شیخ صاحب کے پاس گیا تھا اور اُن سے کہا تھا کہ میری ایک فائل شفیع

صاحب کے پاس دو مہینوں سے پڑی ہوئی ہے اور واپس ہی نہیں آتی۔ اس فائل میں نئے پرنسپلوں کا نام درج ہے جن میں پروفیسر ستیش رینہ بھی شامل ہے۔ پروفیسر رینہ کو میں نے ایس پی کالج میں رکھا تھا۔ وہ مجھے دیگر پرنسپلوں سے زیادہ ترقی یافتہ اور بہتر دکھائی دیا تھا۔ تمام مسلم گروپ اکٹھا ہو گیا تھا اور سیخ پا۔ اُنہوں نے شفیع صاحب پر دباؤ ڈالا تھا کہ وہ پروفیسر رینہ کو بدل ڈالے۔ میں اپنی تجویز پر ڈٹا رہا۔ جونہی شیخ صاحب نے سُنا تو انہوں نے شفیع صاحب کو ٹوکا یہ کہتے ہوئے کہ ہائر ایجوکیشن پر اُن کی نظر محدود ہے۔ شفیع صاحب افسروں کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے تربیت پا چکے تھے اس لئے اُنہوں نے میرا راستہ روکنے کی ٹھان لی۔ انہوں نے صاف کہہ دیا کہ میں نے اُنکے ساتھ ہولی کھیلی۔ فاروق صاحب جب چیف منسٹر ہو گئے تو اُنہوں نے میری ماں تک کو بھی مبارکباد دی کہ آغا صاحب کو وائس چانسلر بنا دیا گیا ہے مگر شفیع صاحب نے راستہ نہ چھوڑا۔ مختصر یہ کہ انسپکٹری سے فاروق صاحب کے عہد تک مسلم افسراں اور سرکاری اہل کار مجھ سے ناراض رہے کہ میں اُن کا خیال نہیں رکھتا۔ ان میں ایک زمانے میں فاروق صاحب بھی شامل تھے جن کی بات میں نے نہیں مانی تھی اور اُن کے رشتہ دار کو تبدیل کیا تھا۔ میں نے جامعہ میں چھ سال گزارے تھے۔ وہاں سے میں ایک نیا جوش، ایک نیا ولولہ لیکے آیا تھا۔ یہ جوش اور ولولہ مشکلات کے باوجود میری زندگی کا سرمایہ رہا۔ میں نے اپنی زندگی کے شب و روز اسی جوش اور ولولے میں خوشی اور اطمینان سے گزارے۔ شاید کردار کی اس پختگی اور خدمتِ خلق اللہ کی لگن نے مجھے سب مخالف کوششوں کے باجود اچھے اچھے عہدوں پر کام کرایا۔ انسپکٹری، ڈائریکٹری، کمشنری سے گزرتے ہوئے میں پروفیسر رہا۔ چیرمین بورڈ آف سکول ایجوکیشن رہا، چیرمین کمپی ٹنٹ اتھارٹی رہا اور ملک کے اندر اور باہر بایہ ناز شخصیتوں کے ساتھ دوش بدوش کام کرتا رہا۔ خدا نے جو توفیق دی تھی، اس کے مطابق کام کرتا رہا۔ ضمیر نے ہمیشہ میری راہنمائی کی اور میں نے بنی نوع انسان کیلئے ایک خاکسار کی حیثیت سے کام کرنے میں فخر محسوس کیا!

شیخ صاحب واصل بحق ہو گئے۔ پاسا پلٹ گیا۔ نومبر، دسمبر ۱۹۸۲ء میں ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے مجھے کشمیر یونیورسٹی کی پروفیسری اور صدارت پھر سونپ دی۔ وہ یونیورسٹی میں کہتے تھے کہ شعبہ تعلیم اچھی طرح چلتا نہیں اس لئے اُنہوں نے مجھے پھر بلایا۔ یونیورسٹی جانے سے پہلے میں وِل ڈوراں کی مایہ ناز کتاب دی سٹوری آف سیولی ذیشن (The Story of Civilization) کی بڑی بڑی جلدیں پھر سے پڑھتا تھا۔ یونیورسٹی میں دوبارہ کام شروع کرنے کے ساتھ ساتھ میں نے بہت کوشش کی کہ شعبہ تعلیم کا وقار پھر لوٹ آئے۔ اس شعبے میں اب نہ صرف ایم ایڈ کورس پڑھایا جاتا تھا بلکہ ایم اے ایجوکیشن بھی شروع کیا گیا تھا۔ دونوں کورسوں میں سینکڑوں کی تعداد میں طلباء اور طالبات کو داخلہ دیا جاتا تھا۔ ایم، فل اور پی، ایچ، ڈی بھی شروع کئے گئے تھے۔ مگر نہ نئی کتابیں آتی تھیں اور نہ رسائل اور جرائد۔ سٹاف بھی وہی پرانا تھا، اس لئے ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ اچھا خاصا فش مارکیٹ (fish market) بن گیا تھا۔ شفیع صاحب بدستور مجھ سے ناراض تھے۔ نرجامٹو اور ستیش رینہ کی پرنسپلوں کی حیثیت سے تقرری شاید وہ ابھی بھول نہیں پاتے تھے۔ اُنہوں نے قانون کے پروفیسر شاہد صدیقی کو کہا تھا کہ آغا صاحب کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ حکومت کی مجبوریوں کو سمجھتے نہیں۔ میرے ایک اور ساتھی نے کہا کہ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر فاروق کے پاس وائس چانسلر کے خلاف شکایت لے کے گئے تھے۔ فاروق صاحب نے جب اُن کو کہا کہ وہ مجھے وائس چانسلر بنائیں گے تو پروفیسروں نے کہا۔ ''جناب کیرلا سے کسی عیسائی کو لایئے مگر آغا اشرف صاحب کو نہ لایئے۔ ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔'' اُن دنوں فاروق صاحب نے مختلف جگہوں پر تذکرہ کیا تھا کہ وہ مجھے وائس چانسلر بنائیں گے۔ پھر اُنہوں نے بھی اپنا ارادہ ترک کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یونیورسٹی رشوت کی انجمن بن گئی تھی۔ ایک ثبوت اس کا یہ ہے کہ ڈاکٹر رئیس احمد نے مجھے ایک دن بتایا کہ اُن کے پاس یونیورسٹی کا ایک پروفیسر آیا۔ اُس نے نہ جانے کس ملک سے کچھ کتابیں چھپوا کر لائی تھیں۔ اُس نے رئیس

صاحب سے کہا کہ یہ فارسی مخطوطے ہیں۔

اسی زمانے میں مجھے انجینئرنگ کالج میں یک نفری کمیشن بنا کر تحقیقات کرنیکا حکم بھی ملا۔ وکھلو صاحب نے کچھ تین سوڈیلی ویجرس بنائے تھے۔ اسی سلسلے میں میں نے تحقیقات کی اور ایک رپورٹ بنائی۔ پھر مجھے چیرمین کمپی ٹنٹ اتھارٹی بنایا گیا۔ یہ ایک کمیٹی تھی جو میڈیکل اور انجینئرنگ کی تعلیم کیلئے اُمیدواروں کا انتخاب کرتی تھی۔ میں اسے لاٹری کمیٹی یا بورڈ گردانتا تھا۔ اُمیدوار خود لکھی ہوئی پرچیاں اُٹھاتے تھے۔ ان پر سوالات لکھے ہوتے تھے۔ اُن سے کہا جاتا تھا کہ پرچیوں پر لکھے ہوئے سوالات کے جوابات دیں۔ ان جوابات کی بنیاد پر اُمیدواروں کا انتخاب ہوتا تھا۔ مجھے اسی ریکروٹمنٹ بورڈ کا مستقل چیرمین بنایا گیا۔ جب کام اچھی طرح چلنے لگا تو میرے کام کو ہائی کورٹ میں للکارا گیا۔ شاید ایک منسٹر صاحب کے فرزند چناؤ میں آئے نہیں تھے۔ ہائی کورٹ نے معاملہ گول کر دیا۔ کورٹ نے کہا کہ جب انٹرویو چلتے تھے تو آپ عدالت کا رُخ کرتے تھے۔ جب انٹرویو منسوخ کئے گئے تب بھی آپ اسکے حق میں عدالتِ عالیہ کا رُخ کرتے ہیں۔ لہٰذا اس متلوّن مزاجی کا یہاں کوئی علاج نہیں۔

میرا کام چیرمین ریکروٹمنٹ بورڈ کی حیثیت سے آسان نہیں تھا کیونکہ اب کشمیر کے حالات بدل گئے تھے۔ سرینگر میں قریباً روز دھماکے ہوتے تھے، گولیاں چلتی تھیں۔ ٹپلو صاحب[1] اور گنجو صاحب کو ہلاک کر دیا گیا تھا۔ مجھے ٹیلی فون پر اطلاع ملی تھی کہ میں بھی

۱۔ یہ وہی ٹک لال ٹپلو ہے جو علیگڈھ میں پروفیسر حبیب کا شاگرد تھا۔ حبیب صاحب کئی بار اُس کی مدد کر چکے تھے مگر ٹپلو صاحب کو اُن کا زبردست احترام تھا۔ فیضی صاحب کی دعوت پر جب حبیب صاحب کشمیر آئے تو ٹپلو صاحب اُن کے قدموں پر گر گیا۔ ٹپلو صاحب نے اُن سے گھر آنے کی منت سماجت کی۔ حبیب صاحب نے مجھے اپنے ساتھ لے لیا۔ جب ہم ٹپلو صاحب کے کمرے میں پہنچے تو ٹپلو صاحب نے حبیب صاحب کے موزے نکالے اور پانی سے بھری چلمچی میں اُن کے پیر دھو کر پانی پینا چاہا۔ حبیب صاحب نے چونک کر ذات پات کی اس فرسودہ روایت کی اجازت نہ دی۔ ٹپلو صاحب کی ماں اور بیوی نے حبیب صاحب کا شکریہ ادا کیا اور کافی احترام کے ساتھ اُنہیں رخصت کیا۔ ٹپلو صاحب کو شاید اس لئے مار دیا گیا تھا کہ وہ وکیلوں کی محفلوں میں بیٹھ کر آزادی کی تحریک چلانے والوں کو بُرا بھلا کہتے تھے۔

دشمنوں کی فہرست میں شامل تھا۔ مولانا فاروق اور لسہ کول بھی ہلاک ہو گئے تھے۔ لسہ کول ہمارے دوست تھے۔ میرے اوپر بھی موت کے بادل منڈلا رہے تھے۔ اُدھر ڈاکٹر گورو مرحوم بھی ناراض تھے۔ وہ کہتے تھے کہ میں پنڈتوں کی طرف داری کر رہا ہوں۔ اُن کے فرزند کو میڈیکل کالج میں داخلہ نہ ملا تھا۔ میر قاسم کے رشتہ دار ڈاکٹر ظہور بھی ناراض ہو گئے تھے کیونکہ اُن کے فرزند کو بھی چھوڑ دیا گیا تھا۔ کسی اُستاد ظہور احمد کے بیٹے کو چُنا گیا تھا۔ اُس کا بیٹا داخلہ پا چکا تھا۔ وہ لڑکا اس وقت انگلستان میں ڈاکٹر ہے۔ میں اس ماحول میں گھٹ گھٹ کے سانس لیتا تھا۔ ستیش رینہ بہت پریشان ہوئے۔ وہ بورڈ کے سیکریٹری تھے۔ اُن کو کپواڑہ سے خط آیا تھا کہ تم ''فاروق عبداللہ کے کمپیوٹر بوائے (Computer boy) ہو۔ تم گپکار میں محفوظ نہیں ہو۔ ہم تم کو اڑا دیں گے۔ پچھلے تیس سال سے ۴۸۵ لوگ سرینگر ضلع سے ڈاکٹر اور انجینئر بنے ہیں اور کپواڑہ ضلع سے صرف پانچ۔ جب تک ہمارے ضلع سے پندرہ لوگوں کو میڈیسن (Medicine) اور انجینئرنگ (Engineering) میں داخلہ نہیں دیا جاتا، تم اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنا۔'' یہ خط لیکر رینہ صاحب کمشنر ہوم کے پاس چلے گئے۔ موتی لال کول صاحب کمشنر ہوم تھے۔ اُنہوں نے رینہ صاحب کے بارے میں احتیاط سے کام لیا ہوگا۔ رینہ صاحب کی جگہ کسی مسلمان افسر کو لایا گیا۔ اُن دنوں جگ موہن حکومت چلاتے تھے۔ میں جب امریکہ سے واپس آیا تو رینہ صاحب کی جگہ کسی مسلمان افسر کو پایا۔ اتنے میں ٹکّر صاحب کشمیر کے منتظم بن گئے تھے۔ وہ زبانی امتحان (viva) پھر شروع کرنا چاہتے تھے۔ میں اس لاٹری کے خلاف تھا۔ میں نے ہرگز نہ مانا۔ پھر وہ زبانی امتحان کے پندرہ نمبر بارہویں جماعت کے گریڈ کیلئے رکھنا چاہتے تھے۔ میں زور لگا رہا تھا کہ زبردست رشوت اور نقل نے بارہویں جماعت کی ساکھ ہی ختم کر ڈالی تھی۔ مگر ٹکّر صاحب نے پندرہ نمبر اس کیلئے مخصوص کر ہی ڈالے۔ میں ۱۹۹۲ء تک جموں میں رہا۔ اس کے بعد میں نے رکروٹمنٹ بورڈ چھوڑ دیا۔ مگر میرے استعفیٰ کے اور بھی وجوہات تھے۔

اجیت کمار صاحب میرے سیکریٹری تھے۔ وہ سمجھتے نہ تھے کہ میں ریکروٹمنٹ بورڈ کا چیرمین ہوں۔ میری بات اُن کے حلق سے اُترتی نہیں تھی۔ میں نے اُسے صاف کہہ دیا تھا کہ جب تک میں چیرمین ہوں وہ کسی امیدوار کی حق تلفی کرنہیں سکتے اور نہ کسی کی طرفداری۔ انصاف کرنا اور وہ بھی معقول بنیادوں پر میرا کام ہے اور اس میں کوئی مداخلت نہیں کرسکتا۔ میں نے بڑے بڑے لوگوں کی اولاد کی طرف داری نہیں کی تھی۔ اُن کے ڈرائیوروں کے بچوں کے ساتھ انصاف کیا تھا۔ پرائمری سکول کے اُستادوں کا حق تسلیم کیا تھا۔ اس وجہ سے میڈیکل کالج کے پرنسپل، شیر کشمیر میڈیکل انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر بھی مجھ سے ناراض ہوئے۔ کبھی محکمہ صحت کے افسروں اور سیکریٹریوں کو بیچ میں لایا جاتا تھا اور میں واضح طور پر بتاتا تھا کہ میرے کام میں کوئی مداخلت نہیں کرسکتا۔ مختصر یہ کہ میں غرض مند حاکموں اور امیروں vested interest کا طرف دار نہیں تھا۔ بالآخر میں نے اپنی سرکاری غلامی کا طوق گردن سے باہر نکالا۔ جو بوٹے عمر بھر بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے اور کتابوں کی وسیع دنیا میں گھومنے پھرنے سے لگائے تھے، اُن کی مزید آبیاری آزاد انسان کی حیثیت سے میں نے پھر سے شروع کی۔ ٹکّر صاحب نے مضحکہ خیز حکم نامہ جاری کیا اور آغا اشرف کو دلّی بھیجا۔ کس جگہ پر یا کس لئے یہ حکم نامہ میں لکھا ہی نہیں تھا۔ میں نے ''کھسیانی بلّی کھمبا نوچے'' کہہ کر حکم نامہ پھاڑ دیا اور آزاد پنچھی کی طرح اُڑان شروع کی۔

گھرانہ

میری والدہ میرے برادر شوکت علی کے ساتھ مل گئی یہ تدبیر کرنے کیلئے کہ اگر میرا نکاح ہو جائے تو میں جامعہ چھوڑنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ آغا ناصر صاحب اُن دنوں سری نگر سے باہر کہیں تحصیل دار تھے۔ میں جامعہ میں تھا اور اپنے ایک ساتھی کی وساطت سے لکھنو چلا گیا تا کہ جامعہ کی سلور جوبلی کیلئے پیسہ لاؤں۔ میں ہوسٹلوں میں طلباء اور اساتذہ سے ملا اور اُن سے سلور جوبلی کے بارے میں بات کی۔ اتفاقاً میں ایک گھر میں داخل ہوا اور کنبے کے افراد سے ملا۔ اس کنبے کی ایک لڑکی کے ساتھ میرا نکاح ہونا منظور خدا تھا۔ یہ لڑکی کراستھ ویٹ (Crosth Waite) گرلز کالج الہ آباد میں پڑھتی تھی اور وہاں سے ہی ٹیچرس ڈپلوما اور دو سال کا جنرل ٹیچرس سارٹیفکیٹ حاصل کیا تھا۔ اب وہاں کے سکول میں پڑھاتی تھی۔ اصلاً اُس نے انٹرمیڈیٹ پاس کیا تھا۔ اس گھرانے کی مالی حالت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ میری ہونے والی ساس اچھے خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ اپنے عمر رسیدہ میاں کے ساتھ دیہاتی ماحول میں منتقل ہونا نہیں چاہتی تھی۔ اس لئے وہ اپنے برادر کے پاس کچھ مدّت کیلئے حیدر آباد میں ٹھہری ہوئی تھی۔ اُن کا نام سیّد سراج الحسن ترمذی تھا۔ پیشے کے لحاظ سے وکیل تھے مگر وہاں کانگریس کے پریذیڈنٹ۔ اُنہی کے نام پر کنگ کوٹھی روڈ ترمذی روڈ میں بدل گئی تھی۔ میرے سسر سرکاری نوکری سے فارغ ہو گئے تھے۔ ان کی عمر اب ماشاءاللہ نوے سال کی ہو گئی تھی۔ میں نے جب لڑکی دیکھی تو خواہش کی کہ اس کے ساتھ نکاح

کروں مگر یہ میری سادگی تھی۔ جامعہ میرے ذہن میں رچ گیا تھا اور میں کامریڈ ہو گیا تھا۔ میری ہونیوالی بیوی خوب رُو تھی مگر ذات کا معاملہ طے کئے بنا میری پیشکش بار آور ثابت ہوتی تو کیسے۔ یوپی کے مسلمان ہندوؤں کی طرح ذات پات کے شکار ہیں۔ میں نے اپنے رشتہ داروں سے سُنا تھا کہ ہم مغل ہیں۔ اُنہوں نے سنا تو کہا مغلوں میں اُن کا رشتہ کسی بھی صورت میں ہو نہیں سکتا۔ میں نے کہا اکبر اعظم مغل تھا۔ انہوں نے کہا یوپی کے مسلمانوں میں چار ذاتیں ہیں۔ سیّد، شیخ، مغل اور پٹھان۔ میں نے کہا میری والدہ خاندان سادات سے ہیں۔ میرے نانا کا نام آغا سید حسین ہے۔ یہ سُن کر انہوں نے از سرِ نو سوچنا شروع کیا۔ میرے سسر کشمیری محلّے میں گئے ہونگے اور وہاں حقیقت کا پتہ لگایا ہوگا۔ پس میں نے ان کے ساتھ عہد و پیماں باندھ لیا۔ پھر میں والدہ کے پاس آیا اور اُنہیں آگاہ کیا۔ اُنہوں نے کہا کہ وہ خود تشریف لے جائیں گی اور شادی اکتوبر میں کرائیں گی۔ مگر مجھے آغا شوکت کی بات سنائی دی۔ ''اُس کو پیسہ بالکل نہ دو۔ ہم اُسے جامعہ سے الگ کریں گے''۔ میں گھر سے نکلا مگر اُنہیں کہہ دیا کہ گیارہ اکتوبر شادی کا دن مقرّر ہے۔ میں نے سسرال والوں کو کہا کہ اگرچہ میرے گھر والے شادی پر بالکل رضامند نہیں، شادی گیارہ اکتوبر کو ہوگی۔ ذاکر صاحب نے کہا میں نے عہد کیا ہے اس لئے شادی ہوگی اور وہ خود اس میں شریک ہو جائیں گے۔ پس ذاکر صاحب، مجیب صاحب، اختر صاحب اور جامعہ کے میرے دیگر ساتھی میرے ساتھ لکھنو چلے گئے۔ اختر صاحب آرٹ ٹیچر تھے۔ بڑے عمدہ انسان تھے۔ اُنہوں نے کپڑوں اور دیگر چیزوں کا انتظام کیا تھا۔ ہم ریل میں گئے۔ میرے پاس پیسہ ہی نہ تھا۔ کتنی حیرت کی بات ہے۔ مگر میری والدہ نے کچھ پیسے ذاکر صاحب کے پاس رکھ چھوڑے تھے۔ وہ ۱۹۴۴ء میں جامعہ آئی تھیں۔ اُنہوں نے ذاکر صاحب، مجیب صاحب اور عابد صاحب کے خوبصورت مکان دیکھ لئے تھے۔ ذاکر صاحب سے کہا تھا کہ اگر اشرف نے جامعہ میں ہی ٹھہرنے کا فیصلہ کیا تو اس کے لئے بھی گھر کا انتظام کرنے کی

زحمت اٹھائیں۔ ذاکر صاحب نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ بیشک وہ میرے لئے بھی مکان بنوائیں گے۔ پھر والدہ نے ذاکر صاحب کو اس غرض کیلئے پندرہ سو روپے دئے تھے جو کچھ کم نہ تھے۔ اُن دنوں پندرہ سو روپے میں ایک بیگہ زمین ملتا تھا۔ ذاکر صاحب نے یہ پیسہ دفتر کو دیا تھا اور اس کے عوض اپنے گھر کے سامنے میرے لئے ایک پلاٹ تیار کروایا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس پلاٹ کو دیکھنے جاؤں۔ میں ذاکر صاحب کے پاس چلا گیا اور اُنہیں کہا۔ ''دیکھئے جناب اگر یہ ضروری ہے کہ لوگوں کو اپنے مکان ہوں، تو جامعہ میں اساتذہ کیلئے آپ کوارٹر کیوں بنا رہے ہیں۔ اگر میں جامعہ میں ہوں، مجھے اپنے مکان کی کیا ضرورت؟'' ذاکر صاحب پر میری باتوں کا اثر ہو گیا اور اُنہوں نے کہا کہ سبوں کو اپنے گھر جامعہ کے نام کرنے چاہیں۔ اس طرح میں نے اُن سے پندرہ سو روپے واپس لے لئے۔ ایک چھوٹی سی چوڑی، کچھ اچھی پوشاکیں، زربفت کا ایک گرارہ اپنی بیوی کیلئے خریدا۔ میرا خیال ہے کہ سسرال جانے کیلئے میں نے پانچ سو روپے خرچ کئے۔ میرے پاس کافی پیسہ نہیں تھا۔ میں نے وہی کیا جسے لوگ ناممکن کہتے ہیں۔ میں نے ذاکر صاحب اور مجیب صاحب کو سکنڈ کلاس کمپارٹمنٹ میں بٹھا دیا۔ ہم چھ اُستاد نوکروں کے کوارٹر میں بیٹھ گئے اور ساری رات وہاں ہی گزاری۔ یہ کوارٹر انگریزوں کے زمانے میں سکنڈ کلاس کمپارٹمنٹ کے ساتھ ہی ہوتا تھا۔ میں کہہ چکا ہوں کہ مجھے نانا کے ساتھ بے حد اُنس تھا۔ وہ ۴۴ میں وفات پا گئے تھے۔ میری شادی ۴۶ء میں ہو رہی تھی۔ مجھے اُن کی ایک اچکن ملی تھی، بالکل سیاہ رنگ کی۔ یہ انگلستان کی ریشم سے بنی تھی۔ ہم سب ریلوے سٹیشن کے ویٹنگ روم میں کپڑے بدلانے کیلئے گئے۔ جب میں یہی سیاہ اچکن پہنے باہر آیا تو ذاکر صاحب کو صدمہ سا ہوا۔ اُنہوں نے کہا کہ مجھے رنگین قبا پہنے ہوئے آنا چاہیے تھا۔ اُنہوں نے کہا چلو تانگے پر چلیں۔ میں نے مانا نہیں۔ لکھنو کے ریلوے سٹیشن پر صرف دو ٹیکسیاں تھیں۔ جب میں نے تانگہ نہ لیا تو ذاکر صاحب نے کہا میں اُن کے ساتھ اتفاق نہیں کر رہا

تھا، اُن کا مشورہ قبول نہیں کر رہا تھا اور من مانی کر رہا تھا۔ میں نے ایک ٹیکسی کرایے پر لی اور ہم بلرام پور گئے جہاں میری سالی کے گھر میں نکاح خوانی اور شادی کا انتظام کیا گیا تھا۔ میرے ہم زلف بلرام پور ہسپتال میں وارڈ آفیسر تھے۔ وہاں ہی اُن کا اپنا مکان تھا۔ ہم اچھے سے کمرے میں تکیوں کے ساتھ ٹیک لگا کے بیٹھ گئے۔ ہم نے خاصا اچھا کھانا کھایا، میرے سسر کے چھوٹے بھائی نکاح پڑھنے لگے تو میری گھر والی کا نام اقبال فاطمہ بتایا۔ اس موقعے پر ذاکر صاحب گویا دوسرے سرے سے آ کے مجھ پر جھپٹ گئے۔ ''ارے دُلہا میاں! آپ کو یقین ہے کہ جس لڑکی کو آپ نے دیکھا ہے، اُسی کے ساتھ آپ کی شادی ہو رہی ہے''۔ مجھے معلوم ہے کہ میں نے ذاکر صاحب کے ان کلمات کا کیا جواب دیا۔ ''صاحب، کوئی بات نہیں''، یقیناً صوفیہ فاطمہ ہی میری گھر والی تھی، وہی رعنا، وہی شریف زادی جس کو میں نے دیکھا تھا، وہی جس کی لطیف سی مسکراہٹوں میں اس کی شرافتِ طبع کروٹیں لیتی تھیں!

رزاق صاحب کا ریلوے سٹیشن میں ایک دوست تھا۔ اُس نے ہمارے لئے ایک بڑا انٹر کلاس کمرہ محفوظ کر دیا۔ اس کمرے میں ہم سب اچھی طرح سے بیٹھ سکتے تھے اور سو سکتے تھے۔ اب دوسرا مذاق! پونڈس کریم ہوا کرتی تھی اُن دنوں۔ میری گھر والی نے یہ کریم خریدی تھی اور اپنے پاس رکھی تھی۔ صبح سویرے اُس نے یہ کریم غسل خانے میں لی تھی۔ جب وہ نکلی تو اپنی انگوٹھی اور کریم غسل خانے میں ہی چھوڑ دی۔ اس کے نکلنے کے بعد ذاکر صاحب غسل خانے میں داخل ہوئے۔ جب وہ نکلے تو اُس نے بتایا کہ میری بیوی کریم اور انگوٹھی غسل خانے میں ہی چھوڑ گئی ہے۔ ذاکر صاحب نے سمجھا کہ کریم دانتوں کا سفوف ہے۔ اُس نے اس میں انگلی ڈالدی۔

سٹاف کے دوسرے اصحاب نے ہماری عزت افزائی کی جو قابلِ بیان ہے۔ جب ہم جامعہ پہنچ گئے طلباء دائیں اور بائیں قطاروں میں ہمارا استقبال کر رہے تھے۔ میں نے سب سے چھوٹا مکان پندرہ روپے ماہوار کرایے پر لیا۔ اس کا نام گُڑیا گھر تھا بے چارے

اُستاد نے ایک سوگز زمین خریدی تھی جس میں دو کمرے اور ایک برآمدہ بن گیا تھا۔ کھڑکیاں چھوٹی تھیں اور صحن چاروں طرف بند تھا۔ یہاں اس جگہ میری اپنی گھر والی کے ساتھ نئی زندگی شروع ہوگئی۔ ایک دوست گیا اور اُس نے چار کرسیاں خرید کے لائیں۔ میں نے ورما سٹور کشمیری گیٹ سے کتابوں کیلئے دو الماریاں لائیں۔ قیمت صرف پچیس روپیہ۔ خوش قسمتی سے میری گھر والی نے پلنگ اپنے ساتھ لایا تھا۔ بس اتنا ہی تھا ہمارے پاس! مگر گوشت کیلئے جالی دار چھوٹی الماری اور برتن بھی تھے۔ میں نے کھانے کی کچھ چیزیں مثلاً پنیر اور اچار وغیرہ بھی لایا تھا۔ میری والدہ نے مجھے چاندی کے دو چمچے دئے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دن ہم انڈے سے ناشتہ کر رہے تھے کہ کوّا اُڑتے اُڑتے آیا اور انڈے کے ساتھ چمچہ اُٹھا لے گیا۔ دو دن کے بعد اُسی کوّے نے چمچہ ہمارے صحن کی دیوار پر گرا دیا۔ میں نے اُٹھایا اور خوش ہوگیا۔ جامعہ کے لوگ ہمیں دعوتیں دیتے گئے اور ہماری عزت افزائی کرتے گئے۔ جونہی ہم گھر پہنچ گئے، ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب آگئے۔ پھر واپس چلے گئے اور نہا دھو کر ہمارے ہاں تشریف لائے۔ مجھے سو روپے دے مگر مجھے معلوم نہ تھا کہ میں نے ان روپیوں کا کرنا کیا تھا۔ میری گھر والی کو ایک سو پچاس روپے سلامی کے ملے۔ ذاکر صاحب نے مجھ سے کہا "آداب بجالاؤ"۔ میں نے "شکریہ" کہا۔ مجیب صاحب ہمیں لگاتار کھانے پر بلاتے رہے۔ اُن دنوں سب سے مزیدار بات یہ ہوتی تھی کہ دعوت کے روز مرغا پکتا تھا۔ جامعہ کی غذا بہت سادہ ہوا کرتی تھی۔ تین مہینوں کے اندر اندر میری گھر والی بھی سکول میں اُستانی ہوگئی۔ جامعہ اُن دنوں روایتی قسم کی برادری ہوا کرتی تھی۔ مجملاً مجیب صاحب کی بیگم کے بغیر سب خواتین برقعہ پہنتی تھیں۔ برقعہ والیاں اور برقعہ چھوڑنے والیاں الگ الگ رہتی تھیں۔ میری گھر والی بھی پردہ کرتی تھیں۔ کنور اشرف صاحب کمیونسٹ لیڈر تھے۔ ڈاکٹر اشرف کے تین فرزند بھی جامعہ میں تھے۔ بیگم ہوسٹل کی دیکھ بھال کرتی مگر پردہ نہیں کرتی۔ میری گھر والی لکھنو سے جامعہ آتی تو پردے میں آتی۔ میں

نے سوچا کہ مجھے اس بارے میں کوئی قدم اُٹھانا چاہیے۔ تین ہفتوں کے بعد ہم لکھنو دعوت پر گئے اور یہ رسمی دعوت تھی۔ یعنی دلہا دُلہن کا دوسری بار دُلہن کے گھر جانا۔ ہم جب واپس آئے تو جامعہ تک تانگہ لیا۔ جب ہم تانگے پر تھے، وہ برقعہ ڈھونڈھنے لگی۔ میں نے اُسے کہے بغیر بر۔ قعے کو بستر بند میں رکھدیا تھا۔ تانگے سے اُترنا اور برقعے کے بغیر چلنا، بس وہ دن اور برقعہ! ایک اور اُستاد کی بیوی پڑھی لکھی، تربیت یافتہ گریجویٹ بھی اُستانی بن گئی۔ اس طرح جامعہ میں عورتوں کا پڑھانا شروع ہوگیا۔ میری گھر والی اور عتیق صاحب کی گھر والی پہلی اُستانیاں تھیں جنہوں نے جامعہ کے بنیادی مدرسے میں پڑھانا شروع کیا۔ جب ذاکر صاحب کا انتقال ہوا، میری گھر والی کو ریڈیو کشمیر نے بلایا اور ذاکر صاحب کے بارے میں اُس سے گفتگو کی۔ اُس نے کہا جب وہ جامعہ میں اُستانی تھی، تو ذاکر صاحب کے پاس گئی۔ اُن سے گزارش کی کہ وہ کچھ ہدایات دیں تاکہ اچھی اُستانی بن سکے۔ ذاکر صاحب نے کہا جب سکول جاؤ تو سوئی اور دھاگہ ساتھ لیکے جایا کرو۔ کسی بچے کے کپڑے پھٹے ہوں، کٹے ہوں تو اُن کی سلائی کیا کرو۔ اگر بٹن گرتا ہو تو اسے لگایا کرو۔ بھگوان سہائے اُس وقت ہمارے گورنر تھے۔ وہ بنیادی تعلیم میں ایسے رول کی باتیں سن کر بہت متاثر ہوئے تھے اور اُنہوں نے صوفیہ اشرف کی سراہنا کی تھی۔

مجھے یاد ہے کہ ۸۵ء کے قریب میں اور میری گھر والی خزاں کا لطف اُٹھانے کیلئے کشمیر آئے۔ چھ بجے سے بجلی بند ہوجاتی تھی اور ہم گیس لیمپ جلاتے تھے۔ ہم گھر میں آگ جلاتے تھے اور دیوان پر بیٹھ کر آگ کی آنچ اور اس کے شعلوں کی طرف دیکھ دیکھ کر نہ جانے کن خیالوں میں کھو جاتے تھے۔ پھر گیس لیمپ بھی بند کرتے تھے اور شمعیں جلاتے تھے۔ دھیمی دھیمی روشنیوں کا سماں، میاں بیوی کا اکٹھے بیٹھنا اور مزے مزے کی باتیں کرنا، کبھی اس موضوع پر اور کبھی اُس موضوع پر اور آزاد ماحول میں، کتنا اچھا لگتا ہے۔ اتنے میں ساڑھے نو بج جاتے اور بجلی آجاتی۔ ہم ڈائننگ روم (Dining Room) میں جا کر کھانا

کھاتے تھے۔ خاموشیاں اور باتوں باتوں میں لذیز کھانوں کی طرح داریاں دل کی دُنیا پھر سے بسانے میں ہر طرح سے کوششیں کرتیں اور ہم زندگی کے نئے رنگ دیکھتے۔ ہم محسوس کرتے کہ کھاتے جائیں اور گذرے ہوئے ایام کے تجربے نئی زندگی کے نئے ڈھنگوں سے ملاتے رہیں، یہاں وہاں اور ہر جگہ۔ ہمارے سامنے مشرقی تجربوں کے رنگ کھِل جاتے اور مغربی تجربوں کے اور ہم اپنی اندرونی کیفیات کے ساتھ ان تجربوں کو ملا کر زندگی کی رنگا رنگ شیرینیاں محسوس کرتے۔ پھر عمر کے تقاضوں سے مجبور ہو کر تھکان محسوس کرتے اور آرام کرنے جاتے۔ ہماری نیندیں زندگی کے نت نئے رنگین مگر میٹھے اور تلخ تجربوں میں ڈبکیاں سی لیتی تھین یہاں تک کہ صبح صادق آواز دیتا، اُٹھو کمر کسو، اگر کچھ ابھی باقی ہے تو وہ بھی زندگی کے کھلیاں میں جمع کرو۔ میری گھر والی اچھے گھرانے میں پیدا ہوئی تھی۔ مذہبی ماحول نے اس کے اندر شرافت اور لیاقت کے ایسے انسانی معیار پیدا کئے تھے کہ اس کے محتاط بولوں میں کم سنی میں بھی طویل العمری متانت پیدا ہوئی تھی اور ذہن کو بیدار کرنے کی صلاحیت۔ اُس کا مذہب دینداری کی صورت اختیار کر گیا تھا اور بچوں کی پرداخت، دوستوں کی شناخت اور مہمان نوازی، ہاتھ بٹاتے بٹاتے مجلسی زندگی کی لطف اندوزی، انسانی تعلقات کی نشاط انگیزی اور سب سے مل کر سب سے الگ رہنے کی استطاعت بن گیا تھا۔ ہم نے زندگی کے اُتار و چڑھاؤ دیکھے تھے، فقر اور قناعت کے منازل سے گزرے تھے، بڑی بڑی محفلوں میں طرب و نشاط کے حیرت انگیز مناظر دیکھے تھے، مجلس آرائیاں کی تھیں اور عقل و فراست کی چاشنیاں چکھی تھیں، لوگوں کی زندگی کی تیاریاں دیکھی تھیں اور تیاریوں میں خوشی سے، اطمینان سے لوگوں کی دستگیری کی تھی، ان دستگیریوں سے اپنے آپ کو اُٹھتے ہوئے محسوس کیا تھا، دشمنیاں دیکھی تھیں اور ان کے بیچوں بیچ دوستوں اور شاگردوں کی وفاداریاں اور خیر خواہیاں محسوس کی تھیں، پسند کی تھیں، غرض بادو باراں اور رنگ ہائے بہاراں سے گذرتے ہوئے زندگی کے اَن مول خزانوں کے ہیرے موتے دیکھے

تھے۔ مگر تنہائیوں میں پھر خواہش کی تھی کہ زندگی کی چھپی دولت کا سراغ ڈھونڈھیں اور اُن دریچوں کو کھولیں جو ابھی نہیں کھلے تھے۔ کبھی کبھی ایسے لمحات میں اپنے انداز میں غالب کا

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

گنگناتے تھے اور لافانی آوازوں کو پکڑنے کی کوشش کرتے تھے۔ جب کشمیر میں سردیاں بڑھ جاتی تھیں اور جینے میں رکاوٹیں پیدا ہو جاتی تھیں تو پھر دلّی چلے جاتے۔ دلّی میں ہم نے اپنا فلیٹ خریدا تھا۔ اس میں بیٹھ کر اور دوستوں سے مِل مِل کر پھر جینے کی اور اور راہیں تلاشتے تھے۔

بائیس سال کے بعد ہم بچوں سے ملنے پھر امریکہ چلے گئے۔ شاہد نے پی، ایچ، ڈی مکمل کر لیا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ پہلے اُس کے پاس ٹھہریں پھر لالہ (اقبال) کے پاس آسٹن چلے جائیں۔ شاہد کے دوستوں کے ساتھ ملاقات ہوتی رہتی۔ ہماری خوشیاں ایسی ملاقاتوں سے بڑھ جاتیں۔ اُن کے ذہنی، فکری اور تہذیبی معیار دیکھ کر فرحت و انبساط میں اضافہ ہونا لازمی امر تھا۔ کچھ دوست اری زونا میں بھی رہتے تھے۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں بھیّا (شاہد) نے Masters in Fine Arts (M FA) پی ایچ ڈی کے بعد مکمل کر لیا تھا۔ ہمارے پرانے دوست آسٹن ٹیکساس سے بھی آئے۔ کچھ دو ہزار میل دور منسی سے بھی آتے تھے۔ وہ ہماری دعوتوں کا شاندار انتظام کرتے تھے۔ میں باتوں باتوں میں کہتا تھا کہ اگر کشمیر میں کوئی اس قسم کی لائبریری بنائے گا جیسی کہ ٹیکساس یونیورسٹی میں ہے یا اری زونا میں یا ایمہرسٹ میں ہے تو میں اس کے عوض اُسے جنت دونگا۔ اری زونا کی لائبریری میں بیٹھنے کیلئے شاندار کرسیاں ہیں، آرام دہ بیٹھنے کی جگہیں ہیں جن پر بیٹھ کر طلباء اور طالبات اچھی طرح کام کر سکتے ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ اُن کے پاس اُردو سیکشن بھی ہے جس میں مولانا شبلی کی سوانح سیرت النبی بھی ہے اور ہر قسم کی اُردو اور فارسی کتابیں۔ کسی نے ظریفانہ انداز میں کہا تھا کہ اگر ہم پی ایل ۴۸۰ کے پیسے نہیں دیں گے تو وہ ہماری

ساری کتابیں خریدیں گے۔

۱۹۹۵ء میں میری گھر والی نے صبح کے تین بجے بائیں طرف چہرے میں حرکت سی محسوس کی اور کہا کہ فالج گر گیا ہے۔ میں نے اتفاق نہیں کیا مگر ہم فوراً ہولی فیملی (Holy Family) ہسپتال میں داخل ہوئے۔ یہ ہسپتال ذاکر باغ کے بالکل قریب ہے۔ وہاں مہینہ ڈیڑھ مہینہ ضائع کیا پھر پتہ چلا کہ اُس کے دماغ میں سرطان ہے۔ لالہ دلی پہنچ گیا اور ہم اٹھتالیس گھنٹوں میں امریکہ پہنچ گئے۔ میری بھتیجی انجم کی وساطت سے ہم نے لینا کس ہل ہسپتال میں اُسے داخل کیا۔ ایک بڑے ہی مشہور جراح نے اُس کا آپریشن کرلیا مگر دو دفعہ۔ اُس نے مجھے کہا کہ آخری وقت تک اُسے درد و کرب سے چھٹکارا مل گیا۔ اس کے بعد پندرہ مہینے وہ زندہ رہی۔ اس دوران اس کی ساری اولاد امریکہ میں رہی۔ شاہد نے رخصت لے لی۔ لالہ شام کو ہفتے میں صرف دو لیکچر دیتا تھا۔ حنا پی ایچ ڈی کر رہی تھی۔ اُس نے بیس سال کے بعد پھر کام کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اُس نے یونیورسٹی آف میسوچسٹس (MASS, USA) میں پی ایچ ڈی کیا۔ اس زمانے میں ناصر صاحب کی بیٹیاں انجم اور شفو پاکستان سے آیا کرتی تھیں۔ اُنہی دنوں میری چھوٹی بیٹی سمیتا سمتھ کالج سے Yale گئی تھی۔ اُس نے کمپیوٹر سائنس، لاجک اور ریاضیات کو چھوڑ دیا تھا اور ہسٹری اختیار کی تھی۔ آسٹن میں ایک پروفیسر تھا جس نے اُسے تاریخ لینے کا مشورہ دیا تھا۔ اُن دنوں وہ آسٹن میں ایم اے کر رہی تھی۔ اُس کا نام فلپارٹ (Philpot) تھا۔ شاید اُس کا جھکاؤ بائیں بازو کی طرف تھا۔ سمیتا اُس سے اتنی متاثر ہوگئی تھی کہ چوتھے سال اُس نے ہسٹری اختیار کی۔ جب اقبال ٹیکساس سے میسوچسائٹس گیا تو اُس نے سمتھ کالج میں داخلہ لیا کیونکہ وہ اقبال کے ساتھ گئی تھی۔ سمتھ کالج اچھا کالج ہے جہاں اُسے ایک زائد سال گذارنا پڑا۔

یونیورسٹی میں پروفیسری کے دوران جو واقعات پیش آئے اُن میں سب سے گھناونا واقعہ میرے دوسرے بیٹے آغا اقبال کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ تھا۔ اقبال امرسنگھ کالج سرینگر

میں پڑھتا تھا۔ اُسے انٹر کالج ڈبیٹ (Inter College Debate) کیلئے چُنا گیا تھا۔ بدقسمتی سے مباحثے کا مقام گورنمنٹ کالج فار وومن (Govt College for Women) مولانا آزاد روڈ مقرر کر دیا گیا تھا۔ جب اُس کا نام مباحثے کے دوران پڑھا گیا اور اس کی باری آئی تو زنانہ کالج کی پرنسپل صاحبہ نے اُسے بولنے نہ دیا یہ کہتے ہوئے کہ کالجوں کے اس مباحثے میں ایس، پی، کالج شامل ہے مگر امر سنگھ کالج نہیں۔ بچے یوں بھی حساس ہوتے ہیں مگر اقبال بہت حساس ہے۔ اس لئے وہ پرنسپل صاحبہ کی اس مداخلت سے بہت مجروح ہوا۔ اُس کی چچیری بہن سیما بھی ہال میں موجود تھی یہ دیکھنے کیلئے کہ اُس کا بھائی کیا کرتب دکھاتا ہے۔ مگر اقبال کو جب بولنے کی اجازت ہی نہ دی گئی تو سیما بھی جراحت سے بچ نہ سکی۔ اقبال پڑھ لکھ کر مباحثے میں شرکت کرنے کیلئے گیا تھا اور اپنے کالج کی طرف سے۔ اُسے یقین تھا کہ وہ امتیاز حاصل کریگا مگر میرے کانٹے اس کے پاؤں میں بھی چبھ گئے۔ اقبال کا پتہ یہاں ہی کاٹا نہ گیا بلکہ یونیورسٹی میں بھی اُسے وائس چانسلر صاحب نے داخلہ نہ دیا حالانکہ بی ایس سی میں اُسے فسٹ کلاس ملا تھا۔ اُسے ریاضی میں لگا دیا گیا۔ دو سال اس کے شعبے کا امتحان ہی نہ ہوا۔ وہ بھاگ گیا اور آئی، آئی، ٹی میں داخلہ لیا۔ یہ تو ہوا مگر جذباتی دباؤ سے اور کھچاؤ کی وجہ سے اُس کی انتڑیوں میں وہ بیماری پیدا ہو گئی جو کبھی جاتی نہیں۔ اُس کا کولائٹس ہو گیا اور خون بہنے لگا۔ Ulcerative Colitis کی وجہ سے تین سال میں اس کا وزن پچتالیس پونڈ گر گیا۔ ڈاکٹر سید ظہور نے اُس کے لئے وہ دوائی تجویز کی جو سوئزر لینڈ Switzerland سے منگوانی پڑتی تھی۔ اقبال گوشت کے ٹکڑے اور روٹی کھا سکتا تھا۔ میوہ نہیں، دودھ نہیں، سبزی نہیں، مصالحہ نہیں۔ اِدھر کشمیر یونیورسٹی میں ریاضی کے طلباء امتحانات ملتوی ہو ہو کے کہیں چار سال کے بعد فارغ ہوئے۔ اُدھر اقبال نے وائس پریذیڈنٹ بال سٹیٹ کا وظیفہ پالیا اور وہ کشمیر سے ترکِ وطن کر کے امریکہ چلا گیا۔ وہ ابھی بھی امریکہ میں ہے اور آپریشنز ریسرچ

(Operations Research) کا پروفیسر۔ اقبال کے ساتھ ناروا سلوک پر وومنز کالج کی ایک انگریزی لیکچرر نے ناراضگی کے کلمات بولے تھے۔ اُسے اس گناہ کی پاداش میں گورنمنٹ کالج نواکدل بھیج دیا گیا تھا۔

اس سے پہلے جب کشمیر یونیورسٹی کا ایک حصہ جموں نہیں گیا تھا، میرے بڑے بیٹے آغا شاہد مرحوم کے ساتھ بھی ایسا ہی برتاؤ کیا گیا تھا۔ وہ بی اے میں فسٹ کلاس فسٹ آیا تھا۔ اُس نے ریاضی اور دیگر مضامین جن میں نمبرات لینے آسان ہوتے ہیں پیچھے چھوڑ دیئے تھے اور انگریزی میں اُن سے بھی زیادہ نمبرات لئے تھے۔ اُن دنوں ایسے طالب علموں کا نام ریڈیو پر نشر کیا جاتا تھا۔ مگر شاہد کے معاملے میں صاحبانِ اقتدار نے مسٹر چاولا، ڈائریکٹر ریڈیو کشمیر سرینگر کو بتایا تھا کہ شاہد کا نام نشر نہ کیا جائے۔ شاہد دلّی بھاگ گیا اور اس کے بعد امریکہ جہاں اُس نے خاصا نام پایا۔

ادھر میرے بال بچوں پر یہ بیت رہی تھی، اُدھر مجھ سے رہا نہ گیا اور میں صادق صاحب کے پاس چلا گیا۔ اُسے خاندانی قضیے کی روئیداد سنائی۔ حق تو یہ ہے کہ وہ بہت رنجیدہ ہو گئے جس کی تصدیق بعد میں دورانِ گفتگو ساجدہ ضمیر احمد نے کی۔

۱۹۹۵ء میں میری گھر والی بیمار ہو گئی۔ ہمارے بڑھاپے کے وہ دن شروع ہو گئے جن میں شادی اور مسرت کے ساتھ غم و آلام اور آرام سے زیادہ بے آرامیاں دیکھنی اور سہنی پڑتی ہیں۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم مزید علاج کیلئے امریکہ چلے جائیں گے۔ میری بڑی بیٹی بیس سال کے بعد پھر علمی مشاغل کے ساتھ باضابطہ جڑ گئی تھی اور وہ پی ایچ ڈی کر رہی تھی۔ چھوٹی بیٹی Yale یونیورسٹی میں تاریخ میں تحقیقی کام کر رہی تھی۔ بڑا بیٹا شاہد تقریباً ہر سال کشمیر آتا تھا مگر اقبال کام میں مصروف ہونے کی وجہ سے امریکہ میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اسی دوران شاہد کا سب سے زیادہ تخلیقی دور کشمیر کے سیاسی تصادم سے شروع ہوا۔ یعنی ۸۸۔۱۹۸۹ء کے پُرتشدد فساد سے۔ میں جموں میں مقیم تھا اور وہ ۱۹۹۰ء میں میری رائے

لئے بغیر سرینگر آن پہنچا۔ آغا جلال کی دختر مینا آئی تھی اور شاہد اُسی کے ساتھ سرینگر آیا تھا۔ پھر کچھ دن کے بعد واپس آ کر اپنی ماں کو بھی سرینگر لے آیا تھا۔ مجھے دکھائی دیتا ہے کہ اس طرح شاہد کی شاعرانہ پرواز کو ایک اور تحریک ملی تھی۔ اس سے پہلے شاہد کی شاعرانہ طبیعت جاگ اُٹھی تھی بیگم اختر کی فنّی صلاحیتوں سے۔ جب وہ ہندو کالج دہلی میں پڑھتا پڑھاتا تھا تو وہ اور اُس کا دوست سلیم بیگم اختر سے دہلی میں یا دور کہیں فرصت کے ایام میں ملتے تھے۔ میری دانست میں اُس کی گہری دل چسپی موسیقی اور شعر میں ساتویں جماعت سے شروع ہوگئی تھی جب اُس نے ان دو فنّوں کی ذہنی و قلبی تحسین شروع کی۔ اُس کا ان دونوں فنّوں کے ساتھ راغب ہونا یقیناً دلّی کے تمدّن کی دین ہے۔ وہ چھٹیوں میں اپنی والدہ کے ساتھ بیٹھتا اور اُس کی زبانی اُردو شعر سنتا کیوں کہ وہ اُردو پڑھ نہیں سکتا تھا۔ یہ نہیں کہ شعر کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا تھا مگر اب کے وہ غزل انگریزی شاعری میں فارم کی حیثیت سے کھپانا چاہتا تھا۔ بقول شاہد بیگم اختر نے اس ذوق و شوق کو آگ لگادی تھی۔ اُس نے اُردو شعر کی زبان اور اس میں جمی ہوئی اور کھلی ہوئی ادبی مسرتوں کو سینے سے لگائے فیض احمد فیض کا رُخ کیا جنہیں وہ مغرب لے جانا چاہتے تھے۔ اُس نے کافی ریاض کیا کہ فیض کی نظموں کا رقص و نغمہ، جذبہ و احساس فنی شگفتگیوں کے ساتھ انگریزی میں ڈھل جائے اور بالآخر چھ سات سال کی محنت شاقہ کے بعد یہ کتاب دیر یبلز سلوویٹ (The Rebel's Silohuette) کے نام سے شائع ہوئی پھر دو سال کے بعد آکسفورڈ والوں نے چھاپ دی۔ گو کہ یہ کہانی لمبی ہے مگر شاہد نے مغرب کو للکارا اور غزل کے سارے آداب فارم کی حیثیت سے برقرار رکھنے کی کوشش کی اور انگریزی میں غزل لکھی۔ گو کہ یہ اُردو غزل کا عین غین والا معاملہ نہیں مگر اُس نے نیا کام کر دکھایا۔ پھر امریکہ کے ۴۰ سے ۵۰ شاعر جمع ہو گئے جنہوں نے ردیف قافیہ اور دیگر جزوں کی پابندیوں کے ساتھ غزل لکھی اور شاہد نے ان کا مجموعہ بحیثیت ایڈیٹر تیار کیا۔ سارا سلیری (Sara Suleri) جو ئیل یونیورسٹی میں انگریزی

پڑھاتی ہے، نے بھی غزل لکھی اور اس مجموعے میں شامل ہوئی۔ اس مجموعے کا نام ''ثقافتی رنگارنگی'' (Ravishing Disunities) ہے۔ سارا نے اس کا Epilogue اور شاہد نے Prologue لکھا ہے۔ سارا نے اپنی غزل میں شاہد کو لایا۔ بہت امریکیوں نے سمجھ لیا کہ شاہد کا نیا کام کیا معنی رکھتا ہے اور اُنہوں نے مان لیا کہ یہ کام شاہد سے ہی شروع ہوتا ہے۔ مگر شاہد بلندی پر اس لئے پہنچا کہ کشمیر ایک نہایت ہی کٹھن دور سے گزر رہا تھا۔ ایک دو غزلیں میں نے بھی پڑھیں اور میں حیران ہوا کہ شاہد وقت کے دیوتاؤں کی شقاوت کس طرح استعمال کر رہا ہے اور اُن رفیقوں کو اُلفت کی لے میں یاد کر رہا ہے جو اس کی اپنی سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہاں کشمیر میں اُن کی غزلوں کو سراہا گیا۔ مولوی عبدالحی یہاں کا اُستاد ہے جو میرا ایک شاگرد رہا ہے اور اس وقت رضوان میموریل بی ایڈ کالج فاروومن چلا رہا ہے مگر اس کا فرزند اپنے والدین کو اطلاع دئے بغیر سرحد پار سے بندوق وغیرہ حاصل کر کے واپس آ رہا تھا کہ اپنے چھ ساتھیوں کے ہمراہ جام شہادت پی گیا۔ اُن کو گریز کے قریب برفانی تودوں کے نیچے اسی طرح دفن کر دیا گیا کیونکہ جگ موہن نے اُن کی لاشیں یہاں والدین کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ شاہد نے I see Kashmir from Delhi at mid-night لکھی اور اسے The Country without A Post Office میں پہلے جگہ دی۔ اس کتاب نے گوگن ہائیم ایوارڈ لے لیا۔ اس کی بہت ساری نظمیں رسالوں میں یہاں وہاں اور ہر جگہ چھپ گئیں۔ جب کبھی شاہد آتا تو دلّی میں اُس سے انٹرویوز لئے جاتے۔ ان نظموں میں کشمیریوں کے گہرے جذبات اور آرزوؤں کی ترجمانی بھی کی گئی ہے اور خونین ماتم کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ پس شاہد کی انگریزی شاعری سے انگریزی بولنے والے لوگ، خاص کر مغرب میں، کشمیر کے حالات سے واقف ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ امریکہ میں رہنے والے سینکڑوں کشمیری گھرانوں میں بھی شاہد کی شاعری دل چسپی اور شوق کا موجب بنی۔ یہ لوگ

انجینئر ہیں، ڈاکٹر اور تاجر ہیں اور کبھی کسی گھر میں مجلس آرائی کرتے ہیں۔ ایسی ہی مجلسوں میں جب شاہد نے اپنی نظمیں سنائیں تو لوگوں کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ مگر شاہد کی نظموں میں سطحی جذباتیت بالکل نہیں۔ میں شعر فہم نہیں، خاص کر جدید شاعری سے میری شناسائی بہت ہی کم ہے۔ مگر The Country without A Post Office میں کچھ نظمیں جو کشمیر پر لکھی گئی ہیں، میں نے پڑھیں تو مجھے دکھائی دیا کہ اُس کی شاعری میں بہت جان ہے۔ پچھلے تین چار سال سے جو پڑھنے اور سمجھنے والے لوگ کشمیر میں اُبھرے اُن میں شاہد کے شعروں نے گہرائی فکر اور وسعتِ قلب پیدا کیا ہے۔ شاہد نے خود اپنے ہاتھ سے دستخط کر کے بہت سوں کو اپنی کتابیں دیں۔ بلراج پوری صاحب پہلے شخص ہیں جنہوں نے مجھے کہا کہ شاہد نے کشمیر کی شخصیت کو عالم آشکارا کیا۔ مجھے اس کے الفاظ یاد نہیں مگر ان کا مطلب یہی ہے۔ پوری نے یہ بھی کہا کہ اس نے نہایت ہی شائستہ انداز اختیار کیا ہے کشمیریوں کے مافی الضمیر کو پیش کرنے کا۔ یہ سچ ہے کیونکہ جب جنگ جوؤں نے پانچ غیر ملکیوں کو مارا کہ جن میں ناروے کا آسٹرو بھی تھا تو شاہد نے ایک نہایت ہی اچھی نظم لکھی جو بعد میں ناروے کے سفارت خانے نے آسٹرو کے والدین کو بھیج دی۔ مجھے معلوم نہیں لفظ انجینئر شاعری میں کیسے آیا۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ لفظ شعر کے شایانِ شان ہے بھی یا نہیں مگر سٹالن نے شاعروں کو انسانی روح کا انجینئر بتایا (Engineers of Human Soul)۔ تاہم اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو شاعر پیغمبرانہ کام کرتا ہے۔ شاہد کی کتاب The Country without A Post Office اس کی ماں کی وفات کے بعد چھپ گئی۔ دسمبر ۱۹۹۵ء میں اس کی ماں کا آپریشن لینا کس ہل ہسپتال میں دو دفعہ ہوا۔ چاروں اولاد اُس کے اردگرد جمع تھے اور لوگ یہ دیکھ کر حیران ہو رہے تھے کہ شاہد کا اندروں اُبل رہا ہے۔ اس کی ماں پندرہ مہینے علیل رہی مگر اس علالت کے دوران شاہد کے تصورات اور تخیلات میں زبردست طوفان برپا ہوا۔ اگرچہ وہ بس پانچ دن کیلئے اپنی شاعری

سنانے کیلئے ویسٹ کوسٹ West Cost چلا گیا۔ عام طور پر وہ اس کی دو بہنیں اور بھائی اقبال ماں کے ساتھ اُس کی تیمارداری کرتے رہے۔ شاہد کی شاعری مکمل طور پر رُک گئی۔ اس دوران دوستوں نے بھی کافی محبت اور خلوص کا اظہار کیا، خاص کر اقبال احمد نے جو بنیادی طور بہار کا رہنے والا تھا مگر صحافت سے گزرتے ہوئے سیاست کے میدان طے کر رہا تھا۔ آخر پر قریباً ایک دو سال ہیمشیر کالج میں پڑھاتا رہا۔ ہم ہفتے میں کم سے کم دو دفعہ ملتے تھے۔ اُن کی مہربانیاں بیشک ناقابل فراموش ہیں۔ پندرہ مہینے گزرنے کے بعد شاہد نے پھر اپنی تخلیق شروع کی جو اُس کی کتاب Rooms are never finished کی صورت اختیار کر گئی۔ اس میں شاہد نے پرانے اور نئے کو ملانے کی کوشش کی۔ جہاں ماں کی موت شاہد کے دِل پر گہرے صدمے کے رنگ و روپ دکھا رہی ہے وہاں کربلا کا کرب و بلا شاہد اور شاہد کے سارے گھرانے کو امریکہ سے لیکر کشمیر تک ماتم کرا رہا ہے۔ یہ کربلا نہیں مگر شاہد کی غربت (وطن سے دوری) اور ماں کی جدائی کا صدمہ ہے جو کئی مراحل سے گذر رہا ہے۔ اُن مراحل سے شاہد کے سارے گھر والوں کی داستانِ الم واضح ہوتی ہے۔ اور بھی بہت ساری باتیں ہیں جو شاہد نے گویا کوزے میں سمندر کی طرح بند کی ہیں۔ شعر میں ایسا ممکن ہوتا ہے۔ اپنا بچپن، اپنی زندگی کی یادیں، اپنی ماں کا خلوص بھرا پیار، اپنا عزیز وطن کشمیر اور کشمیر کے ساتھ ان ساری باتوں کا جوڑ کتنا دل چسپ لگتا ہے اور الم افزا مناظر پیش کرتا ہے۔ غم واندوہ کا سیلاب اتنا تیز بہہ رہا ہے کہ ماں کی محبت کے سوا سب چیزوں کو اپنے ساتھ بہا رہا ہے۔ مگر ماں کی موت، کربلا کی ہر دم جوان داستان، کشمیر کے ساتھ لگاؤ اور کشمیر کے ڈراونے سیاسی منظر اور چیزوں کو اپنے ساتھ ملا رہا ہے۔ یعنی اندلسیوں کی غریب الوطنی وغیرہ۔ شاہد محمود درویش کی نظمیں اپنی زبان پر لاتا ہے اس طرح کربلا، کشمیر، ماں کا صدمہ اور بہت چیزیں اکٹھے ملا رہا ہے۔ محمود درویش کی نظمیں پہلے بھی عربی سے انگریزی میں لائی گئی تھیں مگر شاہد نے ان کو اپنا ایک نیا انداز دیا اور اپنے درد کے راز دانوں کی فہرست بڑھائی۔ وہ انجمن میں

اب تنہا نہیں۔ یہاں اس کے اور بھی رازداں ہیں۔ جیسا کہ آخر پر دکھائی دیتا ہے۔ جیمز میرل اور اقبال احمد بھی ہیں۔ امیتاب گھوش نے بیس صفحے اسی پر نذر کئے اور امریکی شاعرا ینتھی ہیکٹ نے بھی اس کو بہت سراہا۔ مجھے لگتا ہے کہ شاہد اپنے آخری ایام میں شاعری کے اُن تمام فارمز کے ساتھ تجربے کر رہا تھا جو دُنیا کے شعری ادب میں موجود ہیں۔ ان میں کنزونی بھی شامل ہے۔ After the August Wedding in Lahore Pakistan پہلی کنزونی ہے جو شاہد نے شفق کی بیٹی کی شادی پر لکھی۔ ہم سب لوگ ۱۹۴۷ء کے بعد لاہور میں اس شادی پر ملے۔ چار پیڑیاں! میری والدہ واکر پر چل رہی تھی کیونکہ اُس کی ہڈی گرنے سے ٹوٹ گئی تھی۔ مگر سفید سفید اُجلے اُجلے بالوں والی خاتون کا واکر پر آنا کتنا اچھا لگا تھا۔ شفق میری بھتیجی ہے۔ شاہد نے یہ نظم انتھنی ہیکٹ کو بھیجی۔ ہیکٹ نے "Interviews in London to Philip Hoy" کتاب میں کنزونی کا ذکر کیا گیا ہے۔ اُس نے بھی دشواری سے اس فارم کو استعمال کیا۔ ہیکٹ کہتا ہے کہ کنزونی کا باوا آدم اٹلی کا شہرۂ آفاق شاعر دانتے ہے۔ دانتے نے کہا ''شکر خدا کا میں نے کنزونی لکھی مگر اب نہیں لکھوں گا۔ میں نے اس نظم کو لکھنے اور یہ فارم برتنے کیلئے چار لوہے کی زنجیروں سے کام لیا۔'' صدیوں پھر کنزونی کو کسی نے نہیں برتا۔ پھر عظیم انگریزی شاعر Auden نے کنزونی لکھی۔ اس کے بعد تین یا چار شاعروں نے بھی کنزونی میں طبع آزمائی کی اور انتھنی ہیکٹ نے۔ اب یہ مسئلہ بڑا پیچیدہ ہے کیونکہ ہمارے پاس کوئی واضح تعریف (Definition) نہیں جس سے کنزونی بحیثیت ایک شعری صنف کے لوگوں کی سمجھ میں آسکے۔ انتھنی نے اپنی کتاب میں اعتراف کیا ہے کہ آغا شاہد کی کنزونی اچھی ہے۔ ماں کے مرنے کے بعد آغا شاہد نے ایک اور بہت ہی اچھی کنزونی لکھی جو بہت سوں کی نظر میں اس کی بہترین نظم ہے۔ اس کا عنوان ہے لینا کس ہل۔ اس مدت میں آغا شاہد بہت تیز تیز لکھ رہا تھا۔ نہ جانے کیوں۔ کیا اُس کا دل محسوس کر رہا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے اور اُس کی زندگی کے دن پورے ہو گئے ہیں۔ اس بارے

میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ایک بات واضح ہے کہ اس کی سالٹ لیک یونیورسٹی میں ریذیڈنٹ پوئٹ کی حیثیت سے تقرری ہوئی تھی۔ اُنہوں نے اُسے بہت مراعات دیکر اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ شاہد نے کہا ''مجھے کشمیر جانا ہے۔'' اُنہوں نے کہا صرف ساڑھے چار مہینے ہمارے ساتھ کام کرو۔ ہم مکمل تنخواہ دیں گے۔ مجھ سے پوچھ کر وہ وہاں چلا گیا۔ پھر Rooms are never finished جلدی جلدی آنکلی۔ شاہد کی پہلی کتابیں آہستہ آہستہ نکل آئیں۔ انتھنی نے کہا شاہد نے جلدی جلدی دو کنزونی لکھی ہیں اس لئے اس کا نام Guiness Book of Records میں آنا چاہیے۔ اُس کے بعد اُس نے ایک اور کنزونی لکھی۔ اُن دنوں اُس کی بینائی جواب دے رہی تھی اُس کی ایک دوست پیٹریشا اُس سے اِملا لیکر وہ نظم لکھتی تھی۔ مئی اپریل میں اُس نے تیسری کنزونی لکھ ڈالی۔ اس کا وزن اصغر گونڈوی سے لیا گیا تھا جو عظیم غزل گو شاعر جگر مرادآبادی کا اُستاد تھا۔ ''پھر مجھے پردہ بنا کر مجھ سے پردہ کیجئے'' سے ''پردہ'' لیا گیا اور انگریزی میں اس نے Veil کی صورت اختیار کی۔ انتھنی ہیکٹ نے کہا کہ انگریزی میں شاہد کی بے مثال آواز ہے۔ کوئی ایسا نہیں کر سکتا۔ اُس نے شاید یہ بھی کہا ہے کہ شاہد نے تین تہذیبوں کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔ قدیم ہندوستانی تہذیب، اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب۔ شاہد نے خود بھی اس بات کا اقرار کیا ہے۔ اُس کی شاعری میں جگہ جگہ ہم پیکروں کی رنگارنگی دیکھتے ہیں۔ کرشن مہاراج، بنسی کی بانسری، جمنا اور جمنا کی لہریں، مون سون، جامع مسجد کے قصائی، یہودی، مسلمان، عیسائی اور اُن کے تجربوں کی تمدنی چاشنی۔ ایک طرف اس کے دماغ کے جراح اور دوسری طرف امیتاب گھوش نے کہا کہ گو کہ اس کے سائنسی شواہد نہیں مگر لگتا ہے شاہد نے اپنی ماں کا دماغی سرطان خود اپنے دماغ میں لایا تا کہ ایک تو اس کے درد کا احساس پیدا کرے اور دوسرے اس کے ساتھ ہمیشہ کیلئے جا ملے۔ اُسے اپنی ماں کے ساتھ بے حد اور گہری محبت تھی۔ جب اُسے سرطان نے پورا دبوچ لیا تو وہ دوستوں اور رفیقوں کو دلاسا دینے لگا۔ وہ ہنستا بھی تھا اور مزاج پرسی کرتے

کرتے کسی لفظ پر بل دیتا تھا جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا ذہن سرطان سے گویا پھیل گیا تھا اور نہ جانے کس وسعت سے کتنی باتوں کو اپنی گرفت میں لیتا تھا۔ نثر میں بھی شاعری کرتا تھا اور لفظ لفظ سے معنی کی وسعت پیدا کرتا تھا۔ وہ دوستوں کے ساتھ رابطہ رکھے ہوئے تھا۔ نہ جانے کہاں کہاں سے ٹیلی فون آتے تھے اور وہ اُن کے جوابات دیتا تھا۔ لمبی مسافت طے کر کے جو دوست اُس سے ملنے آتے تھے، اُن سے خوشدلی کے ساتھ ملتا تھا۔ کھاتا پیتا تھا اور مجلس آرائی کرتا تھا۔ کوئی کہتا نئی دوائی آئی ہے دماغی سرطان کیلئے۔ شاہد کہتا مت بھیج دیجئے کیونکہ میں کھا رہا ہوں یہی دوائی وغیرہ۔ لگتا ہے کہ حکیم نطشے نے بالکل صحیح کہا ہے۔ دکھ درد اُس تیز رفتار سواری کا نام ہے جو ہمیں تکمیل تک لے سکتی ہے۔ دُکھ درد اور تکمیل زندگی کے ہر شعبے پر صادق آتا ہے۔ نطشے نے یہ بات شاید Thus Spake Zarasthustra میں کہی۔ میں جب چاروں اور دیکھتا ہوں اور ایسے لوگوں کو جنہوں نے آرام و آسائش کی زندگی گزاری ہے یا گزار رہے ہیں تو مجھے ان کی زندگی میں کوئی کسک نظر نہیں آتی۔ شاہد کا معاملہ کچھ اور ہی معاملہ ہے۔ پہلے ماں کا درد اور پھر اس کے ساتھ کشمیر کا درد۔ جب یہ درد اُس کے اپنے دل کے درد کے ساتھ جا ملے تو اس کی خوبصورت اور وہبی شاعری پیدا ہوگئی جو خود بھی رواں دواں اور ہر دم جواں ہے اور شاہد کو بھی جاوداں بنا کے چھوڑتی ہے۔ یہ کامرانی اور تکمیلی مسرت روح کی نشاط انگیز بالیدگی ہے۔ اُس نے اپنی بہنوں اور اپنے بھائی کو کہا کہ اُس کا کام ہوگیا یعنی اس کا فرض پورا ہوگیا۔ وفات کے بعد اُس کی ایک اور کتاب ''مجھے آج شب اسماعیل کہہ کے پکاریئے'' شائع ہوئی۔ رسم چہارم پر سرینگر میں سینکڑوں لوگ جمع ہوگئے اور اُسے خراج عقیدت پیش کی۔ اخبارات میں اور ریڈیو پر بھی شاہد کا سوگ منایا گیا۔ زمستانی ہواؤں نے گرمئی دل پر منفی اثر ڈالنا بھول ڈالا، لوگوں نے مسجدوں میں دعائیں دیں، بازاروں میں جھنڈیاں لہرائیں اور جوش و خروش کے ساتھ کشمیر کے سپوت شاہد کی فاتحہ خوانی کی۔ میں نے سُنا کہ چھوٹے چھوٹے بچے بھی اُن کا تذکرہ

کرنے لگے، اُن کو نہ جانتے ہوئے اور نہ سمجھتے ہوئے بھی۔ ''آغا شاہد علی نے امریکہ میں بھی کشمیریوں کا درد محسوس کیا اور کشمیریوں کو بھول نہ ڈالا'' جیسے الفاظ بہت سوں کی زبان سے نکلے۔ حریت کے سارے لیڈروں نے بھی خراج عقیدت پیش کیا۔ پروفیسر عبدالغنی، عبدالغنی لون، مولانا عباس انصاری، نعیم خان صاحب، سبوں نے باری باری اپنے بھائی کو اپنی اپنی زبان میں الوداع کہا۔ یاسین ملک تو کئی روز تک ماتم کرتے رہے مگر شاہد کا تعارف کراتے رہے کہ کشمیر کے ساتھ اُن کا والہانہ لگاؤ کتنا گہرا اور شدید تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ بلراج پوری صاحب سرینگر کیسے آئے تھے کہ انہوں نے ماتم میں شرکت کی۔ اخبارات میں گریٹر کشمیر کا رول سب سے زیادہ قابلِ ستائش تھا۔ اُس نے تو خصوصی نمبر شائع کئے۔

شاہد کی علالت فروری ۲۰۰۰ء میں شروع ہوئی۔ میں اکیلا اُن کے ساتھ تھا جب وہ غسل خانے میں گر گیا۔ نیویارک یونیورسٹی نے اُسے Visiting Professor بنایا تھا۔ ہمیں دوپہر کے کھانے پر جانا تھا۔ جب وہ گر گیا تو چیخ نکل پڑی۔ انگریزی یا اُردو یا کشمیری میں میں اُس چیخ کو بیانیہ روپ نہیں دے سکتا۔ مگر مجھے ایسا لگا کہ کوئی چٹان گر گئی۔ میں دوڑ کے غسل خانے میں گیا۔ وہ فرش پر پڑا ہوا تھا اور جھاگ اُس کے منہ سے نکل رہی تھی۔ گو کہ خون نہیں بہہ رہا تھا مگر وہ بالکل بے ہوش تھا۔ میں نے ٹیلی فون اُٹھایا اور چند منٹوں کے بعد ہسپتال کی گاڑی آئی۔ مگر تب تک اُسے ہوش آیا تھا۔ جب اُس پر دورہ پڑا تھا تو اُس نے اپنی زبان کاٹ لی تھی اور بُری طرح۔ اس لئے چیخ ماری تھی۔ اس سے پہلے شام کو ہم ایک پروفیسر اڈمنٹ کے گھر پر نسٹن گئے تھے۔ نیویارک میں اُس کا مستقل گھر تھا۔ وہ پرنسٹن دو دفعہ آتا تھا تو پھر نیویارک جاتا تھا۔ وائٹ ناول کا ماہر تھا اور نوجوانوں کو ناول پڑھاتا تھا، سکھاتا تھا۔ خیر شاہد کی کمر بھی سالم تھی اور اس کی گردن بھی بے ضرر۔ ہم نے اُسے ہسپتال پہنچایا جہاں میری بھتیجی ملی جو خود بھی ڈاکٹر ہے مگر وہاں سے ہم نے اُسے نیویارک یونیورسٹی ہسپتال پہنچایا۔ خیر فروری ۲۰۰۰ء سے دسمبر ۲۰۰۱ء تک اُس نے غزل مکمل کی اور ''کمرے کبھی مکمل نہیں ہوتے''

کی آخری نظم لکھی۔ یہ نظم موت کے ساتھ ہم آغوشی کے مترادف ہے۔

''کمرے کبھی مکمل نہیں ہوتے'' نیشنل بک ایوارڈ کیلئے منتخب ہوئی۔ ایوارڈ کیلئے پانچ آدمی چنے گئے تھے مگر ایوارڈ ایک بزرگ شاعر کو ملا۔ اقبال احمد نے نظم پڑھی، میڈل وغیرہ دئے گئے۔ شاہد کی شاعری خواب جیسی ہے۔ امریکہ اور کشمیر میں جب شاہد کا سوگ منایا گیا تو کہا گیا کہ شاہد اپنی شاعری میں زندہ ہے اور یہ بات بہت ہی تخلیقی اہمیت رکھتی ہے۔ جموں میں ایک کشمیری پنڈت خاتون جو جرنلسٹ ہے، نے بھی شاہد کو سراہا اور یہاں اطہر ضیا ایک لڑکی میرے پاس آئی اور کہا کہ اُسے افسوس ہے کہ وہ شاہد سے نہ مل سکی۔ اطہر نے کے اے ایس پالیا ہے۔ اُس نے جو نظم شاہد پر لکھی وہ بہت اچھی طرح لکھی گئی ہے اور شعری اعتبار سے خوب تراشی گئی ہے۔ شاہد کی کتابیں ہر قسم کے لوگ مانگتے ہیں اور شوق سے پڑھتے ہیں۔ پچھلے سال ہم نے جو سالانہ میٹنگ کی اُس میں ریاضی کے ایک اُستاد نے ایوارڈ حاصل کیا۔ جب The Country without A Post Office شائع ہوئی تو فاروق کاٹھواری صاحب نے ایک سو کتابیں خریدیں۔ اُس نے یہ کتابیں کشمیریوں کو بھیج دیں، کشمیری جو امریکہ میں مقیم ہیں۔ ان میں کچھ گھرانے کشمیری پنڈتوں کے بھی ہیں۔ ایک گھرانہ بل کاک دھر کا ہے اور کرنل دھر اور اُس کا بیٹا وسنت دھر اس کے ساتھ وابستہ ہے۔ کرنل دھر نے ایک عیسائی خاتون کے ساتھ شادی کی ہے۔ اُس نے لالہ سے کہا کہ وہ (Rooms are never finished) کی ایک سو کاپیاں خریدنا چاہتا ہے۔ اُس نے وہ کتابیں کرسمس کے موقعے پر نذرانہ کے طور پر دیدیں۔ وسنت لالہ کے گھر کے پاس ہی رہتے ہیں۔ اُس نے لالہ کو شام کے کھانے پر بلایا اور سلمان حیدر بھی وہاں موجود تھے۔ سلمان نے کہا کہ اُس نے The Country without A Post Office شکاگو کے کسی کتاب گھر میں دیکھی۔ اُس نے کہا کہ اُس نے وہ کتاب خریدی۔ پڑھ کر اُس کے دل پر گہرا اثر پڑا۔ وسنت دھر کی بیوی گئی اور اُس نے ''کمرے کبھی مکمل نہیں ہوتے'' لائی۔ پھر وہ

کتاب بھی سلمان حیدر کو تحفے کے طور پر دی۔ سلمان حیدر نے مجھے مجبور کیا کہ میں اُس کتاب پر کچھ لکھوں۔ ضمناً یہ بات قابل ذکر ہے کہ کوئی اُن سب باتوں کو جمع کر رہا ہے جو شاہد نے اپنی کتابوں کے نسخوں پر لکھی ہیں۔

شاہد نے مجھ سے مشورہ کیا کہ وہ نیویارک یونیورسٹی جائیں یا نہ جائیں۔ میں نے بلا تامّل وہاں کام شروع کرنے میں صلاح دی۔ ہم دونوں وہاں چلے۔ پروفیسر، شعراء اور دیگر قسم کے تخلیق کار وہاں موجود، تیرہ دن تک لوگ ہمیں شام کے کھانے پر بُلاتے رہے۔ پرنسٹن کے اڈمنڈ وائٹ (Edmund White) عظیم ناولسٹ ہیں اور اس قسم کے دوسرے لوگ وہاں تھے جن کے ساتھ شاہد جڑ گیا۔ میں اچھی طرح محسوس کر رہا تھا کہ شاہد کا حلقۂ احباب کتنا بڑھ گیا تھا اور وہ کتنی دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اور پھر قدرت کا فیصلہ کہ وہ غسل خانے میں گر گیا اور اُسی کے ساتھ دھیرے دھیرے اس کا سفرِ حیات مکمل! اُس کے دوست جگہ جگہ سے علالت کے دوران اُس کے ساتھ بات کرتے تھے اور وہ ٹیلی فون پر اُن کے ساتھ کھل کر قہقہے مار کر باتیں کرتا تھا گویا کہ کوئی معاملہ ہی نہیں۔ جب ہم نے اُسے دفن کیا اور گھر واپس آئے تو لالہ کے مکان پر کم سے کم دو سو لوگ جمع ہو گئے، اچھے لوگ، پڑھے لکھے عالم و فاضل لوگ! نیویارک یونیورسٹی کا پروفیسر آف پوئٹری بھی موجود، غیر معمولی شخصیت کا مالک! میں نے اُسے کہا کہ یہ لوگ ہوائی سفر کر کے آئے ہیں، کچھ تو چھ سو میل موٹر میں سفر کرتے کرتے پہنچ گئے ہیں۔ اُس نے کہا کہ شاہد کو ماں سے اُتنی محبت، اتنا پیار ملا ہے کہ باید و شاید۔ اُسے اپنی ماں[1] سے پہلے دو تین سال میں جتنا پیار ملا وہ اب عام ہو رہا ہے اس لئے کہ شاہد نے وہ دوسروں میں بانٹ دیا ہے اور شاہد علالت میں کبھی بیٹھا نہیں۔ وہ لکھتا رہا اور اپنا دل شعر کے قالب میں ڈھالتا رہا۔ ماں کی فرطِ محبت

۱۔ اپنی ماں کے بارے میں شاہد نے کہا My mother is my poem یعنی میری والدہ میری نظم ہے۔ یہ اُن دنوں کہا جب ماں کی وفات کے بعد اٹھارہ مہینے اُس کا قلم رُک گیا تھا۔

نے اُس سے Rooms are never finished لکھوایا اور اُس نے موت کا جام پینے سے پہلے کہا کہ اُس کا کام مکمل ہو گیا۔ اظہار پیٹکن Izhar Patkin ایک نامور مصوّر ہے۔ امریکہ میں قریباً ۲۵ سال سے رہائش پذیر ہے۔ شاہد کی شاعری کے ساتھ اُس کا اُنس بڑھ گیا ہے اور اُس نے ایک نمائش کی ہے، شعر پر۔ اسی طرح نیلما شیخ نے بمبئی میں نمائش کی تھی۔ اظہار نے کہا کہ "Veil والی نظم چھپے گی نہیں اس لئے کہ میں (اظہار) اس کو چھاپ رہا ہوں۔ اسے استعمال نہیں کیا جا سکتا کیونکہ میں نے اس پر تصویریں بنائی ہیں"۔ اظہار جو کام کر رہا تھا وہ تو Veil پر ہی مبنی تھا۔ جب اُس نے مجھے تہہ خانے میں لیا جہاں وہ کمپیوٹر پر کام کر رہا تھا، میں نے پردہ دیکھا۔ میں نے کہا پردہ ہٹاؤ، میں تصویر دیکھوں گا مگر اُس نے کہا کہ تصویر ہی تو پردہ ہے۔ اُس کی تصویریں بڑے شہروں اور بین الاقوامی اہمیت کی جگہوں پر بنی ہیں۔ Rooms are never finished کی تصویر بھی اظہار کی تصویر ہے۔ اس تصویر میں دکھایا گیا ہے کہ ہاتھی پہاڑوں کے ٹیلوں سے گزر رہے ہیں۔

شاہد اپنی والدہ کی طرح یہاں کشمیر میں دفن ہونا چاہتا تھا مگر بعد میں اُس نے اپنا خیال ترک کیا۔ کہا کہ اس میں کافی محنت بھی ہے اور خرچہ بھی۔ وہ امریکہ میں نصف عمر رہا۔ وہاں وہ پھلا پھولا اور بلندیوں پر چڑھا۔ لہٰذا اُس نے فیصلہ کیا کہ اُس کا دفن کفن امریکہ میں ہی ہو۔ یاسین ملک امریکہ میں تھا جب شاہد نے آخری بار اپنی شاعری سنائی۔ مگر واپس آ کر وہ شاہد کے ساتھ رابطہ کر کے رہا۔ اخبارات اور دیگر ذرائع سے اُسے پتہ چلتا رہا کہ شاہد کا حال کیا ہے۔ شاہد کی وفات کے بعد سرینگر میں اُس نے دھوم دھام سے سوگ منایا اور اپنے دوستوں اور لوگوں کے ساتھ۔ شاہد علی فونڈیشن قائم کرنے میں اس کا بنیادی رول رہا حالانکہ یہ فونڈیشن میری غیر حاضری میں قائم ہوئی۔ بلا راج پوری نے مجھے بعد میں بتایا کہ کشمیر کی شخصیت شاہد کی شاعری سے بین الاقوامی رنگ اختیار کر گئی۔ مگر شاہد نے ایتاب گھوش کو بتایا کہ وہ (شاہد) کشمیری شاعر ہوں نہ ہوں اور نہ اس لحاظ سے محبِّ وطن مگر کشمیر

نے اُس کو گلے لگایا۔ قومی سطح پر بھی دی ہندو نے میگزین سیکشن میں نیلما شیخ کی شاہد پر نمائش کو جگہ دی۔ گریٹر کشمیر نے تو رنگ میں شاہد پر پرچے چھاپ دئے اور اس کے reprints بھی نکالے۔ نیز شاہد پر مضامین کو خاصی جگہ دی۔ میں نے اپنی گھر والی کے ساتھ پچاس سے زیادہ سال اکٹھے گزارے اور مجھے کسی کسی وقت اس کی یاد بہت ہی ستاتی ہے مگر نہ جانے میں کیوں محسوس کرتا ہوں کہ شاہد ابھی زندہ ہے اور وہ ضرور زندہ ہے۔ اُس نے جو کام کیا وہ اُسے کبھی مرنے نہ دیگا۔ میں حیات کا قائل ہو گیا۔

احباب اور شاگرد

دوستی بے بہا دولت ہے اور قابل احترام، اس لئے اپنی زندگی میں اِسے ارفع و اعلیٰ مقام دے چکا ہوں۔ دوستی نہ دولت دیکھتی ہے اور نہ رنگ و نسل۔ یہ مذہبی حد بندیوں سے بھی آزاد ہے اور طبقاتی تعصب اور فرقہ واریت کو جگہ نہیں دیتی۔ یہ ایزدی عنایت ہے جو انسان کے اوپر نازل ہوتی ہے۔ اس کا سب سے بڑا فیض ہے انسان کو صاف و پاک کرنا اور اس کے اندر شریف النفسی پیدا کرنا۔ اس میں خود غرضی نہیں، خود فراموشی نہیں بلکہ عزّت نفسی ہے جو انسان کی زندگی کو قدر و قیمت عطا کرتی ہے۔ فاسقوں کی کیا بات کریں جو دوستی کیلئے انتظامات کرتے ہیں تا کہ زندگی کے منافع حاصل کرنے میں دست گیری کرے۔ جے، بی، پریسٹلے نے کہا ہے کہ فاسق صبح و شام تک دوستی کے انتظام کرتے ہیں تا کہ زندگی منافع بخش ثابت ہو جائے مگر ان کو شام کے وقت دوستوں کے ساتھ بیٹھنے کا آرام میسّر کہاں اور نہ یہ خوش مذاقی حاصل کہ دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر محبت اور خلوص سے بھرا کلام کریں، بے معنی ہی سہی۔ کتنی خوش قسمتی ہے کہ پچھلے ستّر سال سے میرے اردگرد دوستوں کا ہجوم رہا اور میرے سب دوست ابھی ماشاءاللہ دوست ہیں۔ جب میں دوستی کی بات کرتا ہوں تو مجھے یاد آتا ہے کہ اوائل عمر سے ہی مجھے نفاست کی زبردست خواہش تھی، پیاس تھی اور میں جانفزا انسانی برادری کا طلبگار تھا۔ میری تڑپ عظیم دوستوں کی طرف مجھے کھینچ کر لے گئی اور میں کبھی کبھی ہیرو ورشپ سے بھی ہمکنار ہوا۔

سب سے پہلے میں ایک دل چسپ شخص کا تذکرہ کروں گا جو ۱۹۳۵ء کے قریب میرے ساتھ جُڑ گیا۔ میں اُن دنوں آٹھویں میں پڑھتا تھا۔ حسن لمبے قد کا لڑکا تھا جو تجارت پیشہ خاندان کے ساتھ تعلق رکھتا تھا۔ ان کی ایک دکان تھی۔ حسن کا باپ حج کیلئے سعودی عرب چلا گیا تھا اور وہاں ہی فوت ہوا تھا۔ وہ بربرشاہ میں رہتا تھا۔ ہم دوست بن گئے۔ اسے بسکو سکول نے بہت اچھا کھلاڑی (فٹ بال کا) بنایا۔ مجھے معلوم نہیں کہ حسن کی جیب میں آنے پیسے کہاں سے آتے تھے۔ جب کبھی ہم رگیٹا کھیلنے جاتے تھے یا نہرو پارک کے پاس سائیکل دوڑ میں حصہ لینے کیلئے جاتے تھے، حسن سات آٹھ آنے میں پیسٹری خرید کے لاتا تھا۔[1] اُن دنوں پیسٹری کا ایک پونڈ ایک روپے سے کم پیسوں میں ملتا تھا۔ ان دنوں سائیکل پر آتے جاتے موسم گرما میں میں دس دس بارہ بارہ پیسٹری کے دانے کھاتا تھا۔ میرے سینے میں جو پٹھے جم گئے ہیں۔ اس کی شہادت دیتے ہیں۔ وہ پیسٹری آج کل کی پیسٹری جیسی نہیں ہوتی تھی۔ وہ اصلی اور صاف چیزوں سے بنائی جاتی تھی۔ مہاراجہ ہری سنگھ نے احدو کو پیسٹری بنانے کی تربیت حاصل کرنے کیلئے کلکتہ بھیجا تھا۔ اس لئے اس کی پیسٹری اول درجے کی ہوتی تھی۔ اب نا وہ پیسٹری ہے اور نہ وہ اصلی دوستی۔ بس ملاوٹ ہی ملاوٹ ہے، حسن کا ہر شخص متوالا تھا۔ وہ کرکٹ کھیلتا تھا، ہاکی کھیلتا تھا مگر فٹ بال میں سب سچ مچ حسن تھا یا احسن۔ میں نے دنیا میں پچھلے پچاس سال سے بہت کھلاڑی دیکھے ہیں مگر حسن کا انداز کہاں۔ وہ نرالا کھلاڑی تھا۔ زیادہ نہیں دوڑتا تھا۔ شاید وہ پروا نہیں کرتا تھا۔ مگر جب کبھی بال اس کے پاس آجاتی۔ وہ چند سکنڈ کیلئے اچھل کُود کرتا اور پھر ہر وقت ڈبل کِک

۱۔ بسکو سکول ہر منگلوار کو ناد دوڑ، تیراکی اور دوسری کھیلوں کیلئے ڈل جاتا تھا۔ ڈل وہی جھیل ہے جس میں نیا کشمیر کے دست برد نے مکانات تعمیر کرائے اور اس کے اندرز بردست گندگیاں پھیلا دیں۔ نانا دی ڈگر ایک اُستاد تھا۔ وہ جب ڈل میں غوطہ لگاتا تھا، ہر چند لڑکے اور اُستاد تلاش کرتے نہیں ملتا تھا۔ پھر اچانک کسی جگہ دس منٹ پندرہ منٹ کے بعد نمودار ہو جاتا۔ ہم سوچتے ڈگر مہینوں سے غائب تھا۔ نانا دِ ڈگر بسکو صاحب کا دیا ہوا نام تھا۔ یہی نانا جھیل ولر میں سات اُستادوں کے ساتھ ڈوب گیا اور کبھی لوٹا نہیں۔

(Kick) مارتا اس طرح سے کہ بال گول کے اندر اور گول کیپر (Goal Keeper) بہر صورت گول روکنے میں ناکام۔ بال نیٹ (net) میں کئی سکنڈ کیلئے چکر مارتی کیونکہ قریباً ۱۰۰ میل فی گھنٹے کی رفتار حسن کے پاؤں کا کرشمہ ہوتا تھا۔ وہ بہت معمولی کنواس کا جوتا پہنتا تھا جسے ان دنوں فلیٹ کہتے تھے۔ کشمیر کے فٹ بال کھلاڑی ننگے پاؤں کھیلتے تھے۔ کبھی کبھی کھیلنے سے درد پیدا ہو جاتا تھا۔ جب حسن انٹر کالج (Inter College) پنجاب یا گجرانوالہ کے سرداروں کے ساتھ کھیلتا تھا جو دراز قد کے جسیم لوگ ہوتے تھے، تو وہ چھ سات گول مار ہی لیتا تھا۔ ایس پی کالج خوشی منانے کیلئے دن بھر بند رہتا تھا۔ حسن پولیس میں چلا گیا اور وہاں بھی کئی سال کھیلا۔ پھر اس نے اپنے بھتیجے فاروق کو تیار کیا جو ٹرانسپورٹ میں مشہور کھلاڑی بن گیا۔ مجھے حال ہی میں یاسین ملک سے پتہ چلا کہ مائسمہ نے بھی ایک فٹ بال کھلاڑی پیدا کیا تھا۔ آہ! ہم آسانی سے اُن لوگوں کو بھلا ڈالتے ہیں جو مختلف شعبوں میں اپنا نام پیدا کرتے ہیں۔ مائسمہ کا کھلاڑی آل انڈیا سطح پر کھیلتا تھا۔ جب اس نے چین کے خلاف کھیلا تو واحد گول سے جیت لیا۔ اگر اس سال عرفان کا ٹھواری فاؤنڈیشن ایوارڈ دیا گیا تو میں اُس کا نام تجویز کروں گا۔ یاسین صاحب نے کہا کہ کلکتہ میں ٹریفک بند ہو جاتا تھا جب وہ وہاں کھیلتا تھا۔ میں حسن کی بات کرتا ہوں۔ ہم ہمیشہ حسن کی فیملی کے ساتھ مربوط رہے ہیں۔ وہ بڑا فیاض آدمی ہے۔ کئی ماہ سے اب بے چارا علیل ہے۔[1] وہ عمر میں مجھ سے تھوڑا زیادہ ہے۔ اس کا بیٹا عرفان حسن بھیّا کا دوست ہے۔ جب کبھی میں انگلستان جاتا، امریکہ جاتا یا کہیں اور، ہم کچھ وقت کیلئے دور رہتے مگر دوستی اور محبت میں کوئی فرق نہ آتا۔ جب میں واپس آتا اور ہم ملتے، تو اسی حرارتِ قلب اور والہانہ شوق سے ملتے جس کا نام ہماری دوستی ہے۔

پنڈت لوکیش در میرے ساتھ پڑھتے تھے اور ہم دوست بن گئے تھے۔ کالج کے دنوں میں ہی وہ میرے رقیب بن گئے تھے اور وہ بھی ایوارڈ کے سلسلے میں جس کا ذکر پہلے ہی

۱۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں۔ اس کتاب کے چھپنے سے پہلے ہی خدا کے حوالے اپنے دائمی گھر چلا گیا۔

کر چکا ہوں۔ میں نے رقابت کو دوستی کے بیچ میں آنے نہیں دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ لوکیش بھی دوستی کی عنایتوں سے واقف تھے۔ مجھے اس کے طور طریقے، اس کا وتیرہ، اس کی بول چال اور اس کی انگریزی میں حسن دکھائی دیتا تھا۔ میں اسے کھونا نہیں چاہتا تھا اگرچہ زندگی کے نشیب و فراز کبھی کبھی ہماری دوستی پر دراز دستی کرتے تھے۔ لوکیشن کے بچے بھی اب ہندوستان سے باہر مغربی ممالک میں خوش اور خوشحال ہیں اور پڑھے لکھے۔ بدقسمتی سے ہماری رقابت بچوں میں بھی پہنچ گئی ہے۔ میری بیٹی حنا اور لوکیش کی بیٹی نیلما کی دوستی ۴۰ سال سے قائم ہے۔ نیلما دلّی کالج میں انگریزی پڑھاتی ہے۔ بھیا کی دوست ہے۔ جب وہ انڈیا انٹرنیشنل سنٹر میں آتی تھی تو بھیا اسے ٹی، ایس، ایلیٹ (T.S. Eliot) کے بارے میں راہنمائی کرتا تھا۔ اس کی دوسری بیٹی سُدھا آئی، اے، ایس افسر بن گئی۔ جب حنا اور نیلما وومنز کالج مولانا آزاد روڈ سرینگر میں پڑھتی تھیں، نیلما سٹوڈنٹس کونسل کی پریذنڈنٹ بننا چاہتی تھی اور حنا بھی۔ وہ ۱۹۴۲ء کے گولڈ میڈل کی طرح حنا کو بھی پریذیڈنٹ نہیں بنانا چاہتے تھے مگر اس وقت اقتدار والے وہ لوگ نہیں تھے۔ جو ۱۹۴۲ء میں تھے۔ پر اس سال وومنز کالج پریذیڈنٹ کے بغیر رہا۔ مگر اس رقابت سے بھی ہماری دوستی پر اثر نہ پڑا۔ یہ تو ہم کہہ چکے ہیں کہ لوکیش درممتاز پروفیسر ایس ایل در کے فرزند تھے۔

پروفیسر ایس ایل در صاحب کا ذکر چھڑ جائے تو مایہ ناز پروفیسر جیالال بھول جائیں، یہ ناممکن ہے۔ کول صاحب میرے کالج کے دنوں میں ہی ایس پی کالج سرینگر میں انگریزی پڑھاتے تھے۔ خواجہ غلام السیدین نے ان کی اہلیت اور قابلیت دیکھ کر اُنہیں میر پور انٹرمیڈیٹ کالج کا پرنسپل بنا کے بھیجا تھا۔ کول صاحب پہلے میرے استاد تھے اور بعد میں میرے دوست بن گئے۔ جب اُستاد اور شاگرد کا رشتہ جو ہمارے سماج میں باپ بیٹے کا رشتہ مانا جاتا ہے اور جس میں گورو چیلے کے تعلق کی روحانی عظمت ہوتی ہے، دوستی میں بدل جائے تو اسی میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ دوریاں مٹتی ہیں، فرضی اور نقلی فاصلے دور ہو جاتے

ہیں اور دل بدل علم و دانش اور روحانی اسرار کھُل جاتے ہیں۔ کول صاحب نے ابتداء کی تھی جب مجھے دعوت دی تھی کہ میں ان سے کتابیں لیا کروں اور اپنی عقلی اوفکری دنیا آباد کیا کروں۔ مجھے یاد ہے جب انہوں نے مجھے شیلے کی دنیا میں پہنچادیا تھا، اُسی پی، بی شیلے کی دنیا میں جس کی لمبی نظم پرومی تھیس خزانۂ علم ہے اور جس کی مختصر نظم قصیدہ حُسن ذہن Ode to Intellectual Beauty ابھی بھی صاحبان فہم و فراست کی فکری قوتوں پر تازیانے مارتی ہے۔ یہ کول صاحب کشمیری پنڈت تھے ہی مگر اُن کا ذہن، ان کے ذہنی اور حسّی کرتب پنڈتوں کو بھی حیرت میں ڈالتے تھے۔ بہت خوبصورت تھے، میانہ قد کے خوش طبع جوان، مگر ان کی جسمانی وضع قطع ان کی پوشاک اور ان کی صاف وشفاف ستھرائی کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتی تھی۔ ان کے پہناوے ان کے انداز سے زیادہ نکھر آتے تھے اور ان کی اندرونی حس کا اتا پتا دیتے تھے جو حُسن شناسی، حُسن پذیری اور اس کی پذیرائی کیلئے بہت ضروری ہے۔ وہ بڑے حساس تھے اور شگفتہ مزاج اور شاید ان خصوصیات طبع کی وجہ سے ظریف تھے۔ ان کی ظرافت ہنساتی تھی مگر ذہن کو بیدار کرتی تھی اور اس میں کسی بھی طرح مسخرا پہن کا عمل ہوتا تھا اور نہ دخل۔ وہ اسی طرح چھیڑتے تھے جس طرح لارڈ مونٹ بیٹن قائداعظم محمد علی جناح کو چھیڑتے تھے۔ وہ شیر کشمیر کے مدّاح تھے مگر ان کی قدآور شخصیت کی لُطف اندوزی کا احساس دینے کیلئے عجیب وغریب مذاق تراشتے تھے۔ جس مجلس میں کول صاحب بیٹھے، تبسّم آمیز کلام کرنے لگے، اس کی نوعیت بدل گئی۔ یوں کہئے کہ وہاں زندہ دلی کی سگندھ جلنے لگی۔ اس کی مثال ان کی زندگی کے آخری ایّام سے مستعار لی جاسکتی ہے۔ میرے ایک شاگرد نے مجھے کہا کہ جب کول صاحب سرطان کی بیماری کے آخری سٹیج پر تھے اور وہ مشکل سے بات کرسکتے تھے، وہ دونوں ہاتھوں میں اپنی لکھی ہوئی کتابیں لئے کالج آف ایجوکیشن کے سٹاف روم میں گھُس گئے۔ وہاں حاضر کالج کے پروفیسروں نے اُن کا احترام کیا اور اُنہیں خوش آمدید کہا۔ کول صاحب نے فرمایا کہ وہ اپنی لکھی ہوئی کتابیں

بانٹ رہے ہیں اور اسی لئے کالج آف ایجوکیشن بھی آئے ہیں۔ وہ اب گذر رہے ہیں اور چاہتے نہیں کہ یہ کتابیں گھر پر بے کار رہیں۔ تو اس طرح وہ کتابیں بانٹنے لگے۔ جب کتابیں بٹ گئیں تو کول صاحب اُٹھے اور چلنے لگے۔ انہوں نے اپنا انگریزی ٹوپا (felt) میز پر ہی بھول ڈالا۔ میرے شاگرد کی نظر کول صاحب کو الوداع کرنے کے بعد ٹوپے پر پڑی۔ اس نے ٹوپا اٹھایا اور کالج کے باہری دروازے کے پاس ''کول صاحب، آپ اپنا ٹوپا بھول گئے'' پکار کر کول صاحب کی توجہ اپنی طرف پھر گئے۔ کول صاحب نے دفعتاً فی البدیہہ کہا Thank God, I forgot my cap not my head (خدا کا شکر، میں ٹوپی ہی بھول گیا، اپنا سر نہیں)۔ کول صاحب انگریزی ٹوپا ہی نہیں بلکہ شاندار سُوٹ بوٹ پہن کے آئے تھے اور پیدل۔ ان کے ہاتھ میں ایک شریف زادے کی طرح (gentleman) خوبصورت عصا ہوتا تھا، جسے وہ کبھی ٹیکتے تھے مگر کبھی ہلاتے تھے۔ انگریزی کے پروفیسر انگریز جیسے لگتے تھے مگر نہایت ہی دُھلے منجھے۔

کول صاحب کے عادات واطوار ان کی متمدّن شخصیت کی علامت تھے ہی، مگر اُن کا ادب کے ساتھ ذوق وشوق کچھ معمولی قسم کا نہ تھا۔ اُن کی رگ رگ میں شاعری بسی ہوئی تھی۔ جس طرح خون رگوں میں دوڑتا ہے۔ اسی طرح شعر وادب ان کے دماغی خلیوں سے گزر گزر کر نئے نئے رنگ جماتا تھا۔ انگریزی ادب تو ان کا من بھاتا کھاجا تھا مگر دیگر زبانوں کی طرف بھی ان کا رجحان پختگی کی حدوں کو چھو گیا تھا۔ اُنہوں نے کشمیری غزلوں کا ترجمہ کر کے اپنی دھاک جمائی تھی۔ للہ دید کے کلام سے بھی پتہ چلتا ہے کہ کول صاحب اس عظیم صوفیہ سے واقف تھے۔ کلچرل اکیڈمی میں بخشی صاحب نے انہیں ایس پی کالج سے فارغ ہو کر سیکریٹری کے فرائض انجام دینے کیلئے لیا تھا اور وہ بخشی صاحب کا خاصا اچھا تعلیمی وتمدنی قدم تھا۔ اس سے پہلے خود شیر کشمیر نے کول صاحب کی ملازمت کی مدت دو سال کیلئے بڑھائی تھی اور اس طرح کول کی گرانقدر خدمات کا احترام کیا تھا۔ کول صاحب

میرے ساتھ بلاتکلف پیش آتے تھے اور ہر قسم کی باتیں کرتے تھے جن کا تعلق عہد حاضر کے معاملات کے ساتھ ہوتا تھا۔ وہ ادب کے علاوہ سیاست، اخلاقیات اور سماجیات پر بھی نظر رکھتے تھے اور اپنی شخصیت کی سدا بہاری کا اہتمام کرتے تھے۔ ذاتی تعلقات کو تو وہ کبھی بھی زمانے کے غموں اور تند و تیز روش سے خراب ہونے نہیں دیتے تھے۔ ہمارے تعلقات کافی بڑھ گئے تھے اس لئے ہم ایک دوسرے کے گھر جا کر مختلف قسم کی غذاؤں سے بھی لُطف اندوز ہوتے تھے۔ ہمیں یاد ہے کہ اُن کا روغن جوش ان کی غذائی مہارتوں اور لطف و سرور کی لذتوں کے ساتھ کس طرح میل کھاتا تھا۔ اکل و شرب کی محفلیں ہمارے گھریلو تعلقات میں اضافہ کرتی تھیں اور ہم نعمتوں کے ساتھ مسرّتوں اور جذباتی ہم آہنگیوں سے بھی زندگی کی رنگینیوں کا اہتمام کرتے تھے۔ میں اس وقت یہ سطریں لکھ رہا ہوں اوکول صاحب اور ان کے گھر والوں کی یاد تازہ کر رہا ہوں۔ کشمیر ایسے پنڈتوں کی زندہ دلی سے اور رنگین اداؤں سے اب لگتا ہے محروم ہو گیا ہے اور یہ درد میرے وجود میں اُبھرتا ہے، کروٹیں لیتا ہے!

اب میں سٹی فن زوانگ (Stefan Zweig) کی خودنوشتہ سوانح عمری[1] سے ایک اقتباس نقل کروں گا۔ یہ کتاب میں نے علی گڈھ، جامعہ کے ایام میں پڑھی تھی۔ یہ اقتباس میرے قلبی واردات کا اتا پتا دیتا ہے جن کا براہ راست تعلق ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر حبیب، پروفیسر مجیب، ڈاکٹر عابد حسین اور پال برنٹن کے ساتھ ہے اور جن سے عندیہ ملتا ہے میں جوانی کے اُن ایام میں کیا سوچ رہا تھا اور کن چیزوں کو پسند کرتا تھا۔ سٹی فن نے لکھا تھا:

> ''وہ نظروں سے دُور گمنام زندگی گزارتے اور کوئی ان کی اہمیت سے واقف نہیں ہوتا۔ مگر جب میں اُنہیں دیکھتا تو ملنے لگتا۔ مجھے علم ہے اور احساس بھی کہ ایسے لوگ مسرّت اور فیضان کا سرچشمہ ہیں۔ ضروری ہے کہ یہ بات علی الاعلان کہی جائے۔ ایسے لوگوں نے اس

۱۔ اس کا عنوان تھا The World of Yesterday (گذرا ہوا زمانہ)۔

میرے دادا کے باپ حکیم علی نقی
(رائل فیزیشن مہاراجہ پرتاپ سنگھ)

اپنے نانا آغا سید حسین اور ماموں سید
احمد کے ساتھ لاہور 1930ء میں

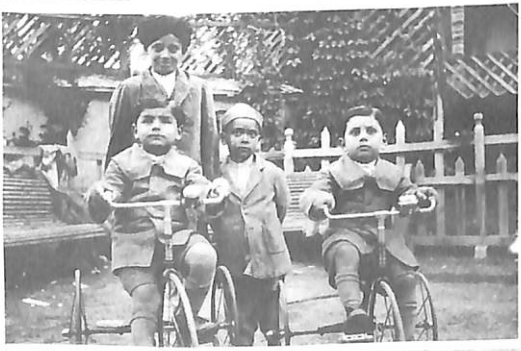

اپنے ماموزاد بھائی آغا سید جلال
کے ساتھ 1924ء میں

پنڈت نہرو میرے بچوں کے

پنڈت نہرو میرے ایل وعیال
کے ساتھ 1959ء

کشمیر ہاؤس پنڈت جی کے
ساتھ 1949ء میں

1952ء میں شیخ صاحب کے ساتھ انسپکٹر سکولز کی حیثیت سے

شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ بورڈ آف سکول ایجوکیشن کا افتتاح کرتے ہوئے 1976ء

شادی کی تقریب 1946ء سرینگر میں

دنیا میں بھی تکمیل کی قسم کھائی ہوئی ہے جس دنیا نے اپنے آپ کو مشینوں کے حوالے کرنے کا آغاز کیا ہے۔ میں نے چند ایسے لوگوں کے ساتھ قریبی انسانی ناطہ پیدا کیا ہے۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ میرے پاس اس تعلق سے زیادہ کوئی قیمتی شے نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ میں ان لوگوں کی کافی عزت کرتا تھا مگر اب عزت کی جگہ پائیدار دوستی نے لے لی ہے۔"[1]

میں نے پہلے اشارے دئے ہیں کہ میں ذاکر صاحب سے کس طرح مسحور ہوا، کس طرح اس سحر نے مجھے جامعہ پہنچا دیا اور وہاں کے اکابر میرے ہیرو کیسے بنے۔ یہ سحر، یہ شخصی پسندیدگی تیس سال تک رفتہ رفتہ دوستی میں تبدیل ہوگئی۔ پروفیسر مجیب پروفیسر حبیب کے چھوٹے برادر تھے۔ انہوں نے مجھے مجیب صاحب کیلئے خط دیدیا۔ لکھا کہ وہ (مجیب) اُردو کے مانے ہوئے اُستاد ہیں، اس لئے اشرف ان کے قدموں میں بیٹھ کر فخر تلمذ حاصل کریگا اس لئے کہ اُردو جامعہ میں پڑھنے پڑھانے کا ذریعہ ہے۔ اصلی بات یہ تھی کہ مجیب صاحب انگریزی کے بھی مانے ہوئے اُستاد تھے۔ ان دو بھائیوں کی آپس میں چھپ چھپ کے لطیف سی رقابت تھی۔ لوگ اس بات پر انہیں چھیڑتے تھے۔ حبیب صاحب کامل تھے اور ان کے فرمودات سنتے سنتے سانس رُک جاتی تھی مگر فصاحت، بلاغت، اُسلوب اور اندازِ بیان میں مجیب صاحب لاثانی تھے۔ مجیب صاحب نے دی انڈین مسلمز میں خواجہ معین الدین چشتیؒ کی روحانی عظمت کو سراہا ہے۔ بعد میں میں نے دیکھا کہ اناماری شمل نے بھی

1. We were abashed to gaze upon them, for they lived abscurely insignificantly, invisibly. I only know and feel the necessity of owring publicly how great a lesson and how great a joy it was for us to have the presence of such saints sworn to perfection in the midst of a world that has already begun to mechanize itself. And looking back upon my life I am aware of no more a precious possession than the privilege of being humanly close to some of them and of having my early reverence often grown into lasting friendship.

''اسلام میں روحانیت کے پہلو'' (Mystic Dimensions in Islam) کتاب میں حضرت بایزید بسطامیؒ کے حوالے سے یہی بات کہی ہے اگرچہ الفاظ مختلف ہیں۔ اور ایسی ہی بات میں نے ان صوفیا جیسی شخصیتوں میں پائی ہے جنہوں نے گمنام زندگی گزاری مگر مجھے تازہ جوانی کے ایام میں گھر کی چار دیواری سے نکال کر وہاں کھڑا کیا، جہاں میں اب ہوں۔ مجیب صاحب لکھتے ہیں:

> ضروری ہے کہ ایک مسلمان کے کردار میں تین اوصاف پیدا ہوں۔ کریم النفسی جیسی کہ دریا میں ہوتی ہے۔ فیاضی جیسی کہ مہرِ عالم تاب میں پائی جاتی ہے اور مہمان نوازی جس کیلئے مادر گیتی بے مثال نمونہ ہے۔[1]

پروفیسر مجیب کی اپنی ذات میں یہ تین خصائل بدرجہ اتم موجود تھے اور وہ جامعہ کے اُولوالعزموں میں سے اُبھر آئے تھے۔ میں جب اُن سے ملا تو اُن کی موہنے والی شخصیت نے اپنی طرف مقناطیس کی طرح کھینچ لیا۔ پھر رفتہ رفتہ اس ہمہ گیر شخصیت کے کتنے ہی رنگ سامنے آئے اور میری تجسّس کی اہلیت کو جھنجھوڑتے رہے۔ میں نہ چاپلوس پیدا ہوا تھا اور نہ اس مذموم خصلت کی طرف کبھی مائل ہوا تھا مگر ان کی ذات کے قصیدے دل ہی دل میں پڑھتا رہا۔ سچ ہے کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ فارسی میں دل را بدل ریست اس کا ہو بہو رُوپ ہے مگر انگریزی کا Love begets love میرے اور مجیب صاحب کے تعلقات میں زیادہ کام آیا۔ ہماری محبت میں راہ ہی پیدا نہیں ہوئی بلکہ میرا شوق و ذوق ان کے دل میں بھی میری محبت پیدا کر گیا۔ وہ تو زبانی اظہار کے بغیر اسے دکھاتے رہے، کبھی اشاروں سے، کبھی طور طریقوں سے اور کبھی عملی طور پر۔ میں ان کی بلندی محسوس کرتا رہا اور ان کی جاذب اندرونی کیفیات کی اور وہ میرے درد کو اپنا درد سمجھتے رہے۔ میں ان کی آواز سنتا رہا

1. A Muslim is enjoined to cultivate a generosity like the generosity of the river, a benevolence like the henevolence of the sun, and a hospitality like the hospitality of the earth.

اور ان کے کلام کے خفیہ ٹھکانوں پر پہنچنے کی کوشش کرتا رہا مگر ان کے تحریروں میں مجھے نہ صرف معانی کی گہرائیاں اور بھی زیادہ دکھائی دیں بلکہ ایسا رقص ونغمہ بھی نظر آیا جس سے اب بھی میں خوشہ چینی کرتا ہوں اور غمِ عشق کے مزے لوٹتا ہوں۔ ان کے قلم میں دریا کی سی روانی ہے اور یہ دریا اپنے اندر نہ جانے کتنے صاف وشفاف چشموں اور جھرنوں کو لئے ہوئے بہتا ہے۔ ان پانیوں کے اندر بہاؤ کے علاوہ بھی بہت ہی حیات افزا اور مسرت انگیز موتی چھپے ہوئے ہیں۔

مجیب صاحب کے ساتھ میری والہانہ محبت کے اور بھی بہت سے وجوہ ہیں۔ وہ بہت سیدھے سادھے شخص تھے اور ان کی طرف دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ اس بظاہر سادہ شخصیت میں اتنے بھانت بھانت کے گُن کیسے۔ وہ جب بولتے تو سادگی سے موثر اور فصیح و بلیغ لفظوں میں زیادہ سے زیادہ باتیں سمجھاتے۔ ایسی باتیں اس وقت کے ہندوستان میں بھی چیزے دیگر ہیں۔ ان باتوں کی قدر ومنزلت پست درجے کے لوگ نہیں سمجھ سکتے اور نہ وہ جن کی ذہنی اور جذباتی سطح علم و دانش کی سرحدوں سے باہر کچھ اور ڈھونڈتی ہے۔ مجیب صاحب کے خطبات میں زائد الفاظ یا معمولی خیال کی گنجائش نہیں ہوتی تھی۔ مجھے تو بار بار محسوس ہوتا ہے کہ مجیب صاحب بڑے بڑوں کے ساتھ ہی ربط پیدا نہیں کرتے تھے بلکہ اُن لوگوں کے ساتھ بھی کبھی جنہیں زبان کی دقتیں اور خیال کی پیچا پیچ حالات دولت علم سے محروم کرتی ہیں۔ یہ غیر معمولی بات ہے جس سے مجیب صاحب کی عارفانہ اور پیغمبرانہ روش کا عندیہ ملتا ہے۔ مجیب صاحب کی سادگی کا احساس ان کی پوشاک، ان کی غذاؤں اور ان کے رہن سہن سے بھی مل سکتا ہے۔ اوائل عمر سے ہی ان کی انتڑیاں نہ جانے غذاؤں کے ساتھ مناسب تال میل پیدا کیوں کر نہیں پاتی تھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی حساس طبیعت کا بوجھ ہاضمے پر بھی بڑا تھا اور نظام ہاضمہ کے معمول کے کام پر بھی۔ کچھ بھی ہو مگر ان کے سلوک سے دکھائی نہیں دیتا تھا کہ وہ پیٹ کی دائمی گڑبڑ کے شکار تھے۔ شکوہ زبان پر نہ لانا اور

ہمیشہ اُن چیزوں کے ساتھ محو رہنا جو غیر معمولی زندگی کا خاصہ ہیں، ان کی سادگی کا ایک تابان پہلو تھا۔ مدبّرانہ انداز اور اس کے ساتھ شرافت اور متانت کی راہ و رسم ان کی صحبت کی پھلواڑیوں کے پھول تھے جو اکثر مہکتے رہتے تھے۔

مجیب صاحب کا علمی دائرہ بہت وسیع تھا۔ وہ تاریخ کے طالب علم ہی نہیں تھے بلکہ خود مورّخ تھے مگر تاریخ پر ان کی نظر غائر بھی تھی اور جامع بھی۔ ان کی تاریخی تحریروں سے مترشح ہوتا ہے کہ ان کی نظر، کئی ایک نکتہ ہائے نظر سے بنی ہوئی تھی۔ وہ مذہب سے بہت متاثر تھے اور ان کی زندگی عملی طور پر دین دار تھی، مگر وہ عام رو میں بہنے والے عالم نہیں تھے۔ مذہب کے خارجی اور داخلی امور سے متعلق ان کی رائے بہت پختہ تھی اور اس پختگی کی وجہ اُن کا گہرا مطالعہ تھا۔ تاریخ اور مذہب کے ساتھ مل کر فلسفیانہ افکار ان کے ذہنی معیاروں کو معنی بھی بخشتے تھے اور گیرائی ور گہرائی بھی۔ ادب کے ساتھ ان کا رشتہ گہرا تھا۔ انگلستان سے لیکر جرمنی تک انہوں نے زبانوں کا کھوج لگانے کی کوشش کی تھی جس کا خاصہ نتیجہ ان کا روسی ادب کے ساتھ لگاؤ تھا۔ وہ کس گہری آنکھ سے اس ادب کے تانے بانے اور نمونے مشاہدہ کرتے تھے۔ ادبی اعتبار سے اُن کا مرزا غالب کے ساتھ لگاؤ کچھ معمولی نہ تھا۔ غالب کے کلام میں جو بلندی ہے اس کو فکرِ نارسا چھو نہیں سکتی۔ مجیب صاحب نے اس بلندی کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا، محسوس کیا تھا۔ ذاتی طور پر وہ اس سے حظ اٹھاتے تھے اور اپنے جیسے علما و فضلاء کے ساتھ غالب فہمی کو بانٹنا چاہتے تھے۔ اس مختصر اساسِ رفاقت کے بیان سے مراد نہیں کہ مجھے ان کے سیاسی شعور اور ہندوستان کے اندر اور باہر ہونے والے تغیّرات کا علم نہیں جن سے وہ بخوبی واقف تھے۔ مگر ان کی فہم و فراست کا ایک جداگانہ رنگ تھا جو حالات، واقعات، تغیّرات اور ان سے متعلق امورِ زندگی کو نہ بلا سوچے سمجھے قبول کرتا تھا اور نہ رد۔ ان کی سلجھی ہوئی رائے بھی ہمارے آپسی تعلقات کا ایک باب تھا۔

مجیب صاحب کی عالمانہ اور دانشورانہ زندگی کے باوجود بھی میری ان کے ساتھ

دوستی پھلی پھولی مگر اس کا ایک اور رُخ تھا۔ وہ ایک سچے مُحب کی طرح میری ذاتی اور گھریلو زندگی میں شریک ہوتے تھے۔ میرا نکاح ہوا تو مجیب صاحب ساتھ تھے۔ میری پہلی اولاد ہوئی تو چلتے چلتے ناہموار راستے کی پروا کئے بنا میری رہائش گاہ پر تشریف لائے۔ ان دنوں کرایے کے مکان میں رہتا تھا اور جامعہ سے ذرا دور مگر انہوں نے میرے گھر تشریف لانے کی زحمت برداشت کی اور اس طرح خیر خیریت پوچھی کہ زبان سے کم کام لیا اور آنکھوں سے زیادہ۔ حد یہ ہے کہ چپکے سے میرے ہاتھ میں دو سو روپے تھام دئے کہ شاید زمانہ عُسرت میں ایسے موقعوں پر کام آئیں۔ جامعہ میں حالانکہ پیسہ نہیں تھا، اُن دنوں زیادہ ہی کم۔ اور ایک واقعہ بھی ایسا ہی پیش آیا۔ جب میں ولایت سے گھر پہنچ گیا مگر سرینگر نہ جا سکا اس لئے کہ شیخ صاحب نے جموں میں ٹھہرنے کو کہا تھا جب تک کہ وہ خود پہنچیں۔ میں ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا اور جیب خالی تھی۔ صبح کے وقت ناشتہ کرنا چاہتا تھا مگر کیسے؟ ہوٹل سے باہر نکلا، ریذیڈنسی روڈ پر کھڑا ہو گیا کہ کوئی خدا کا بندہ جانا پہچانا ملے تو اُس سے کچھ اُدھار مانگوں۔ اللہ اکبر، مجیب صاحب تانگے پر نظر آئے، بشانِ جم۔ میری حیرانگی کی انتہا نہ رہی۔ میں نے تانگے والے کو رکنے کیلئے کہا۔ مجیب صاحب اور جموں میں؟ انہوں نے کہا کہ آکسفورڈ کے دنوں کا ان کا ایک دوست پروفیسر سوریہ کانت شاستری یہاں جموں برات لیکے آیا ہے۔ وہ آکسفورڈ میں سنسکرت پڑھتا تھا مگر یہاں جموں میں اس کے بیٹے کی شادی ہے۔ میں نے دعوت میں شریک ہونے کا وعدہ کیا تھا۔ اس لئے یہاں جموں میں ہوں۔ رات بھر کہیں اور ٹھہرا تھا مگر صبح سویرے جموال مرد عورت لوٹا لئے کھلی پتھریلی زمین میں حاجت بشر کیلئے نکلے۔ تانگہ لیا کہ کہیں رفع حاجت کیلئے جگہ ملے تو خیر ہوگی۔ میں نے اُنہیں اپنے ہوٹل میں لے لیا۔ وہ فارغ ہوئے تو میں نے اُنہیں اپنے کمرے میں بند کر دیا۔ انہوں نے تھوڑی سی چائے لی۔ نزدیک ہی ریستورانت تھا۔ میں حیران ہو گیا انہوں نے میرے دل کا حال کیسے جانا۔ چالیس روپے میرے ہاتھ میں رکھدئے۔ میں گیا اور خوب ناشتہ کیا۔ پھر شیخ صاحب آئے

اور میں ان کے ساتھ مشغول ہوگیا۔ مجیب صاحب کی پیسے کے رنگ میں دوستی کے اظہار کے اور بھی مواقع آئے مگر ان مواقع میں سوال کی یا احسان کی کوئی گنجائش کبھی نہ ہوتی۔ یہ اکٹھے زندگی گزارنے کا سوال تھا اور اکٹھے دُکھ سکھ میں شریک ہونے کا۔ مجیب صاحب کشمیر آتے تو سوال نہیں کہ میرے پاس نہ آتے اور ممکن نہیں کہ میں کشمیر کے باغ میں کہیں زیادہ باغ باغ نہ ہوتا۔ ہم سب، میں اور میرے بچے مجیب صاحب کی مہمان نوازی میں حصہ لیتے اور حتی المقدور ان کی خاطر کرتے!

میری زندگی اکثر و بیشتر پڑھنے پڑھانے میں مصروف رہی۔ شاید ہی کوئی موقعہ ملا ہو جب مجیب صاحب فراموش ہوگئے ہوں۔ آپ کے زرّیں خیالات دوسروں تک پہنچتے رہے مگر میری زبان سے۔ ان کی حسین اداؤں اور حُسن پرست حسّی گہرائیوں کی نشاندہی ہوتی رہی مگر میری اپنی ترسیلی مقدور سے۔ کتنے ہی لوگ فیض یاب ہوئے ہوں گے مجیب صاحب کی گہرائی فکر و نظر اور جذباتی نفاستوں سے۔ اگر گہرائی سے سوچیں تو معلوم ہوگا کہ مجیب صاحب کی روح میری روح کے ساتھ مل کر خود اپنے علمی و حسّی سرچشموں سے لوگوں کو سیراب کرتی رہی اور اس طرح اپنی حیات کی دائمی آسودگی کا سامان اجتماع کے ساتھ مل مل کر بہم کرتی رہی۔ مگر مجیب صاحب روزمرہ زندگی میں اُٹھتے بیٹھتے، باتیں کرتے کرتے، کھاتے پیتے، چلتے پھرتے، گھومتے گھامتے، میرے ساتھ ساتھ رہتے ہیں اور میرے احباب کی زندگی اپنے فیضان سے مزیّن کرتے رہتے ہیں۔ یہ دوستی کے سدابہار پھول ہیں جن کی بوباس اور عطر بیزی سے دل کی دنیا کو آباد کئے بیٹھے ہیں۔

یاروں کا تذکرہ کروں اور اکرم افندی صاحب کی یاد نہ آئے؟ یہ افغان، یہ پٹھان من موہنا ہے جس کے ساتھ نہ جانے کتنے ایام گزارے ہیں میں نے۔ میں نے اس کی قدر پہچانی ہے اور اس نے اپنی شاہانہ نگاہوں سے بار بار مجھے چوما ہے۔ آنکھوں آنکھوں میں چوما چوٹی انسان کو نہ جانے کہاں پہنچاتی ہے۔ ان بلندیوں پر زمین سے رابطہ کٹ جائے یا

نہ جائے مگر انسان زمینی دکھائی نہیں دیتا اور نہ ایسا محسوس ہوتا ہے۔ محمد اکرم صاحب افندی افغانستان کے ایک شاہی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس گھرانے کے کچھ افراد انگریزوں نے ڈیرہ دون میں آباد کئے تھے۔ کچھ لاہور (پاکستان) میں بسائے گئے تھے۔ میں اُن افغانوں سے لاہور میں ملتا تھا۔ اکرم صاحب کے والد کشمیر آئے تھے۔ یہاں ان کے تعلقات مہاراجہ ہری سنگھ کے ساتھ بہت اچھی سطح پر پہنچ گئے تھے۔ ان کے والد عبدالرحمان افندی مہاراجہ ہری سنگھ کے قریبی دوست تھے۔ افندی صاحب پہاڑی پر گپکار روڈ کے پاس رہتے تھے، بالکل طالع منزل کے نزدیک۔ اکرم صاحب پٹھان سہی مگر زندگی کے اتار چڑھاو سے کیسے بچ سکتے تھے۔ دوسری جنگ عظیم میں فوج میں بھرتی ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ وہ ایک دن عرب کی ایک چھوٹی کشتی (Dow) میں سفر کر رہے تھے۔ کشتی ڈوب گئی مگر اکرم صاحب بال بال بچ نکلے۔ ایک دن بمبئی میں کنارے لگے پھر کشمیر آ پہنچے۔ یہاں آزادی نے ہندوستان کے بٹوارے کے ساتھ ہی اپنا پرچم لہرایا تھا۔ افندی صاحب کا مکان آں جہانی پنڈت درگا پرشاد در نے لے لیا تھا اور وہاں سکونت کر رہا تھا۔ در صاحب ہوشیار مغز تھے اور جمالیات (Aesthetics) کا خاصا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ ایک طرف زبروں کا نظارہ اور دوسری طرف جھیلِ ڈل کی خموشی کے ساتھ اس کی صبحیں اور شامیں۔ پھر یہ کہ در صاحب سنیں کہ افندی صاحب ترک وطن کر کے چلے گئے ہیں اور وہ اپنی رہائش کیلئے ان کا مکان نہ چنیں؟ شیخ محمد عبداللہ اور بخشی غلام محمد نے بھی اپنی رہائش گاہیں چُنی تھیں مگر وہاں جہاں ان کا اقتدار جما ہوا تھا۔ اکرم صاحب نے جب سمجھا کہ ڈی، پی بیٹھے ہیں تو انہوں نے راولپورہ کی راہ لی۔ وہاں لگے اپنے باغ کو سنبھالنے اور اپنی کھیتی باڑی کی طرف دھیان دینے۔ کُجا شاہنشہی دماغ، کُجا فوجی سرگرمیاں اور کُجا باغ بانی و زمین داری۔ اگر کلچر سے کلچر کی طرف سفر ہر شخص سمجھ سکتا ہے مگر اُلٹے پاؤں کوئی چلے یہ سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ میں سمجھ سکا اس لئے کہ دوستی مشکل سے مشکل عُقدے حل کرتی ہے۔ دراصل یہ

اکرم صاحب کی شخصیت کا بہت بڑا کارنامہ تھا اور ان کے ارادے کی پختگی۔ ان کی ذات میں خارجی رنگ روپ اور کام کاج مخل نہ ہو سکے۔ آزادیٔ طبع نے سہارا دیا اور آزادی سے زندگانی کا سفر کاٹنے لگے۔ ان کے درخت کاٹ لئے گئے تھے، انہوں نے پھر درخت لگا دئے اور اس وقت کا انتظار کرنے لگے جب درختوں کے گل کھلتے ہیں اور گلوں کی رنگین دنیا پھل داریوں کی ریسلی کائنات میں نئی نئی زندگی کا اہتمام کرنے لگتی ہے۔ درخت لگاتے لگاتے افندی صاحب کا صبر اور غالب کی شاعری سرگوشیاں کرنے لگتے تھے۔[1] افندی صاحب کے صبر کا امتحان صرف درختوں کی کٹائی سے ہی نہ ہوا۔ خرگوش بھی ختم ہوئے اور گائیں بھی نابود۔ افندی صاحب نے ٹھکانا جمایا، وہاں ہی گاؤ خانے میں ایک چوکی پر۔ چوکی کیا افندی صاحب کا تخت طاؤس سج گیا۔ شاہی خون ان کی رگوں میں اور وہ اس طرح کشمیر میں رہنے لگیں کہ پاکستان کی ہوائیں بھی ان کے تخت کو چھو نہ سکیں۔ حالات کا بہادرانہ مقابلہ کرنا اس پٹھان کے جسم و جان کا بنیادی عنصر نکلا۔ میں ان کا عاشق ہو گیا مگر اس عاشقی میں عزت کی بھرمار تھی۔ کون اتنا مردہ دل ہو سکتا ہے کہ جو اس رفیق کی داد نہ دے اور اس کی جرأتوں پر فدا نہ ہو۔ میں نے ان کے پاس آنا جانا اپنا معمول بنایا اور ہمارے تعلقات بنتے گئے، نکھرتے گئے۔ ایک دو سال کے اندر اندر افندی صاحب نے نکاح کا فیصلہ کیا۔ کرنل مجید صاحب، میرے ماموں کے دوست، ایک لداخی یا گلگتی لڑکی کو اپنی اولاد بنا کر پال رہے تھے، انہی کے ساتھ افندی صاحب کا نکاح ہوا۔ دیکھئے قدرت جب کرم پر آئے تو جوڑے کس طرح بنتے ہیں۔ گلگت اور افغانستان کا زمانے کے ٹھوکروں کے بیچوں بیچ بیاہ اور میں اپنی والدہ کی لینڈ روور (Land Rover) اجازت لیکے اٹھائے آغا جلال کو ساتھ لئے افندی صاحب دولہا میاں کو اس میں بٹھا کر مجید صاحب کے گھر نہ لے

۱۔ آہ کو چاہیے اِک عمر اثر ہونے تک — کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب — دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

جاؤں تو زندگی کو سے گی نہیں؟ یہ بیسویں صدی کا وسطی زمانہ تھا۔ کرنل صاحب سلک فیکٹری روڈ پر رہتے تھے۔ اکرم صاحب نے پشمینہ اون کا سفید کوٹ پہن لیا تھا۔ پشمینہ ان کی والدہ نے پشمینہ بکرے کی اون سے خود اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا اور اس طرح محبت و شفقت کی دنیا سے تن بدن کی زینت بنے ہوئے محبت و شفقت کی دوسری دنیا کی طرف پٹھان افندی کو لے رہا تھا۔ حسّاس پٹھان نے خاصا اچھا رومال بھی پہن رکھا تھا جو زیبائش کے علاوہ علامتی روپ دھارے نکاح کے وظیفے پڑھ رہا تھا۔ اکرم صاحب کی شادی ہوگئی اور دلہن گھر آ گئی اور میاں بیوی نئی زندگی گزارنے لگے مگر اسی گاؤ خانے میں۔ دل ملیں اور زندگی کے کواڑ کھل جائیں تو گاؤ خانہ کیسے مخل ہو۔ گاؤ خانے میں بجلی کی ننگی تاریں اِدھر اُدھر لگی ہوئی تھیں اور افندی صاحب ماشاءاللہ لیمپ شیڈ بونز (Bones) سُوچ (Switch) کے طور پر بجلی چالو کرنے یا بند کرنے کیلئے استعمال کرتے تھے۔ گھاس اور لکڑی کے بیچوں بیچ رہنا ایک بہت بڑی بات ہے خاص کر اس شخص کیلئے جس کا مزاج شاہانہ اور انداز خاندانی ہو! مگر افندی صاحب کا جلال قلب اپنی جبروت لئے ان کی زندگی کے ہر مشکل کو دور بھگاتا تھا۔ خدارا انصاف کیجئے کہ میں ایسے دوست کے ساتھ جُونا جاؤں تو پھر کس کے ساتھ! افندی دوستی کی نبرد آزمائیوں کا علم بردار تھا اور میں اس علم کی لہراتی ہوئی کیفیتوں سے شرابور اور مست!

شادی سے پہلے بڑے افندی صاحب کا باغبان اکرم صاحب کی مدد کرتا رہا۔ جب اکرم صاحب حج بیت اللہ پر جانے کی تیاری کر رہے تھے، میں سمجھ رہا تھا کہ وہ اپنی شریک حیات کو ساتھ اُٹھائیں گے مگر ہوا یہ کہ اُنہوں نے خادم کا انتخاب کیا۔ کہا کہ جس نے چار پانچ سال خدمت کی اور میرے ساتھ سختیاں اٹھائیں، وہ پہلے جائیگا۔ خادم کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں پھر بھی ساتھ نبھانے کی اور مشکلات سہنے کی رفاقت کا عزم۔ ایسے انسان کی قدر شناسی دیارِ حبیب میں اکٹھے جانے سے بہتر کسی اور صورت میں نہیں ہوسکتی۔ اکرم صاحب کے کردار کی پہچان اس سے بہتر کسی اور طریقے سے نہیں ہوسکتی ہے اور نہ دوستی کے معیار کی

اور کوئی اچھی کسوٹی ہے اس سے۔ میں نے بارہا اپنے دل کو ٹٹولا یہ دیکھنے کیلئے کہ دوستی کی جڑیں کہاں ہیں۔ مگر ہر بار میں نے سمجھ لیا کہ دوستی دو دلوں کے ملنے کا ایک نشہ ہے جو کبھی اُتر تا نہیں۔ فرقِ مراتب اور اونچ نیچ کے اثرات اس نشے کو اُتار نہیں سکتے۔ افندی صاحب نے اپنے خادم کے ساتھ کس طرح طوافِ کعبہ کیا ہوگا اور مدینے کے مقدّس کوچوں میں وہ کس طرح گھومے پھرے ہوں گے۔ اس کا جواب احساس مروّت اتنا نہیں دے سکتا جتنی کہ الفت کی شہنشاہی۔ اکرم بھی اسی شہنشائیت کا شکار ہے اور میں بھی!

بہت عرصہ بیت گیا اس کے بعد۔ میرے برادر ریونیو سیکریٹری تھے۔ انہوں نے بخشی صاحب کو آمادہ کیا وہ سرینگر میں ۲۰۰ کنال زمین اکرم صاحب کو الاٹ کریں۔ زمین اکرم صاحب کو الاٹ کی گئی۔[1] انہوں نے اُس میں باغ لگائے، گائیں پالیں، اچھے تربوز، اچھے سیب پیدا کئے۔ اکرم صاحب کی ایک زیادہ ہی پالتو گائے تھی جب کبھی میں جاتا ان سے ملنے، وہ گائے کو بلاتے۔ گائے آجاتی تو اکرم صاحب اُسے چومتے۔ نام بھی رکھا تھا اس کا اور اسی نام سے اس کو بلاتے۔ میری گھر والی اکرم صاحب کو گیبرل اوک (Gabriel Oak) کہتی تھی۔ اوک ٹامس ہارڈے کے ناول ''پاگل بستی سے دور'' (Far from the madding crowd) کا بنیادی کردار۔ نشوونما پاتے پاتے حیوان ایک ایسی باہری شکل اختیار کرتے ہیں کہ دکھائی نہیں دیتے۔ اسی طرح افندی صاحب نے جب دیکھا کہ کشمیر کے حالات بدل رہے ہیں تو انہوں نے بھی ایک ظاہری، بناوٹی، دیہاتی، سیدھا سادھا روپ دھار لیا تاکہ لوگوں کو اس کی اصلی ذات کا اندازہ نہ لگ جائے بلکہ وہ دیہاتی گنوار دکھائی دے۔ مگر افندی صاحب کبھی کبھی اپنے اصلی روپ میں ظاہر ہوتے ہیں جس کا ایک پہلو ہے انگریزی وضع قطع۔ ہمارے ساتھ ٹھیٹھ انگریزی بولتے ہیں جس سے ہم چونک سے

۱۔ شیخ صاحب نے بھی افندی صاحب کو دو زمینی جائیدادیں دیں۔ ایک ایچھ گام بڈگام میں اور ایک ٹنگمرگ میں۔ ٹنگمرگ میں اُن کا مکان بھی ہے۔

جاتے ہیں۔ اس دوران افندی صاحب نے اپنی کھوئی ہوئی چیزیں بجز اپنے مکان کے بحال کی ہیں۔ ان کا مکان ڈی پی صاحب اور اس کے بیٹے وجے در نے اچھی حالت میں رکھا ہے۔ ان کی زندگی ہالی ووڈ کی ایک فلم جیسی لگتی ہے۔ اور وہ جولیس سیزر جیسے لگتے تھے۔ ۱۹۶۹ء میں غالباً میں یونیورسٹی جا رہا تھا۔ دوسری جانب سے گیبرل اوک اپنے ٹریکٹر پر کھڑے آتے ہوئے دکھائی دئے۔ انہوں نے نگین سے کافی کھاد خریدی تھی اور وہ ٹریکٹر پر لکڑی کے ایک بڑے تختے کے اوپر جمع کر دی گئی تھی۔ اکرم صاحب ایک شہزادے کی طرح کھڑے تھے، سنجیدہ، باوقار اور مطمئن۔ پاگل بستی سے دور یہ ارادے کی مورت ہر وقت نئے نئے رنگوں میں سامنے آتی ہے۔ اب انہوں نے ایک پرانی جیپ خریدی ہے۔ اس میں اُنہوں نے ردوبدل کروائی ہے اور اسے ایک چھوٹا سا ٹرک بنوایا ہے جس میں وہ سبزیاں، پھل، تربوز وغیرہ بھرتے ہیں اور دوستوں کو بھیجتے ہیں۔ ان کے ہاں اچھے خاصے سیب تیار ہوتے ہیں اور دوسرے پھل۔ بہترین گولڈن ڈلی شیس (Delicious) ان کے یہاں خوب پیدا ہوتا ہے۔ جب میں امریکہ سے واپس آیا تو مجھے گولڈن ڈلی شیس (Golaen Delicious) کی یاد آئی۔ میں افندی صاحب کے پاس گیا اور وہاں ان کے گولڈن ڈلی شیس سیبوں سے امریکہ کی یاد تازہ ہوگئی۔[1] ایک دن میں نے اپنے محترم استاد پروفیسر حبیب کو بھی ان کے گھر لیا۔ حبیب صاحب خوش ہوئے اور سیب بھی مزے لے لے کے کھائے۔

اکرم صاحب کے بچے اب بالغ ہو گئے ہیں، دو بیٹے اور ایک بیٹی۔ انکی بیٹی یونانی نژاد لگتی ہے اور خوبصورت۔ ڈیرہ دوں میں بیاہی ہوگئی ہے۔ ان کے بیٹے خوش شکل ہیں اور پھرتیلے بھی۔ خود افندی صاحب بوڑھے ہو گئے ہیں مگر بوڑھاپے میں بھی ان کے حوصلے،

۱۔ ایک زمانے میں بڑے افندی کے باغ سے نہایت ہی اچھے تربوز سرینگر میں ریذیڈنسی روڈ کی ایک میز پر بکتے تھے۔ یہ میز ایک شخص بالکل پسٹن جی کے سفید گھوڑے کے پاس سجاتا تھا۔ پسٹن جی کے پاس وہائٹ ہارس وسکی کی ایجنسی تھی۔ اس لئے سفید گھوڑا وہاں نصب کیا گیا تھا۔

ان کی جوانمردی اور بے تکلفی بدستور دوستی کا سروساماں مہیا کرتی ہے۔انہوں نے حقیقتاً خالی ہاتھوں سے کام کیا ہے اور اپنی سلطنت پھر سے قائم کی ہے۔ مجھے بدستور ان کی عزت ہے اور دوستی بدستور قائم ہے جس پر مجھے فخر ہے۔ میں نے انہیں ہمیشہ مصروف عمل پایا ہے۔ لوگ تجارت سے، سیاست سے، موقعہ پرستی سے زرومال کی ہوس میں گرفتار ہوئے اور بہت سوں نے اپنا مقام کھودیا۔انہوں نے اپنی زندگی بنائی مگر اس کے لئے بہت ہی مثبت طریقے اختیار کئے۔ میری رہائش گاہ میں آگدان (fire place) کیلئے وہ کبھی کبھی لکڑی بھیجتے ہیں۔ کشمیر میں رہتے ہوئے وہ اکثر دکھ سا محسوس کرتے ہیں کہ کشمیر خصوصاً شہر کے لوگ نہ محنت کرتے ہیں اور نہ کام۔اس سے اُن میں تساہل پیدا ہوگیا ہے اور وہ آسمان کی طرف دیکھ کر من وسلویٰ کا انتظار کرتے رہتے ہیں!

رفاقتِ اکرم کے ساتھ ساتھ ان کے چھوٹے بھائی کا مختصر تذکرہ کریں اور تھوڑا طبیعت کو بہلائیں۔ان کا نام اسلم تھا۔اپنے بھائیوں کی طرح اس نے بھی انگریزوں کے مدرسے میں پڑھا تھا۔شاید ایک دفعہ کہیں گر گئے تھے اس لئے اُن کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی اور ان کے چلنے میں لنگڑاہٹ صاف دکھائی دیتی تھی۔ ایک دفعہ ۱۹۴۲ء میں گپکار سے چلتے چلتے لیک ویو (Lake View) ہوٹل نہرو پارک کے قریب آئے تھے اور میں نے ان کی لنگڑاہٹ اچھی طرح دیکھ لی تھی۔ میں نے ہوٹل میں ایک افغان کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھایا تھا۔اس نے مجھے روس پر Mother Russia کتاب دی تھی جو مورس ہندس (Maurice Hindus) نے لکھی تھی۔ علی گڈھ میں بھی اس نے میرے ساتھ تین دن گزارے تھے۔ وہاں بھی ایک کتاب دے گئے تھے۔انہیں کتابوں کے ساتھ خاصی دلچسپی تھی اور وہ ہر قسم کی کتابیں پڑھتے تھے۔ یہ بڑی اچھی عادت تھی ان کی۔ وہ تیز فہم تھے۔ جنسیات پر ان کی نظر ماہرانہ تھی۔ بڑے افندی صاحب نے دوسری شادی کی تھی مگر اسلم صاحب نے جنسیات پر ایک کتاب لکھ ڈالی تھی جو بروکاز پریس سرینگر میں چھپوائی گئی تھی۔

اس کتاب کا نام ''وفات تک قوتِ باہ'' (Potency till Death) تھا۔ یہ کتاب انہوں نے والد کے نام منسوب کی تھی۔ مجھے جب اسلم کی اور ان کی اس کتاب کی یاد آتی ہے تو بلا ارادہ زور زور سے ہنسی آتی ہے۔ دنیا چھوٹی جگہ ہے نہیں۔ بیس سال کے بعد جب میں امریکہ چلا گیا تو انڈیانا کی ایک چھوٹی جگہ انڈرسن (Anderson) میں کسی کے گھر پر تقریر کی۔ وہاں عشائیہ کا انتظام کیا گیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ یہاں ایک کشمیری آتا تھا۔ انہوں نے اس کی تصویر دکھائی تو میں نے پہچان لیا کہ یہ اسلم صاحب افندی ہیں۔ تصویر دیکھتے ہیں نہ جانے مجھے کیا کیا یاد آیا اس لئے میں پھر ہنسنے لگا۔ خیر! اسلم صاحب اب پاکستان میں ہیں اور وہاں اچھا کام کر رہے ہیں۔ ان کی وہاں شادی ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ اپنے مطالعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خوش و خرم ایام گزار رہے ہوں گے۔ یہاں ایک واقعے کا تذکرہ ضروری ہے۔ تقسیم ہند کے بعد کیا ہوا اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ جنرل ڈیلوا (Delvoie) نے جو یو، این (UN) اوبزرورز (Observers) کے ہیڈ تھے۔ لائیڈز بنک سری نگر میں رحمان افندی کی الماری کھول دی اور ان کی بیوی کے ہیرے جواہرات اٹھا کر پاکستان میں افندی صاحب کے حوالے کئے۔ یہ قدم دستور کے خلاف تھا۔ جب یہ معاملہ سامنے آیا تو ملٹری اوبزرور گروپ کے ساتھ امریکیوں کا سمبندھ کٹ گیا!

روپ کرشن روپ روپہلا مرزا، خوب صورت کشمیری برہمن، زندہ دل اور تبسم پاش، ملنسار اور حوصلہ افزا، پھرتیلا اور چاق و چوبند ان کے کئی روپ تھے اور شاید اس لئے بھی روپ کرشن نام پا گئے تھے۔ میرے ساتھ کالج میں پڑھتے تھے اور انہی دنوں سے میرے دوست، میرے جانی دوست بن گئے اور اپنی سدا بہار مسکراہٹوں سے مجھے گرویدہ بنا گئے۔ ان کے پتاجی نے روپ کیلئے سنسکرت کی دنیا چُن لی تھی اور اسی میں انہوں نے پوسٹ گریجویشن پاس کیا۔ روپ کی دنیا کبھی ایک جگہ آباد ہوئی اور کبھی دوسری جگہ اُکھڑ گئی۔ وقت وقت پر انہیں اپنے روزگار کے وتیرے بدلانے پڑے مگر کبھی غم روزگار سے اپنی مسکراہٹوں

کی دنیا کھوئی نہیں۔ ان کے چہرے پر تبسّم کے پھول کھلتے رہے اور یارانِ زماں و مکان کو بہلاتے رہے۔ بدلتے ہوئے روزگار کے وسیلوں سے وہ کبھی دل برداشتہ نہ ہوئے اور نہ ان کے ساتھ ساتھ بدلتی ہوئی مکانی مشکلوں سے۔ ان کے ارادوں نے غم کا نام نہ لیا اور نہ ان کے دل نے اپنی شگفتگیاں زمہریروں کے ہاتھوں برباد ہونے دیں۔ جتنا بھی کمایا اس پر گزارہ کیا اور زیادہ کمایا تو اپنا کرشن آباد روپ خراب ہونے نہیں دیا۔ پیسہ جیب میں کم بھی ہو تو پرنس جیسے لگے اور جب زیادہ کمائی کے نشوں کی باری آئی، تب بھی اپنی ہنس مکھ ملنساری الگ تھلگ منحوس زندگی کے حوالے نہ کی۔ میں نے اُنہیں ہمیشہ زندہ باد کہا اور جب وہ چلے گئے، مجھے چھوڑ کر، میں ان کی باوقار صحبتوں کو یاد کرتے کرتے اور ان کی شگفتہ روئی کو آنکھوں میں لاتے لاتے سب غم بھول گیا۔ آج بھی روپ میرا دوست ہے اور میری زندگی کا ایک حصہ!

کالج سے نکلنے کے بعد کئی برس بعد روپ مجھے سرینگر میں ملے۔ معلوم ہوا کہ وہ ٹاٹاز بمبئی میں کام کر رہے تھے اور فلورا فونٹن (flowra fountain) کے پاس رہتے تھے۔ میں ان دنوں جامعہ میں تھا۔ بمبئی میں دمّے کے روگ نے پکڑ لیا تھا اس لئے انہیں ٹاٹاز کو چھوڑنا پڑا۔ ۱۹۵۰ء میں جب میں انگلستان جا رہا تھا تو انہوں نے مجھے مدعو کیا اور دلّی میں کچھ شامیں اکٹھے گزارنے کی خواہش کی۔ وہ اُس وقت ناروچ یونین میں انشورنس سیلز مین کا کام اختیار کرنے والے تھے۔ افندی صاحب کی طرح وہ بھی کام کے بڑے شوقین تھے۔ رُوپ کرشن کو دلّی میں دیکھنا کتنا مسرت انگیز تھا۔ وہ قابلیت اور انتظامی سُدھ بُدھ کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ ناکامیوں اور کام جوئیوں سے وہ اونچائیوں پر پہنچ گئے تھے۔ رُوپ نے ناروچ یونین کو بھی چھوڑ دیا اور کوکوکولا میں منیجر ہو گئے۔ مگر کوکوکولا کو ترقی کی راہ پر لگا دیا اور منیجری چھوڑ دی۔ پھر اور کام کئے یہاں تک کہ پھر کشمیر آئے، انشورنش شروع کیا، بیماروں کی مدد کی، جو لوگ مر گئے ان کے وارثوں کے کام کئے مگر ہمیشہ خلوص اور ضمیر کی راہبری سے آگے بڑھتے رہے۔

۱۹۵۵ء کا زمانہ ہے۔ میں سسرال میں زندگی کے ایام گذار رہا ہوں۔ بارش ہو رہی ہے اور ساڑھے نو بج چکے ہیں۔ مرزا آ گئے اور فوراً پیچ کش اور کچھ اور سامان نکال کے بیٹھے موٹر سازی کرنے۔ مطلب یہ کہ ان کی موٹر میں پیدا ہو گیا تھا رخنہ اور وہ پڑھنے لگے اپنا ہاتھ جگن ناتھ کا منتر۔ پھر ہم ساتھ چلے اور سیدھے سینما ہال میں گھس گئے۔ فلم شروع ہو گئی اور روپ سسکیاں بھرنے لگے، بچے کی طرح۔ فلم نے ایک نئی دنیا ہمارے سامنے کھول کے رکھدی۔ میں نے دیکھا اس کا رومال آنسوؤں سے بھیگ گیا، اپنا رومال نکال کے دیدیا مگر ان کے جذبات کا تلاطم رُک نہ سکا۔ ستیہ جیت رے کی فلم تھی پاتھر پنچلی۔ ہم سب مبہوت رہ گئے۔ یقین کیجئے جب ہم باہر آ گئے تو میں کناٹ پیلس پہچان نہ سکا۔ میں نئی دنیا میں پہنچ چکا تھا۔ روپ نے گھر سے کناٹ پیلس اور کناٹ پیلس سے پھر گھر (اوکھلا) ہمیں موٹر میں پہنچادیا۔ فلم ہمارے اعصاب پر سوار تھی اور مُوڈ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ روپ کرشن تھے یا انسان، اس کا اندازہ کرنے کیلئے ان کا طرزِ عمل اور ان کی شفقت! وقت گزرتا گیا۔ جب میں ٹیچرس کالج سرینگر کا پرنسپل تھا، میں نے کچھ فلمیں پلیڈیم سینما کے ذریعے منگوائیں اور اپنے شاگردوں کو دکھلائیں۔ پاتھر پنچلی، اپارجیتو، اپُر سنسار، دوبھیگہ زمین ان میں قابلِ ذکر ہیں[1]۔ روپ کرشن کی روح ہندوستانی سمینا کا شخصیت ساز پیام ہمارے زیرِ تربیت اُستادوں تک پہنچا رہی تھی اور اس طرح انسانیت ساز عمل میں مشغول تھی۔

۱۹۸۹۔۹۰ء میں روپ نے سیاہ رنگ کی ایمبسی ڈر موٹر خریدی تھی۔ وہ بہت اچھا کام چلا رہے تھے۔ اس نے کشمیر میں قلیل عرصے میں کروڑوں روپے کا بیمہ کرایا تھا۔ ان کے خریدار اونچے لوگ تھے۔ رُوپ عمدہ شخصیت اور دل جیت تھے اس لئے خریدار ان کی جھولی میں پڑتے تھے۔ مگر وہ پھر مدراس چلے گئے اور وہاں اور اور چیزوں کے ساتھ طالع آزمائی شروع کی۔ ان میں ایک چیز زعفران تھی۔ میں ہارمنی۔ ۳ راجباغ سے شوپورہ مکان میں

۱۔ ''اوپارجتو'' نام میں شک ہے، تاہم۔

منتقل ہوا تھا۔ ایک دن میں سخت بیمار ہوا۔ شاید گردوں میں کوئی تکلیف ہوئی تھی۔ پیشاب تک رُک گیا تھا اور میں عذاب میں مبتلا تھا۔ ہندوستانی فوج کے ایک ڈاکٹر علاج کر رہے تھے۔ انہوں نے کلورافینی کال کھانے کو دیا تھا۔ میری علالت کا اٹھواں دن تھا کہ روپ کرشن مرزا نمودار ہوئے۔ میں بہت ناخوش تھا بلکہ دو دفعہ غسل خانے میں بھی گر گیا تھا۔ روپ نے کہا "کیا حالت بنا رکھی ہے اپنی، اٹھو اور میرے ساتھ چلو"۔ مجھے موٹر میں بٹھایا اور لے گیا مجھے ڈاکٹر سیٹھی کے پاس۔ سیٹھی صاحب پیشہ ور ڈاکٹر نہیں، اختیاری خدمت گار تھے اور بیماروں کا علاج کرتے تھے۔ لٹل سنز (Little Sons) موٹرس کے پاس اُن کا ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں ہومیوپیتھی کے ساتھ وہ شغل فرما رہے تھے۔ ہمارے سیٹھی صاحب کے ساتھ خاندانی تعلقات تھے۔ پہلے اُنہوں نے مجھے کچھ دوائیاں دیں تاکہ جراثیم کش (antibiotics) کا اثر جاتا رہے۔ انہوں نے کہا کہ دو گھنٹے کے بعد پیشاب پورے کا پورا کھُل کے باہر نکل آئیگا۔ ہوا بھی ایسا ہی! میں نے ہفتے سے زیادہ تکلیف اٹھائی تھی اور بہت زیادہ اسلئے سیٹھی صاحب کا بار بار شکر بجالاتا رہا۔ مگر روپ مسکراتے رہے اور میری تکلیف کا پسماندہ اثر رفع کرتے رہے۔ ان کی مسکراہٹ رفع ضرر بھی تھی اور شادابی کا آسان ذریعہ بھی۔

روپ کرشن مرزا کی گھر والی کتنی اچھی ساتھی تھی روپ کی۔ سوما اس کا نام اور اس نام کے معانی کتنے گہرے۔ اس نے اپنی پتی ورتا کے ساتھ بہت خوش اُسلوبی سے زندگی گزاری اور سکھ دکھ، دھوپ چھاؤں میں روپ کے ساتھ ساتھ رہی اور ساتھ نبھاتی گئی۔ ان کے ایک بیٹے نے بنارس میں انجینئرنگ کی تعلیم پائی۔ خوب رو پنڈت نے خوب رو پنجابی لڑکی کے ساتھ بیاہ کیا۔ شادی دھوم دھام سے یہاں سرینگر میں ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ روپ نے کشمیری برہمن دعوت کا انتظام پہلی دفعہ کیا تھا مگر ان کا سٹائل مغربی تھا۔ روغن جوش، قبرگاہ اور دوسرے لذیز کھانے کھائے جا رہے تھے مگر ارد گرد شمعیں جل رہی تھیں۔ یہ سب راجباغ میں ہو رہا تھا جہاں روپ کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ یہ بیٹا زعفران

کے بعد چمڑے کے کام میں جُٹ گیا تھا، اٹلی چلا گیا تھا اور پھر فرانس۔ مدراس میں وہ ہندوستانیوں کو سکھا رہا تھا کہ کس طرح عمدگی کے ساتھ چمڑا تیار ہوسکتا ہے اور پھر کیسے نفیس نفیس چمڑے کی چیزیں برآمد کی جاسکتی ہیں۔ دوسرا بیٹا بھی انجینئرنگ میں آباد ہوا۔ یہاں کے ایک آئی اے ایس آفیسر کی بیٹی کے ساتھ ان کی شادی ہوئی تھی۔ روپ کے خوش حال بیٹے دیکھ کر میری خوشی میں اضافہ ہوتا تھا۔

جب علم و فضل متانت اور عاجزی کے ساتھ ہمکنار ہوجاتے ہیں تو ایک ایسے شخص کے بنیادی نقوش سامنے آتے ہیں جن کا نام داؤد رہبر ہے۔ میں انہیں عظیم دوست کی حیثیت سے جانتا ہوں اور وہ بھی اوائل عمر سے۔ ان کا مکان ہمارے مکان کے ساتھ ہی ماڈل ٹاؤن لاہور میں تھا۔ داؤد صاحب کے والد کیمبرج کے پہلے ڈاکٹر آف فلاسفی تو نہیں مگر جن لوگوں نے پہلے یہ ڈگری حاصل کی ان میں وہ شامل ہیں۔ کرسٹن سین (Christensen) نے فرانسیسی زبان میں ایک مشہور کتاب لکھی تھی جس کا نام Iran under the Sassanians تھا۔ داؤد صاحب کے والد نے اس کا اُردو ترجمہ ''ایران بعہد ساسانیاں'' عنوان کے تحت کیا۔ اس پر انہیں ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری ملی۔ اس کتاب کو ''لیڈن'' نے چھاپا۔ لیڈن کے ہاتھوں انسائیکلو پیڈیا آف اسلام بھی چھپ چکا تھا۔ داؤد کے والد کا اسم شریف شیخ محمد اقبال تھا۔ یہی نام شاعرِ مشرق کے لئے بھی چنا گیا تھا۔ وہ تمام عمر فارسی کے پروفیسر اور بعد میں اورینٹل کالج لاہور کے پرنسپل کے عہدے پر فائز رہے۔ ان کی شخصیت بڑی جاذب تھی۔ اس میں حسن ہی حسن تھا مگر وہ حقہ خوب پیتے تھے۔ شیخ صاحب کے پانچ لڑکے اور ایک صاحبزادی تھی۔ شیخ صاحب نے لڑکوں کے نام پیغمبروں سے مستعار لئے تھے۔ اسحاقؑ، یعقوبؑ، ایوبؑ، داؤدؑ، الیاسؑ۔ داؤد صاحب شیخ صاحب کے ساتھ ٹہلنے جایا کرتے۔ باپ کا خیال تھا کہ داؤد مشرقی علوم میں نام کمائیں گے اور ان کی راہ اختیار کریں گے۔ اسحاق صاحب ڈاکٹر بن گئے اور یعقوب صاحب فزیکس کے

پروفیسر۔ کچھ دیر ہارورڈ میں رہنے کے بعد وہ اوہائیو (Ohio) پہنچ گئے تھے۔ میں واشنگٹن یونیورسٹی میں ۱۹۶۱ء میں ان کے پاس چلا گیا تھا۔ یہ یونیورسٹی سینٹ لوئس میں واقع ہے۔ یعقوب صاحب کشمیر بھی آئے تھے۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔

داؤد رہبر صاحب بائیس سال پہلے امریکہ میں مجھ سے پھر ملے اور ہماری لڑکپن کی دوستی پکی دوستی میں بدل گئی۔ ان کی کہانی پرکشش ہے۔ انہوں نے کیمبرج یونیورسٹی میں فلسفۂ قرآن پر تحقیق کی۔ ان کے مقالے کا نام ''اللہ انصاف کا خدا ہے'' (Allah, the God of Justice)۔ یہ کتاب لیڈن (Leiden) نے چھاپی ہے جو صرف معیاری کتابیں چھاپتا ہے۔ پروفیسر الفرڈ گیوم (Alfred Guillaume) ایک نامور مستشرق (Orientalist) ہیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ تفسیر قرآن پاک کی دوسری تفسیروں سے مختلف اور معیاری ہے۔ داؤد صاحب کیمبرج میں ہی لیکچرر ہو گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب چرچل دوبارہ آئے تھے اور امریکہ کی طرف سے برطانیہ پر دباؤ پڑ رہا تھا کہ وہ پھر سے فوجی اعتبار سے تیار ہو جائے۔ لازماً قیمتیں بڑھ گئی تھیں جس سے دشواریاں پیدا ہو گئی تھیں۔ ۱۹۵۲ء میں داؤد کا عہدہ ختم کر دیا گیا۔ پس اُنہوں نے اپنی سب کتابیں سمیٹ لیں اور ایک سو صندوقوں میں بند کر کے لاہور پہنچا دیں۔ اُن کا پہلا قدم یہ تھا کہ یہ سب کتابیں عطیے میں دیدیں۔ ان کتابوں میں اٹلی کے معروف مستشرق کائے ٹانی (Caetani) کی کتابیں بھی تھیں۔ داؤد صاحب کام کا انتظار کر رہے تھے کہ لاہور میں ایک اسلامی اجتماع ہوا۔ پاکستان وجود میں آیا تھا۔ خیال تھا کہ اجتہاد کے بعد ایک نئے رنگ کا اسلام وجود میں آئیگا جس سے اسلام کی اصلی حیثیت بحال ہو جائے گی۔ بے چارے داؤد رہبر نے اس اجتماع میں مقالہ پڑھا۔ مسئلہ تھا قرآن میں نسخ یعنی ایک آیت دوسری آیت کو کس طرح منسوخ کرتی ہے۔ اجتماع میں دنیا کے مختلف حصوں سے لوگ آئے تھے۔ مثلاً پروفیسر کینٹول سمتھ (Cantwell Smith)، پروفیسر لوئی مسی نون (Louis Massignon)، پروفیسر ہنری قوربان Henri Corbin۔

اب دیکھئے مشرق وسطیٰ کا ایک شخص مشرقیت کا علم بردار کھڑا ہو گیا اور بول اُٹھا کہ اس مقالے کو دور پھینک دو۔ یہ اجتماع کی کارروائی میں شامل نہیں ہو سکے گا۔ ایسے (معترض) لوگ اسلام کو بحیثیت ایک عالمی تاریخی تحریک سمجھ نہیں پاتے۔ یہی لوگ سب چیزوں میں خلل پیدا کرتے ہیں۔ مسی نون، سمتھ اور قوربان نے کہا مقالے کو منسوخ کرنے کا مطلب کیا ہے؟ چلئے اس پر بحث کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس کا وزن کیا ہے۔ مگر اسی دن شام کو افضل حسین وائس چانسلر داؤد صاحب سے ملے اور انہیں کہا کہ ٹرکی کا ٹکٹ لے لو اور وہاں انقرہ میں اُردو کی پروفیسری کرو۔ پس داؤد کو پاکستان سے چلے جانے کا وقت آیا۔ یہ بڑا عجیب وغریب اتفاق تھا کہ داؤد جیسے عالم وفاضل آدمی کو پاکستان سے نکال دیا گیا۔ اُسے تو ٹرکی میں بھی نہ چھوڑا گیا۔ وہاں پاکستانی سفارت خانے نے اس کا قافیہ تنگ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ داؤد صاحب نے یروشلم میں ایک مسیحی مبلغ کینتھ کریگ کے ساتھ رابطہ پیدا کیا کہ وہ عیسائی مذہب اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ کینتھ نے اسے ٹال دیا مگر داؤد بھی کہاں رُکنے والے تھے۔ ایک دن انقرہ یا استنبول کے ایک چرچ میں چلے گئے اور عیسائی مذہب اختیار کیا۔ یہ اس کے باوجود ہوا کہ اس نے اسلام پر بہت کام کیا تھا۔ مثلاً اس نے براؤن (Brown) کی کتاب فارس کی تاریخ کا اُردو ترجمہ کیا۔ حالانکہ اس وقت داؤد ایم۔اے کی تیاری میں مصروف تھے۔ وہ اُردو میں شعر بھی لکھتے تھے اور کلاسیکی موسیقی کے مانے ہوئے گویّے تھے۔ اُستاد فیاض خان صاحب کے ساتھ ان کا یارانہ تھا۔

میں ۱۹۶۰ء میں فل برائٹ گرانٹ پر امریکہ چلا گیا۔ وہاں میں نیو ہیون (New Haven) چلا گیا جہاں داؤد ٹھہرے تھے۔ وہ وہاں ہارٹ فورڈ سمینری فاؤنڈیشن (Hartford Seminary Foundation) میں لیکچرر تھے۔ میں بہت خستہ خاطر ہوا جب سنا کہ ان کے گھرانے میں شدید مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ ان کی بیگم پر مائیکے والوں کی طرف سے عتاب نازل ہوا تھا۔ کرسچن کی وجہ سے ان کے ساتھ سارے تعلقات ختم

کر دئے گئے تھے۔ ان کے والدین بوڑھے تھے اس لئے بھی وہ اپنا ذہنی توازن کھو چکی تھی۔ رہبر صاحب کی دو بیٹیوں پر بھی اس کا اثر پڑ گیا تھا۔ نیز رہبر صاحب کے ساتھ امریکہ میں بھی وہ برتاؤ نہ کیا گیا تھا جس کا وہ مستحق تھا۔ تاہم باسٹن میں وہ تقابلی مذہبیات (Comparative Religion) کا پروفیسر بنا اور وہ وہاں پچیس سال ٹھہرا۔ وہ موسیقی پر مجالس (Symposia) مذاکرات کراتا تھا۔ اُردو ادب پڑھاتا تھا، مولانا رومی سے طلباء کو روشناس کراتا تھا اور اسلام کی تہذیبی حقیقتوں میں اس طرح جذب ہو گیا تھا کہ ایک خوشبودار فضا قائم ہوئی تھی۔ اُن کے شاگرد اُن کی طرف کھینچ جاتے تھے اور مسلمان مذہب اختیار کرتے تھے۔ ایک مثال مسوڈونیا (Macadonia) کے ایک طالب علم کی ہے جو مسلمان بن گیا۔ شاید اس وجہ سے داؤد رہبر زیادہ مقبول یا محبوب نہ ہوئے۔ ستم ظریفی یہ کہ خود ترکِ اسلام کر بیٹھے تھے۔

امریکہ میں دعوتیں ہوتی رہتی ہیں۔ داؤد رہبر صاحب اپنے تہہ خانے میں جہاں اس کی رسوئی تھی، خود اپنے ہاتھوں سے کھانا پکاتے تھے اور ہر جمعرات کو بیس بیس تیس تیس لوگوں کو دُوپہر کے کھانے پر بلاتے تھے۔ یہ لوگ یا اس کے ساتھی ہوتے تھے یا شاگرد۔ وہ خود میز کرسیاں لگاتے تھے، فرش پر قالین بچھاتے تھے اور تکیے لگاتے تھے۔ انسان حیران ہو جاتا تھا یہ دیکھ کر کہ اسے کسی نے بھی کبھی کھانے پر نہ بُلایا مگر وہ لوگوں کو جوق در جوق بلاتا ہے۔ اور یہ صداقت ہے!

پاکستان میں داؤد رہبر کی سب کتابیں چھپ گئیں۔ ان میں اُردو غزل کی ایک ضخیم کتاب شامل ہے جو اس کے ایک دوست نے چھاپی ہے۔ پاکستان نے اسے دعوت دی کہ وہ امریکہ تشریف لائیں اور تقابلی مذہب پر سلسلہ وار لاہور میں تقاریر کریں۔ انہوں نے چینی مذہب، بدھ ازم، ہندو دھرم، عیسائیت اور اسلام پر تقریریں کیں جو چھپ گئیں۔ ''کلچر کے روحانی عناصر'' اس کتاب کا عنوان ہے جس میں یہ تقریریں چھپ گئی ہیں۔ میں نے

اس کتاب کی کئی کاپیاں فوٹوسٹیٹ کروائیں اور اپنے دوستوں میں بانٹ دیں۔ جب داؤد صاحب تقابلی مذہب پر بول رہے تھے تو ایک صاحب نے کہا کہ انہوں نے ترکِ اسلام کیوں کیا۔ داؤد صاحب نے جواب دیا کہ اگر اس نے ترکِ اسلام نہ کیا ہوتا تو اسے تقابلی مذہب پر خطاب کرنے کی دعوت نہ دی جاتی۔ وہ اصلی بات بتانا نہیں چاہتے تھے مگر حاضر جوابی سے بھی ایک بات واضح ہوئی کہ خاص سوالوں کا خاص جواب کس طرح دینا چاہیے۔ حاضر جوابی کی ایک اور مثال یہ ہے کہ ایک دن وہ اپنے بڑے بھائی سے ملنے گئے جو فزیکس میں پروفیسر تھے۔ اُن سے کہا کہ وہ حرارت کی کمی Low Temperature پڑھاتے ہیں؟ انہوں نے کہا "ہاں"۔ داؤد صاحب نے کہا پھر ہمیں آئس کریم کھانی چاہیے۔

میں جب بھی امریکہ جاتا ہوں تو داؤد صاحب سے کئی بار ملتا ہوں۔ کبھی ہفتہ بھر ان کے پاس ٹھہرتا ہوں اور اکثر ڈیڑھ ڈیڑھ گھنٹے تک ان کے ساتھ ٹیلی فون پر باتیں کرتا ہوں۔ وہ اب فلوریڈا (florida) میں اپنے بقیہ ایام گزار رہے ہیں۔ آج کل اپنے والد صاحب کی سوانح عمری نفسیاتی زاویہ نگاہ سے لکھ رہے ہیں۔ ئیل یونیورسٹی (Yale University) کے ایک پروفیسر کو جانتے ہیں جنہوں نے انیسویں صدی کی تاریخ لکھی ہے۔ کتاب کی تمہید میں لکھا ہے کہ اس تاریخ کی بنیاد تحلیل نفسی ہے۔ (psychoanalysis) یہ بڑا شاندار کارنامہ ہے جو پانچ جلدوں پر مشتمل ہے۔ میرا خیال ہے کہ داؤد صاحب نے ہندوستانی موسیقی کی تاریخ بھی لکھی ہے۔ اس کا عنوان ہے "باتیں کچھ سریلی سی"۔ عنوان سے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ داؤد صاحب نے اس کتاب کی رگوں میں کیا بھر دیا ہوگا۔ میں نے اس کتاب کو جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے پریس لبرٹی آرٹ پریس میں چھپوایا تھا۔

داؤد کا کام بہادرانہ ہے۔ ان کی بیگم پچھلے تیس سال سے دماغ کے عارضے میں مبتلا ہے اور وہ اس کی دیکھ بال اور تیمارداری خود کرتے ہیں۔ وہ اپنے یک منزلہ مکان میں اب

نہیں رہتے۔ وہاں وہ آزادانہ طور پر رہتے تھے۔ اب وہ اپارٹمنٹ میں رہتے ہیں۔ انہوں نے اپنی بیٹی کے لئے بھی اپارٹمنٹ خریدا ہے۔ ان کا سب سے بڑا اثاثہ ان کی شاندار لائبریری ہے۔ نہ جانے وہ اس لائبریری کو کس طرح کام میں لائیں گے۔ نامساعد حالات مذہبی تنگ نظری نے پیدا کئے ہوں تو ان میں انسان گھٹ کے رہ جاتا ہے۔ پاکستان نے اپنی تنگ نظری سے ایک قیمتی ہیرا کھو دیا ہے۔ لوئی مسی نان کا کہنا بجا ہے کہ جو مذہب اپنے عروج کے دوران رواداری اور دریا دلی کی شاندار مثال پیش کر رہا ہے، اب اپنے مفکروں کو پاکستان جیسے خطوں میں بے قدری کر رہا ہے۔

چلئے پھر بقول اقبال برہمن زادگان زندہ دل کی بات کرتے ہیں۔ اِس وقت میرے سامنے وہ خوبصورت اور بے حد ذہین رفیق اور شفیق پنڈت ہیں جنہیں بھارت کے لوگ اچھی طرح جانتے ہیں مگر جنہوں نے بین الاقوامی سطح پر بھی اپنا اور اپنی جنم بھومی کشمیر کا نام روشن کیا ہے۔ پنڈت پی، این، درکنہ کدل سرینگر میں پیدا ہوئے۔ ان کے پتا جی شری وشن حکیم شیخ باغ سکول امیرا کدل میں ہیڈ ماسٹر تھے اور اپنے سادہ مکان میں سکونت کرتے تھے۔ زندگی کے ایام گزار رہے تھے مگر سیدھے سادھے طریقے پر۔ اس میں نہ امارت کا عمل دخل تھا اور نہ عیش کوشی کا کوئی امکان مگر ایسا لگتا ہے کہ علم و دانش اور فکر و نظر کی رحمتیں اس گھرانے پر نازل ہوئی تھیں جن کی آبیاری وشن صاحب نے کی ہوگی۔ شیخ باغ سکول کی ہیئت کا کیا کہنا۔ جس سکول کی بنیاد کینن بسکو نے ڈالی ہو اور جہاں مکمل شخصیت کی تعمیر کے ترانے لمحہ لمحہ سکول کے اندر اور باہر بج رہے ہوں، وہاں دل و دماغ کی شادابی و سرفرازی کے نغمے نہ پھوٹتے ہوں تو پھر کہاں۔ وشن صاحب نے شیخ باغ کے اثرات اپنے گھر لائے ہوں گے اور پی این درصاحب نے پہلے ہی سے ان اثرات کو کسی نہ کسی طرح قبول بھی کیا ہوگا۔ اور پھر یوں بھی استادوں کے بچے دنیاداری سے زیادہ سیرت سازی کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ انہیں خارجی رنگ ڈھنگ زیادہ بھاتا نہیں اور وہ دائمی قدروں کی طرف توجہ

دیتے ہیں۔اس دنیا میں جہاں اب مالداری اور اشیاء پرستی کا بول بالا ہے، اس طرزِ زندگی میں پلے ہوئے انسان غنیمت ہیں اور ان کی قدر کرنی چاہیے۔

پی این در صاحب مجھے ایس پی کالج میں ملے اور کالج کے شوقین دنوں سے ہی میں نے ان کی فہم وفراست کو پسند کرنا شروع کیا۔ دن کٹتے گئے اور ہمارے تعلقات پختہ ہوتے گئے۔ میں ہسٹری کی طرف زیادہ مائل تھا اور وہ معاشیات کی طرف اور اسی افتادِ طبع نے مجھے علی گڈھ ہسٹری میں ایم اے کیلئے بھیجا اور انہیں ہندو کالج دہلی معاشیات میں پوسٹ گریجویشن کیلئے۔ در صاحب دلّی جانے سے پہلے ہمارے گھرانے کے ساتھ کچھ اس طرح جُڑ گئے کہ میری والدہ بی اے پاس کرنا چاہتی تھی مگر پہلے ہی سال فارسی میں فیل ہوگئی۔ دوسرے سال وہ اپنے بڑے بیٹے ناصر صاحب کے ساتھ پھر بی اے میں شامل ہوئی مگر پھر فیل۔ اس دفعہ معاشیات میں۔ در صاحب کو بلایا گیا کہ وہ مدد کریں۔ انہوں نے والدہ کو معاشیات کے عُقدے سمجھائے اور وہ تیسری بار پاس ہوگئی۔ در صاحب کا آنا جانا بھی ہماری دوستی کا رنگ وروپ بن گیا اور ہم دونوں نزدیک آتے گئے۔ ان دنوں در صاحب کٹر پن کا شکار تھے۔ دودھ کا گلاس ہم سے ضرور لیتے تھے مگر رومال سے گلاس پکڑ لیتے تھے۔ غذا وغیرہ کھانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مگر دلّی میں ان کی قلب ماہیت ہوئی اور شاید وہ مسلمانوں کی غذاؤں میں بھی پاک پاکیزگی دیکھنے لگے۔ ایک سال دلی میں رہ کر، زندگی کے اسباق ذرا کھلے طور پر پڑھ کر ان کا دل بدل گیا۔ کشمیر آئے اور ہمارے گھر میں کھانا کھایا۔ اب دوستی بھی اکٹھے کھانے پینے لگی اور لذّتِ اکل وشرب سے محظوظ ہونے لگی۔ ہمارے گھرانے کے ساتھ در صاحب کے تعلقات کا ایک اور پہلو یہ بھی تھا کہ ہم تینوں بھائی ان کے نزدیک آگئے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ جب ناصر صاحب کو مباحثے میں حصہ لینا تھا تو انہوں نے ان سے مدد مانگی۔ عنوان گو کہ ہندوانہ نہ تھا، پھر بھی در صاحب نے خود بھی مصطفےٰ کمال پاشا پر کتابوں سے مواد لیا اور ناصر صاحب کو پہلا انعام پانے کی

خاطر تیار کیا۔ یہ انعام کس کو ملنا چاہیے تھا۔ مجھے معلوم نہیں مگر دوستی میں جسم و جان مل جاتے ہیں اور انفرادیت سے زیادہ وصل دل کی بلندیاں سامنے آجاتی ہیں۔ ناصر صاحب اور در صاحب ان بلندیوں پر پہنچ گئے ہوں گے اور شوکت صاحب کو بھی ساتھ لئے۔ میں یہ لکھ رہا ہوں اور ہمہ تن مصروف اجتماعی دوستی کے اثمار کھا رہا ہوں جو فردوس بریں کے اثمار سے کچھ کم رسیلے، میٹھے اور جان فزا نہیں۔

دلی میں ہماری دوستی اور بھی پھلی پھولی اور میں سمجھتا ہوں کہ نکھر گئی۔ میں جامعہ پہنچ چکا تھا اور در صاحب ہندو کالج میں لیکچرر ہو گئے تھے۔ ہم ایک دوسرے کے پاس آنے جانے، کھانے پینے لگے تھے۔ در صاحب گورَ ہال کے وارڈن بھی تھے۔ اب کتابیں پڑھنے اور وسیع دنیا میں گھسنے کا موقع بھی آیا تھا۔ پہلے پہلے در صاحب کتابیں دینے میں ذرا بخل سے کام لیتے تھے۔ مگر بعد میں اس میں بھی ان کے قلب کی حالت بدل گئی۔ میں نے جب شیولانکر کی کتاب ''مسئلہ ہندوستان'' (Problem of India) ان سے لی اور پڑھی، تو میرا ذہن کھل گیا۔ میں نے ہندوستان کا بنیادی مسئلہ سمجھ لیا۔ اس کے بعد انہوں نے مجھے ارک فرام کی ''آزادی کا خوف'' دی۔ یہ کتاب بھی میرے لئے ایک بنیادی کلید کا کام کر گئی۔ در صاحب کتابیں نہیں دیتے تھے۔ میں نے یہ دونوں کتابیں کبھی واپس نہیں کیں۔ اب بھی انہیں اپنے پاس رکھے ہوئے ہوں۔ در صاحب کی الفت کا مزہ اٹھانے کیلئے بھی اور کتابوں کی کلیدی اہمیت کیلئے بھی۔ در صاحب نے مجھے بھی برہمن بنا دیا جو علم ذرا سینے میں ہی چھپائے رکھتے ہیں۔ مگر ہم دونوں بائیں بازو کے خیالوں میں غرق ہو گئے اور پھر کنارے پر آکر اس کی مہیب لہروں کے تماشائی بھی بن گئے۔

بڑھاپے کی نسیانی علت سامنے نہ آئے اور میں بھول نہ جاؤں تذکرہ شیوراج بہادر کے گھر کا جس میں در صاحب کا بیاہ آسمانی دیوتاؤں نے لکھا تھا۔ شیوراج جی بڑے تاجر تھے اور دلّی کے کیستھ خاندان کی آبرو۔ مجیب صاحب نے ان کے بارے میں ہی ایک دفعہ

کہا تھا۔

یہ دنیا ایک مسافر خانہ ہے جس میں کبھی کبھی ایسا آدمی پیدا ہوتا ہے
جس کی وجہ سے یہ تھوڑی دیر کیلئے گھر معلوم ہونے لگتا ہے۔

اسی بیاہ کا نتیجہ ان کی لاڈلی اور نامور بیٹی شیلا در ہے جن کی قابلیت اور اہلیت کی ترجمانی مادام یا شریمتی جیسے تکلفاتی مگر تمدنی کلمات بھی کر نہیں سکتے۔ کوئی رادھا اب بھی اس طرح اُبھرتی ہے کہ اپنے دلی کیفیات سے شرابور کرتی ہے! شیلا جی کا کولمبیا یونیورسٹی میں پنپتا ہوا انگریزی ادب کا شدتِ احساس اس کے جذبوں کو سنوارتا نکھارتا تو ہوگا ہی مگر اُن کی انگلیوں کی فنی قدرت اتنی رقت انگیز ہے کہ اصغر گونڈوی اور غالبؔ کے اشعار بھی کلاسکیت کے نشے میں جھومتے ہیں۔ میں نے ان کی آواز میں ہندوستانی موسیقی کے بڑے خاں صاحب بھی کروٹیں بدلتے ہوئے پائے اور میں موسیقی کے بحر ہند میں ڈوب گیا۔ یہ پُتری در صاحب کی دین ہے ہندوستان کو مگر ہندوستان سے باہر بھی نغمہ و ناز کے پرستاران کی قدر کرتے ہیں۔ کنہ کدل کا یہ پنڈت گھرانہ کتنی بلندیوں پر پہنچ گیا، اس کا اندازہ چند ایک صفحات میں لگانا مشکل ہے۔ روغن جوش، قبرگاہ، قہوہ اور ساگ اور ان کے بیچوں بیچوں شیوراتری کی لذت پرور مچھلیاں ضرور کام آتی ہونگی ذائقوں سے، لطافتوں اور چاشنیوں سے اس اہلیت کو اُبھارنے میں جس نے ایسی بلندیاں چھولیں!

در صاحب کو معاشیات کی نظروں سے دیکھیں کہ جنہوں نے ڈائریکٹر آف انسٹی ٹیوٹ آف اکنامک گروتھ Director of Institute of Economic Growth میں شاندار کام کر کے پی این ہکسر کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی یا ماہرانہ صلاحیتوں کے آئینے میں جنہوں نے انہیں شریمتی اندرا گاندھی کے اتالیقی منصبوں پر بٹھادیا، اسی اندرا جی کے جس کے بارے میں اٹل بہاری باجپائی کے منہ سے دُرگا کا نام نکل گیا تھا۔ یہ نہ ہوگا کیا کہ ہم بین الاقوامی سطح پر اُن کو اُسی طرح دیکھنے لگیں جس طرح اقوام متحدہ کے سیکریٹریٹ میں

دنیا کے لوگ اُنکو دیکھتے تھے اور ان کے عروج پر تحسینی کلمات پڑھتے تھے؟ تاہم ہمہ جہت شخصیت سے ہم کو کیا غرض کیونکہ ہمیں تو دوستی کے جام پی پی کر درصاحب کی گرمئی جذبات کے بھی مزے لوٹنے ہیں اور ہمیشہ۔ اس کے علاوہ ان کے ساتھ فکری ہم آہنگی کے فیض اُٹھانے ہیں۔ درصاحب نے اندراجی کے ساتھ وفا کیا کیونکہ ان کے ساتھ ہی ۱۹۷۷ء میں مستعفی ہو گئے مگر میرے ساتھ وفاؤں کا پیماں کچھ اور تھا جواب بھی ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ ہم نے غریبی میں نام پیدا کرنے کا عہد بھی کیا تھا۔ اپنے اعمال سے درصاحب نے اس عہد کو بھی نبھایا۔ جب ریٹائر ہوئے تو ان کے بینک کھاتے میں صرف ۶۶ روپے موجود تھے۔

کیوں نہ اب اس یار کا ذکر چھیڑیں جس کا بار کشمیر یونیورسٹی کبھی اُٹھا نہ سکی، بالکل اسی طرح جس طرح میرا بار بھی اس کیلئے گراں گزرا۔ ہماری اس یونیورسٹی میں گائیں چرائی جاتی تھیں جن کا دودھ ہمارے ایک وائس چانسلر صاحب پیتے تھے اور ''توزک بابری''[1] کا ''یہاں تو بھینس ہی بھینس ہے'' کا فقرہ ورد کرتے تھے، مگر خواب میں۔ شعوری زندگی میں وائس چانسلر صاحب نہ بابر سے واقف تھے اور نہ اس کی توزک سے۔ میں قاضی غلام محمد صاحب مرحوم کا ذکر کر رہا ہوں جو یونیورسٹی کے معاملات پر بھی ہنساتے تھے اور ''اسہِ گورمبال لگے'' پر بھی۔ ''اسہِ گورمبال'' کا مطلب یہ ہے کہ ہم نہ اِدھر کے رہے اور نہ اُدھر کے۔ اِدھر اُدھر جاتے جاتے ہم اصلیت بھی کھو بیٹھے۔ ہم نے ہنسی مذاق کے ساتھ ریاضی کے مشہور پروفیسر قاضی صاحب کا تذکرہ کیا تاکہ اُن کے انداز سے فائدہ اٹھائیں جو ریاضیات کے مسائل کی مشکلوں کا حل ہلکی پھلکی باتوں سے بھی ڈھونڈھتے تھے۔ یہ باتیں ہر وقت اُن کی زبان پر چڑھتی تھیں اور ہنستے ہنساتے سوچنے پر بھی مجبور کرتی تھیں۔ قاضی صاحب کے دوست اور ان کے شناسا اُنہیں دیکھتے ہی محظوظ ہوتے تھے اور جانتے تھے کہ

۱۔ توزک بابری ظہیر الدین بابر کی مشہور زمانہ کتاب ہے۔ بابر بانی سلطنت مغلیہ ہے اور اپنی ہمہ گیر شخصیت کا تذکرہ توزک میں کر چکے ہیں۔

ان کی زبان سے کوئی نہ کوئی پتے کی بات سنیں گے، سنجیدہ نہ سہی ظریفانہ ہی سہی۔ مگر ان کے ظریفانہ کلام میں بھی سنجیدگی ہوتی تھی اس لحاظ سے بھی وہ یونیورسٹی کے چکوروں میں اپنے دائرے فٹ نہیں کر سکتے تھے۔ اس یونیورسٹی کا نام ظرافت یونیورسٹی رکھا جائے تو بہتر ہے، ظرافت بھی ایسی جو مسخرے پن کے ساتھ مل جاتی ہو۔

قاضی غلام محمد تین اضلاع سے اپنا مثلث بناتے تھے، ریاضیات کا تجزیہ، مرزا اسد اللہ خان غالبؔ اور کرکٹ مگر ان کی شخصیت تکونی نہیں، ہمہ جہتی تھی۔ علامہ اقبال، بلبل شیراز شمس الدّین حافظ اور لیوناڈو ڈونچی سے بھی ان کی خاصی دلچسپی تھی جس سے اُن کا ناطہ فلسفہ، ادبیات اور فنِ مصوری کے ساتھ جڑ جاتا تھا۔ جس جس میدان میں ان کے گھوڑے دوڑتے تھے۔ وہاں چوگان ہستی کے کرتب سامنے آتے تھے۔ مان لیا کہ ریاضیات نے ان کی ذہنی دنیا آباد کی تھی، سوچنے اور سمجھنے سے، تنقید کی موشگافیوں سے، ترتیب[1] تحلیل[2] اور ترکیب[3] استقرا[4] اور استخراج[5] سے، منطق سے اور جوڑنے کی کیفیات سے۔ یہ بھی مان لیا کہ ریاضیات اور فلسفے میں بہت پُرانے رشتے موجود ہیں اور نئے نئے رشتے پیدا ہو گئے ہیں۔ مگر ان کی قیمتی فنی اور ادبی دلچسپیاں اور ان کی تحسین آمیز نکتہ رسیاں کس چشمۂ حیات کے ساتھ جوڑ دیں؟ یہاں تو جذبات کے کھیل کھیلے جاتے ہیں۔ رنگین[6] پیکر تراشے اور نچوائے جاتے ہیں جو کبھی کبھی ایسی شکلیں اختیار کرتے ہیں جو اصلی دکھائی دیتی ہیں اور ہمیں مافوق[7] الفطری اور اصلی دنیا کے ساتھ جوڑتی ہیں اپنی تمثیلی اور رمزی[8] ترسیلات[9] کی مدد سے۔ غالبؔ یا حافظؔ کے شعر پڑھنا اور محفلوں میں یہ دکھانا کہ ہم بھی ان کے دل کے سمندر میں غوطہ لگا رہے ہیں ایک بات ہے جواب ہمارے یہاں فیشن بن گیا ہے۔ مگر قاضی غلام محمد سچ مچ غالبؔ اور حافظؔ کے جذبات کی تڑپتی ہوئی زندگی سے کافی واقف تھے جس وجہ

1. Arrangement or organization 2. Analysis 3. Synthesis
4. Induction 5. Deduction 6. Colourful Imagination or complex imagery 7. Metaphysical or Transcendental 8. Allegorical
9. Communications

سے بھی لوگ ان کو نہ سمجھ پاتے تھے اور نہ ان کے قریب آتے تھے۔ کشمیر یونیورسٹی میں علم و ادب کا کلچر کبھی بنا نہیں اس لئے بھی قاضی ادبیات اور اقبال کی رمز آشنائی میں ڈوب گیا اور تصویروں کی رنگ آمیز بھول بھلیّوں میں اپنا دل تلاش کرنے لگے۔ ہماری دوستی کا یہ پہلو بہت ہی اہم تھا کہ آندھیوں میں چراغاں تلاش کرتے تھے یا رات کے اندھیروں میں ستاروں کے ساتھ مل کر صبح کی طباشیر ڈھونڈتے تھے۔ قاضی کی تحریروں سے ان کی فکری اُڑانیں اور ان کی جذباتی کیفیتیں جوانیوں کی طرح اُچھلتی کودتی دکھائی دیتی ہیں۔ ہم اب بھی اُنہیں پڑھ کر رفاقت قاضی کے جیتے جاگتے خواب دیکھتے ہیں۔

ہم پہلے بھی اشارہ دے چکے ہیں کہ قاضی صاحب زندہ دل اور خوش طبع انسان تھے اس لئے ظریفانہ بول چال سے دل بہلاتے تھے۔ ایک دفعہ سکول بورڈ کی میٹنگ میں فرمایا۔ ''آغا صاحب، آپ استانیوں کو بھی ریاضی اور سائنس کی تربیت دیتے ہیں۔ اُن میں سے بہت سوں کی تقرّری Humanitarian grounds پر کی گئی ہے۔ مُراد یہ ہے کہ نیا کشمیر کے حاکموں نے ترس کھاتے کھاتے ان کی تقرّری کی ہے یا تقرّری کی کوئی معقول بنیاد نہ ہونے کی وجہ سے Humanitarian grounds کا بہانہ وضع کیا ہے تاکہ پچھلے دروازے سے نام نہاد تعلیم یافتہ عورتوں کو لالا کر پیسہ کمایا جائے، کنبہ پروری کی جائے اور اس طرح تعلیم کی جڑیں اُکھاڑ دی جائیں۔ یہ دودھاری طنز تھا جو قاضی صاحب کی زبان سے نکلا تھا۔ اس قسم کا طنز و مزاح قاضی کا معمول تھا۔ میری گھر والی کی وفات کے بعد میری خواہش تھی کہ اپنی رہائش گاہ ہارمنی ۔۳ کا نام بدل ڈالوں۔ قاضی صاحب نے دست گیری کی اور ''صوفیہ نشان'' وضع کیا۔ ایک ڈاکٹر صاحب میرے رشتہ دار ہیں۔ ایک دن تشریف لائے اور کہا کہ یہ نام غلط ہے۔ ''نشانِ صوفیہ'' صحیح ہے۔ میں نے ہنسی مذاق میں قاضی صاحب کو ماجرا سنایا تو انہوں نے کہا۔ ''آغا صاحب، معاف کیجئے۔ آپ کا رشتہ دار ڈاکٹر تو ہے مگر وٹرنری کا''۔ یہ حاضر جوابی اور یہ ظریفانہ چال اور میں قہقہے نہ مارتا اور لطف اندوز نہ

ہوتا؟ مگر قاضی صاحب کا معمول ہی تھا ہنسنا ہنسانا! میں نے جب نشان کے معانی لُغت میں تلاش کئے تو بیسوں مطالب سامنے آئے۔ میری اولاد نے ایسے لوگوں کا اثر ادب اور احترام کے ساتھ قبول کیا ہے۔

قاضی صاحب کی بیٹی امریکہ میں ریاضیات کی پروفیسر ہے اور پروبی بلٹی[1] (Probability) کی ماہر۔ وہ حال ہی میں کشمیر آئی تھی اور مجھے شاہ ہمدان میر سید علی ہمدانی رحمتہ اللہ علیہ کی خانقاہ کی ایک تصویر دے گئی تھی جو اس نے خود اٹھائی تھی۔ یہ تصویر پہلے رنگ کی وجہ سے بہت زیادہ دل کش اور دل فریب لگتی ہے۔ اسے بہت ہی مناسب زاوئیے سے فنکارانہ صلاحیتوں کو کام میں لا کر کھینچا گیا ہے اور یہ کھینچنے والی کی اُفتادِ طبع کا ایک دریچہ ہے۔ قاضی صاحب کی ہمہ رنگ مصروفیات اب ان کی اولاد میں ترسیل ہوئی ہیں۔ میں نے قاضی صاحب کا گھر اسلام آباد کشمیر میں کئی بار دیکھا ہے۔ مگر نہ جانے کیوں اُنہیں اپنے گھر پر مدعو نہ کر سکا ہوں۔ اس کا مجھے بے حد افسوس ہے۔ تاہم ان کے بچے میرے پاس گاہے گاہے آتے ہیں۔ اس طرح قاضی صاحب کے ساتھ میری دوستی برقرار ہے۔ انہیں کئی سال پہلے بعد از مرگ عرفان کا ٹھواری فاؤنڈیشن ایوارڈ ملا ہے۔

قاضی غلام محمد کے بارے میں چند ایک باتیں ہوئیں مگر ابھی ہم کشمیر یونیورسٹی سے رخصت نہ ہونگے اور ایک شریف النفس، متحمل مزاج، کم گو، دوست پسند، خود شناس مگر نہ خود بین اور نہ خود سر، کم گو، مہمان نواز اور قدر شناس دوست پروفیسر محمد امین اندرابی کا تذکرہ کریں گے۔ میری اُن سے ملاقات ہوئی مگر ان کے گھر پر قاضی غلام محمد بھی موجود تھے اور میرے ساتھ میرے بڑے فرزند شاہد بھی تھے۔ قدرتی بات ہے کہ ان کی شریک حیات پروفیسر نصرت اندرابی گھر پر موجود ہو۔ ہم نے باتوں باتوں میں نہ جانے کتنے موضوعات چھیڑ دئے۔ گو کہ ہم بلا تکلفی سے بول رہے تھے اس لئے ہماری باتوں میں سنجیدگی کم اور

۱۔ ریاضیات میں امکانات تلاش کرنے کا شعبہ۔

بذلہ سنجی زیادہ تھی۔ پھر بھی امین صاحب مرحوم چپ چاپ سن رہے تھے۔ مگر ان کے چہرے پر نہ کچھاوتھا اور نہ آثار ملال۔ ہلکی ہلکی مُسکانیں بیچ بیچ میں ان کے چہرے کی شگفتگی بڑھاتی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ہماری باتوں سے لُطف اندوز ہو رہے ہیں اور ان کی تیکھی ترچھی شوخیوں کو جانچ رہے ہیں۔ دوسروں کی باتیں سننا اور خود خاموش رہنا بہت بڑی بات ہے اور یہ اُن لوگوں کا وصف ہے جو اپنی زبان سے نہ ضرب لگانا چاہتے ہیں اور نہ اپنے خیال دوسروں پر ٹھونسنا چاہتے ہیں۔ امین صاحب کو دیکھ کر مجھے اپنے شاگرد کی دو باتیں یاد آئیں۔ ایک یہ کہ شیخ فریدالدّین عطّار کہتے ہیں کہ زیادہ باتوں سے دل مرجاتا ہے اگر وہ باتیں تمدّن کے موتی جیسی بھی ہوں۔ دوسری یہ کہ انسان کو سُننا زیادہ چاہیے اور بولنا کم۔

امین صاحب یونیورسٹی میں اقبال انسٹی چیوٹ کے ڈائریکٹر تھے۔ انہوں نے اقبالیات کے مشہور و معروف ماہر پروفیسر آل احمد سرور مرحوم کے ساتھ کام کیا تھا۔ سرور صاحب کی اہلیت اور قابلیت ہندوستان میں اور ہندوستان سے باہر مسلّمہ تھی اور ان کی اثر اندازی سے نہ جانے کتنے دل و دماغ آباد ہوئے تھے۔ اُن کے کلام کا ایک خاص سٹائل تھا جو تعلیم و تربیت کے لحاظ سے خاصا اہم تھا۔ امین صاحب نے یقینی طور پر اُن سے فیض حاصل کیا ہوگا اور ان کی دقّتِ نظر سے بھی فائدہ اٹھایا ہوگا۔ سرور صاحب کے جانے کے بعد ان باتوں کا مشاہدہ ان کے ساتھیوں نے بھی کیا اور ان کے زیرِ تربیت شاگردوں نے بھی۔ یوں بھی یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ صحبت یاراں کا اثر انسان کے اوپر ضرور پڑتا ہے اور لالہ سرسبز کھیتوں میں ہی اُگتا ہے۔ کشمیر یونیورسٹی کے اقبال انسٹی ٹیوٹ میں ڈاکٹر عالم خوندمیری، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر جگن ناتھ آزاد جیسے اقبال شناس اور اقبال رنگ لوگ آتے تھے۔ ایسے لوگوں کی صحبت میں بیٹھنے سے امین صاحب کے اندر شدّت احساس پیدا ہونا اور اس احساس کو فکری تعاون دینا لازمی تھا۔ شیر کشمیر نے اقبال انسٹی چیوٹ کی شگفتگی کا خواب دیکھا تھا اور اس خواب کے اندر امین صاحب کا شامل ہونا ان کے لئے بھی

امتیاز تھا اور میرے لئے باعث طمانیت اور فخر۔

۱۹۹۸ء میں امین صاحب نے مجھے دعوت دی کہ میں یونیورسٹی میں تین تقریریں کروں۔ اس سے پہلے کشمیر میں جو آگ لگی تھی اس سے کون واقف نہیں۔ جب آگ پھیلتی ہے تو گلستان بھی بنجر ہو جاتے ہیں۔ مگر ۱۹۹۸ء میں حالات قدرے تھم گئے تھے اور امین صاحب نے جانچ لیا تھا کہ میں یونیورسٹی میں تقریر کر سکتا ہوں، خاص کر اس موضوع پر جو بڑا حساس موضوع تھا اور عام راہوں سے ہٹ کر۔ ''مغرب میں اسلام شناسی کیا ہے'' مجھے ابھی بھی یاد ہے کہ اس موضوع کے اردگرد میں نے اپنے خیالات اور تصورات پیش کئے تھے۔ اقبال نے اپنے خطبات میں خود کہا ہے کہ اسلام مغرب میں فکری اور علمی توسیع کی صورت میں آگے بڑھ رہا ہے۔ اندرابی صاحب نے مجھے دعوت دیکر کس موزون موقعے پر محسوس کیا تھا کہ میری تقریروں کے اثرات مفید ہوں گے اور کشمیر کی زندگی کیلئے بارآور۔ میں نے خود بھی محسوس کیا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد نہ صرف یاسین ملک نے میرا اسٹیج پر آنا مناسب سمجھا بلکہ پروفیسر اندرابی نے بھی یونیورسٹی کیمپس میں میرے خیالات کی ترسیل لازمی سمجھی۔ میں نے اُن دونوں کے ساتھ اتفاق کیا اور بدلتے ہوئے حالات اور تجربوں کے آئینے میں صاف گوئی سے اظہار خیال کیا۔

اندرابی صاحب کی دوستی کا سکّہ میرے دل میں اُس وقت بیٹھا جب انہوں نے میرے فرزند شاہد کی انگریزی شاعری کو کشمیری رُوپ دلوانے میں بہت اہم رول ادا کیا۔ ''زوچھم برمان'' یونیورسٹی میں ہی پروفیسر شفیع شوق صاحب کے ہاتھوں تیار ہوئی اور بعد میں چھپ گئی۔ شاہد کی امریکہ میں علالت کے دوران اور پھر اس کے گذر جانے کے بعد امین صاحب نے جس عملی محبت کا اظہار کیا۔ وہ سچّی دوستی اور خلوص کے بغیر ناممکن ہے۔ میری عدم موجودگی میں میرے گھر پر جاڑے کے دوران امین صاحب نے جس شدّ ومد کے ساتھ یاسین ملک کے شانہ بشانہ کام کیا، اس سے بھی میں بہت متاثر ہوا۔ مگر آہ

کسے معلوم تھا کہ امین صاحب مرحوم شاہد کا سوگ مناتے مناتے خود بھی اس دارِ فانی سے رخصت ہونے کی تیاری کر رہے تھے۔ بہت کم وقت گذرا تھا جب ہم نے اچانک سنا کہ امین صاحب صبح کی چائے پیتے پیتے گر گئے اور اس کے بعد کبھی ہوش میں نہ آئے۔ شیر کشمیر انسٹی چیوٹ آف میڈیکل سائنسز میں ان کا انتقال ہوا اور وہ کسی اپنے یا پرائے کو، دوست یا رشتہ دار کو تکلیف دئے بنا ہم سے رخصت ہو گئے۔ ہم ہمیشہ ان کی شفقت بھری رفاقت کو یاد کرتے ہیں اور ان کی بے انتہا شرافت پر رشک کرتے ہیں!

ایک شاگرد ہے میرے شاگردوں میں جس نے عملی اعتبار سے ثابت کر دیا کہ استاد اور شاگرد کا رشتہ دنیا میں تو جُڑ جاتا ہے مگر اس کی حدوں کو پار کر کے روحانی منزلیں طے کرتا ہے۔ یہ شاگرد عملی انسان ہے جسے ہم تعلیمی زبان میں Pragmatic Personality کہتے ہیں۔ اس نے اپنی ساری عمر محنت کرتے کرتے گزاری اور اپنے آپ کو نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ بنیادی سطح کے استاد کی حیثیت سے شروع کیا اور اعلیٰ سطح پر پہنچ گیا۔ سرکاری تعلیمی اداروں میں بھی کام کیا اور پرائیویٹ اداروں میں بھی مگر اپنی پرائیویٹ مصروفیات سے اپنے فرائض میں کوتاہی نہیں کی۔ ہزاروں کی تعداد میں بچھڑے ہوئے لوگوں اور غریبوں کے بچوں کو تعلیم دینے دلوانے کی بار آور کوششیں کیں اور اس طرح کشمیر خاص کر اندرون شہر کے لوگوں کو سماجی اور تمدنی لحاظ سے ترقی کرنے کے قابل بنا دیا۔ ایک شاندار مثال اس کی یہ ہے کہ ۲۲،۳۳۳ مسلمان لڑکیوں کو ادیب کی ڈگری دلوائی، انگریزی میں میٹرک کرایا اور سرکاری سکولوں میں استانیوں کے عہدوں پر متعین کرانے کے اہل بنایا۔ ان ہزاروں لڑکیوں کے ہزاروں گھرانے آباد ہوئے۔ اس اقتصادی اور سماجی قدم کی کافی اہمیت ہے ہماری ملّی اور مجلسی زندگی میں۔ پھر یہ کہ اپنی قابل رشک انتظامی صلاحیتوں سے جس کام کو ہاتھ لگایا، اسے مشکلات اور نامساعد حالات کے باوجود ہر ممکن اعتبار سے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ اب وہ سکنڈری سکولوں کیلئے استادوں اور استانیوں کی تربیت میں

سرگرمی سے کام کررہا ہے اور خوش حالی کے ایام گزار رہا ہے۔ اب تک شاید یہ بات صاف ہوئی ہوگی کہ میں جس شاگرد کے بارے میں بات کررہا ہوں، اس کا نام مولوی عبدالحی ہے اور وہ لواب بازار سرینگر میں ہمیشہ ہمہ تن مصروف رہا ہے۔ یہاں ہی اس کا گھر ہے اور یہاں ہی اس کا میدانِ عمل۔

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ انسان بہتی گنگا میں ہی ہاتھ دھوتا ہے مگر حی صاحب کا رویّہ اس لحاظ سے بھی مختلف ہے۔ وہ میرے ساتھ دھوپ میں بھی جُوار ہا اور چھاؤں میں بھی۔ اس نے بادوباران میں بھی مجھے چھوڑا نہیں اور گُل پوش، گُل ریز بہاروں میں بھی میرا ساتھ نبھانے سے ہچکچائے نہیں۔ یقیناً تکلیف میں مجھے زیادہ یاد کیا اور جب دیکھا کہ میں آرام کے دنوں سے گزر رہا ہوں تو دور سے دیکھتا رہا، میرے آرام پر اطمینان کا سانس لیتا رہا۔ جب میں محکمہ تعلیم میں مختلف النوع منصبوں پر کام کرتا تھا تو حی صاحب بھی اپنا کام کرتا رہا مگر فرصت کے لمحات میں مجھ سے ملتا رہا۔ جب میں ریٹائر ہوگیا تو شاگرد کی حیثیت سے کم اور اولاد کی حیثیت سے زیادہ اپنے اطمینان بخش خدمات دیتا رہا۔ اپنی آسودہ حالی میں مجھے فراموش نہیں کیا اور نہ میرے گھرانے کو۔ جس طرح اپنے بچوں کو پیار کیا، اسی طرح میرے بچوں کو بھی یاد کیا اور پیار کیا۔ میری طبیعت جذباتی زیادہ اور حقیقت پسندانہ کم مگر حی صاحب نے ہمیشہ مستقل مزاجی سے میرے گرم وسرد تیرے برداشت کئے اور کبھی میرے سامنے اونچی آواز میں بات نہیں کی۔ اس کے منہ میں بھی زبان ہے اور وہ اپنے میدان میں تیز گھوڑے بھی دوڑاتا ہے۔ تاہم میرے سامنے اس کے ہونٹ ہمیشہ بند رہے اور کبھی کوشش نہ کی مجھ کو دکھانے کی کہ اس کی بازوؤں میں بھی دم خم ہے۔ ہمارے سماج میں ایسے شاگرد، ایسی اولاد بہت پسند کی جاتی ہے کیونکہ ہمارے مذہب میں بھی اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ اپنے والد کے سامنے نہ اونچی آواز میں بولو اور نہ کبھی تیور چڑھاؤ۔ اُف بھی نہ کرو اگر دم بھی گھٹ جائے۔ حی نے عملاً کر دکھایا کہ باپ جیسے استاد کے سامنے سر نیچا کر کے بیٹھو

اور وہ بھی بے تصنع انکساری کے ساتھ!

حی صاحب کی زندگی میں بھی اتار چڑھاؤ آئے اور ایسا ہونا لازمی ہے۔ وہ نہ مالداروں میں شمار تھا اور نہ سیاست کاروں میں۔ نہ مذہب کا کاروبار کرتا تھا حالانکہ مولوی اپنے نام کے ساتھ لئے بیٹھا تھا۔ مگر یہ وہ مولوی نہیں جو مذہبی لوگوں کے ساتھ چپک جاتا ہے۔ زیادہ صحت مند زبان استعمال کریں تو کہیں گے کہ مولوی کاروبار کی علامت نہیں۔ اس کے دو نوجوان، خوبصورت، صحت مند فرزند یکے بعد دیگرے رحلت کر گئے۔ رضوان حالیہ تحریک میں اپنی جان قربان کر گئے مگر ان کی میّت بھی حی صاحب کے حوالے نہ کی گئی۔ دوسرے فرزند ڈاکٹر انعام حادثے میں جاں بحق ہوئے۔ حی صاحب نے دو فرزندان کے گذر جانے پر ایسی ہمّت اور ایسا عزم دکھایا کہ آج کی دنیا میں شاذ ہی اس کی مثال نظر آتی ہے۔ نہ رونا، نہ دھونا، نہ منہ بسورنا، نہ سکتہ جیسی حالت میں پڑا رہنا۔ نہ کاروبار بند کرنا اور نہ کھانا پینا ترک کرنا، نہ پریشان حالی کا شکار ہونا اور نہ کسی قسم کا شکوہ یا شکایت کرنا، نہ مرحوم بیٹوں کی تعریفیں کرنا اور نہ ان کے گُن کی فہرس لگانا۔ بس صرف یہ کہنا کہ جس ہستی نے عطا کئے تھے، اسی نے واپس بلا لئے۔ میرے پاس امانت تھی اور میں نے حتی الوسع اس امانت کو اپنے پاس اچھی طرح رکھنے کی کوشش کی۔ وہ چلے گئے اپنے مالکِ حقیقی کے پاس اور ہم سب کو بھی انہی کے پاس جانا ہے۔ یہ حقیقت بھرے الفاظ سبوں نے سنے اور حی صاحب کی خندہ روئی بھی دیکھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات حی صاحب کے کردار کی سب سے قابل رشک قوت ہے۔ اگر اس کے ساتھ کوئی اور قوت چپکائی جا سکتی ہے تو وہ ان کی محنت ہے۔ ستر سال پورے کر چکا ہے مگر ابھی حسب معمول کام کر رہا ہے۔ اب اس کے پاس گاڑیاں بھی ہیں مگر لگتا ہے کہ گاڑی کا تصوّر اس کے ذہن میں جگہ نہ پا سکا۔ اپنی پُرانی روش قائم ہے اور خندہ روئی سے بہت حد تک خاموش طریقے سے اپنا کام نبھا رہا ہے۔

حی صاحب کے بارے میں اگر کوئی بات اور لکھنا ضروری ہے تو وہ یہ کہ میں اس کی

لیاقت، اس کے وقوف اور اس کی قدر شناسی سے بے حد متاثر ہوں۔ وہ مجھے اپنا استاد سمجھ رہا ہے اور میں اسے اپنا سپوت تصوّر کرتا ہوں۔ ذاتی طور پر میں اس کی عقیدت مندانہ شفقت کی قدر کرتا ہوں اور چپکے چپکے تنہائیوں میں اس کو دعائیں دیتا ہوں۔

۱۹۹۴ء تک کشمیر کے حالات کافی سدھر چکے تھے، اتنے کہ کشمیر یونیورسٹی کے سٹاف کالج نے مجھے یونیورسٹی میں تقریریں کرنے کیلئے مدعو کیا۔ آخری تقریر کے بعد ایک شخص میرے پاس آیا اور کہا کہ باہر کچھ لوگ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے سمجھا کہ شاید آخری سفر کی گھڑی آ گئی ہے۔ مگر جب انہوں نے مجھ سے بات کی، معلوم ہوا کہ وہ لوگ احدوز ہوٹل میں کوئی تقریب منا رہے ہیں اور مجھے شرکت کرنے اور تقریر کرنے کی دعوت دے رہے ہیں۔ میں راضی ہو گیا۔ اسی دن شام کو راجباغ میں ہمارے گھر کا دروازہ کسی نے کھٹکھٹایا۔ میں اور میری گھر والی ذرا متفکّر ہوئے۔ ہم نے دروازہ کھولا۔ یاسین ملک صاحب اندر آ گئے۔ میں نے کہا میں پنشن خوار، بے یار و مددگار، میرے پاس آنے کی زحمت کیوں؟ اس نے کہا "آغا صاحب ہم ہر شخص کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں۔ آپ کی عنایت ہوگی اگر آپ کل میری کتاب جاری کریں گے!" دوسرے دن ہم دونوں، میں اور میری گھر والی، احدوز چلے گئے۔ کتاب بھی جاری ہوئی اور تقریر بھی ہوئی۔ میرے کچھ احباب ذرا دور ہی بیٹھ گئے۔ کچھ گھر آئے ناراضگی ظاہر کرنے۔ یاسین صاحب سے ہماری دوستی بندھ گئی

ملک صاحب مائسمہ بازار سرینگر کی ایک گلی میں رہتے ہیں۔ ان کے گھرانے نے زندگی کے نشیب و فراز دیکھے ہیں اور کافی مشکلات برداشت کی ہیں۔ یہ گھرانہ نہ کوئی دولت مند گھرانہ ہے اور پدرم سلطان کا وظیفہ پڑھنے والا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے کمائی ہوئی روٹی کھائی ہے اور وہ بھی سیدھی سادھی۔ چھوٹا سا گھر اور اس گھر کے اندر خوشی سے زندگی گزارنا اور اطمینان سے اللہ کا شکر بجالانا اس گھرانے کا معمول ہے۔ نہ کوئی رنگ نہ

ڈھنگ، نہ تصنع نہ تکلفات۔ آپ فرش پر بیٹھے اور میٹھی میٹھی باتوں میں لگ گئے۔ اسی طرح کشمیر کے لوگ طبعاً زندگی گزارتے ہیں اور اپنی شاندار روایات قائم رکھے ہوئے ہیں۔ یاسین صاحب کے والد کرگل میں بس وہی اپنا کام کر رہے تھے۔ بس گاڑی چلا رہے تھے۔ سال میں ایک دفعہ پندرہ بیس دن کی چھٹیاں گزارنے سرینگر آتے تھے۔ اس نے کرگل میں نام پیدا کیا تھا۔ وہ لوگوں کی مدد کرتا تھا، خاص کر چھوٹے چھوٹے بچوں کی۔ کرگل کے لوگ اس کے گرویدہ ہو گئے تھے۔ اب وہ ریٹائر ہو گئے ہیں اور گھر پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں یاسین صاحب کے گھرانے سے واقف ہوں اور ان کو مبارکباد دیتا ہوں کہ وہ صبر و شکر اور اطمینان سے زندگی گذارتے گذارتے ''سادہ زندگی بسر کرو مگر بلندیوں پر اُڑان کرو'' کا علم اٹھائے ہوئے ہیں۔ لوگوں کے ساتھ مل جُل کر رہنا اور ان کی مدد کر کے اپنے حوصلے بڑھانا کتنی اچھی بات ہے۔ اس ڈھنگ میں صلاحیت ہے، حسن ہے۔ یاسین صاحب اپنی مروّجہ تعلیم راستے میں چھوڑ گئے۔ بارہویں تک مشکل سے پہنچ پائے۔ اس میں ان کا کوئی قصور نہیں۔ نوویں یا دسویں میں پڑھتے تھے کہ یہاں کشمیر میں ایک منحوس واقعہ پیش آیا۔ شاید یہ ۱۹۸۶ء کا زمانہ تھا۔ علی محمد صاحب وٹالی جو یہاں ایک پولیس آفیسر تھے، فوجیوں کے ہاتھوں پٹ گئے یوں کہ ان کے دانت بھی توڑ دے گئے۔ ملک صاحب ایک دیوار کے پیچھے چھپ گئے تھے اور سارا منظر دیکھ رہے تھے۔ اس سے پہلے بھی ایک اور واقعہ پیش آیا تھا، ایسا ہی۔ شیخ صاحب ابھی زندہ تھے جب غالباً ۱۹۸۰ء میں بلوائیوں نے ایک آرمی ٹرک کو چھیڑا تھا۔ آرمی کے جوانوں نے واپسی حملہ کیا تھا اور لوگوں کو خوب زدوکوب کیا تھا۔ ایسے واقعات نے یاسین صاحب کے دل میں آگ لگا دی تھی۔ پھر جنگجو تحریک شروع ہوئی۔ یاسین کالج میں داخل ہو گئے تھے جب انہیں دھر لیا گیا۔ پھر کشمیر آگ کی لپیٹ میں آ گیا مگر ۱۹۹۴ء میں حالات یہاں تک پہنچ گئے کہ یاسین صاحب نے بندوق چھوڑ دی۔ وہ کشمیر میں سول وار (Civil war) لڑنا نہیں چاہتے تھے۔ کم ہی وقت میں انہوں نے ارادہ

کرلیا تھا کہ وہ جس چیز کو مانتے ہیں، اس پر ڈٹ کر قدم جمائے رہیں گے اور ہر دم بھیس بدل کر سیاست میں امکانی راستے تلاش نہیں کریں گے۔ اس پر اس کے کچھ دوست ان سے خفا بھی ہو گئے ہوں گے مگر ان کے رویّے میں اس خفگی سے کوئی منفی اثر نہیں پڑ گیا۔

یاسین صاحب کی زندگی میں بہت ہی کم عرصے میں جو مثبت تبدیلیاں آئی ہیں وہ حوصلہ افزا ہیں مگر حیران کُن بھی۔ جیلوں میں رہ کر، جیلوں سے باہر، سفر کرتے کرتے، لوگوں سے ملتے ملتے، ہر دم زیادہ سنتے سنتے، کم بولتے بولتے، ہندوستان کے طول و عرض میں اور ہندوستان سے باہر انہوں نے بہت کچھ سیکھ لیا ہے۔ یہاں تو ہم ملتے ہی رہتے ہیں مگر امریکہ میں بھی میری ملاقات ان سے ہوتی رہی ہے۔ میں نے اُنہیں ہر وقت سمجھنے کی کوشش کی ہے اور اس کی شخصیت کی چھپی ہوئی حقیقتوں کو دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا تجربہ وسیع ہو گیا ہے اور پختہ بھی۔ مجھے اس سے کافی مسرّت حاصل ہوئی ہے۔ میں نے اپنے گھر کے اندر اور گھر سے باہر لوگوں کی زبانی سنا ہے کہ یاسین سُدھ بُدھ والے جواں سال جمہور پسند ہیں جو کشمیریوں سے بہت پیار کرتے ہیں اور ان کے درد کا احساس سینے میں لئے ہوئے بیٹھے ہیں۔ بیٹھے کیا کہ بس دن رات کام کرتے رہتے ہیں۔ کبھی یہاں، کبھی وہاں، اکثر شہروں میں اور اطمینان بخش حد تک دیہات میں۔ وہ آہستہ آہستہ نرمی سے بولتے ہیں اور من ہستم سے بہت حد تک کترانے کی عادتیں بڑھا رہے ہیں۔ میں نے اپنے قریبی رفقا سے سنا ہے کہ یاسین اپنی اثر پذیری سے لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں، حتّٰی کہ میں بھی محسوس کرتا ہوں کہ ان کے طور طریقے جاذب ہیں۔ وہ کتابیں پڑھتے ہیں اور پڑھتے پڑھتے بہت اونچی اڑانیں کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ علم کوشش ہے اور لگاتار کوشش۔ نہ جانے یہ ہوا اس کے کانوں میں کس نے پھونک دی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور شاعر مشرق علاّمہ اقبال دورِ جدید میں امامت کے لائق دو ہستیاں پیدا ہوئی ہیں جن کی اپنی اپنی نہایت ہی تابناک پیامبرانہ روشیں ہیں۔ یاسین صاحب ان

روشوں سے متاثر ہو ہو کے ان بہت ہی اونچے میناروں پر چڑھ کر خود بھی ان کی نور پاشی میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ جوان سال کشمیری بہادر کی یہ ہمت دیکھ کر انسان کا حیران ہونا لازمی ہے مگر ایسا لگتا ہے کہ یاسین اپنی متوازی سُدھ بُدھ سے مولانا کو بھی گلے لگائیں گے اور نغمہ نواز اقبال کی رجز میں بھی شامل ہو جائیں گے۔ فی الحال وہ کبھی کبھی مجھ سے لڑ پڑتے ہیں کہ میں زیادہ مذہبی نہیں ہوں، میں اقبال سے زیادہ مولانا آزاد کو عملِ صالح کا ترجمان گردانتا ہوں۔ میں نے لڑ پڑنے کی ترکیب نکالی، اس لئے کہ گرم جوشی سے بات کرنے میں مزہ آتا ہے اور انسان پھٹ وہ بات کہہ ڈالتا ہے جس کی جگہ دل کی گہرائیوں میں ہوتی ہے۔ ورنہ لڑنا بھڑنا ٹھیک نہیں ہے۔ بچو بات سمجھ میں آئی؟ مگر آزاد اور اقبال ہی یاسین کے ذہن پر تازیانے نہیں مارتے، اور بڑے بڑے لوگ بھی اس کی پرورش کرتے ہیں۔ مولانا رومیؒ، شیخ معین الدین چشتیؒ، غوث الاعظم دستگیرؒ، شاہ ہمدانؒ اور سب سے بڑی بات محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم یاسین کی زبان پر خضوع وخشوع کے ساتھ چڑھتے رہتے ہیں۔ گاندھی جی، نہرو، شیر کشمیر یہاں اور دنیا کے بڑے بڑے لیڈر وہاں عالم خیر وشر میں اس کے ذہن میں پولیٹیکل تانے بانے بُنتے رہتے ہیں اور وہ کشمیر کے طوفانی دور میں بھی بہت ہی صحت بخش غذاؤں سے اپنی ذہنی قوت بڑھانے میں مصروف ہیں۔

کشمیر میں کچھ لوگ ہیں جو نکتہ چیں زیادہ اور نکتہ شناس، نکتہ رس کم ہیں۔ ایسے ہی ایک کشمیر کے تاجر محمد رمضان جیولر کے فرزند کے دوست ہیں جو قانون دان ہیں اور امریکہ میں مُقیم۔ انہوں نے میرے ساتھ ییل یونیورسٹی (Yale University) میں یاسین صاحب کی تقریر سنی تھی جو مری نظروں میں بہت وضع دار اور پُر معنی تھی۔ امریکیوں کے سامنے یاسین کا بولنا اور وہ بھی Yale یونیورسٹی میں بجائے خود بڑی بات ہے جس پر ہم کشمیریوں کو فخر ہے۔ مگر قانون دان صاحب بولے کہ وہ یاسین کی تقریر سے مایوس ہو گئے اس لئے کہ ان کی زبان لغوی اعتبار سے صحیح نہیں تھی۔ میں نے کہا یہ برطانوی سامراجی تہذیب کے معیار

ہیں جو فرسودہ ہو چکے ہیں۔ غیر ملکی زبان پر فریفتہ ہونا اور بھی سامراجی اعتبار سے غلامانہ ذہنیت کا اتا پتا دیتا ہے۔ ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ یاسین صاحب نے اپنے دل کی بات امریکہ میں دوسروں تک پہنچائی کہ نہیں اور وہ بھی اچھے ڈھنگ سے۔ اگر پہنچائی ہوگی تو ہمیں اس جواں لڑکے کی جرأت اور اہلیت کی داد دینی چاہیے۔ تقریر سننے والے کیمبرج یونیورسٹی کے کسی پروفیسر کی وضعدار تقریر سننے نہیں آئے تھے۔ وہ آئے تھے یاسین کی پارٹی کی غرض و غایت اور پروگرام سننے۔ وہ اس سے واقف ہو گئے اور مقرر اپنی ادا سے اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ معاملہ ختم! قانون دان مذکور دوست کی طرح یہاں بھی کشمیر میں کچھ لوگ یاسین صاحب کا مائسمہ بازار سے نکل کر Yale University میں کشمیریوں کا درد بیان کرنا زیادہ ہضم نہ کرتے ہوں تو کیا ہوا۔ نہرو کی اندرا جی، بھٹو کی بے نظیر اور شیخ صاحب کا فاروق اپنی جگہ پر ٹھیک، مگر یاسین جیسے لوگوں کے حوصلوں کی داد دینا ہمارا فرض ہے۔ کوٹھیاں سجانا اور میراحق میرے بچے دہراتے رہنا موٹی عقل کی بات ہے جو سلطانیٔ جمہور میں فرسودہ ہو چکی ہے!

یاسین صاحب نے دوستی کے اچھے مراسم قائم کئے ہیں اور نبھائے ہیں۔ امریکہ میں وہ شاہد علی کے قریب رہے ہیں اور اس کی انگریزی شاعری سمجھنے کی کوشش کر چکے ہیں، کامیابی کے ساتھ اور یہ بڑی بات ہے۔ شاہد کا مزاج ہندو کالج دہلی سے گزرتے گزرتے امریکہ میں بنا اور وہ اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں وہاں خاصی جگہ پا گئے۔ فیض احمد فیض کی شاعری کا گیت پڑھنے والا شاہد قلم کی قوت رکھتا تھا اور بیان کی ندرت و قدرت۔ یاسین کی پہچان اس میں بھی ہے کہ وہ Country without Post Office کے علاوہ شاہد کی اور کتابوں کو بھی پڑھ رہا ہے۔ وہ سمجھ بوجھ کی بنیاد پر شاہد کا مدّاح ہے اور اس لئے قدر شناس۔ قدر شناسی دوستی کا تحفہ ہے۔ شاہد کے گذر جانے کے بعد ہی یاسین نے یہاں کشمیر میں ہی اچھا خاصا حسینی کام نہ کیا بلکہ اس کے سوگ میں مجالس کا انعقاد کیا۔ جب وہ سخت علیل تھے تو

یاسین مسجدوں اور گھروں میں اس کے لئے دعا کراتے تھے، جس میں عام لوگ شریک ہوتے تھے۔ جب وہ گذر گئے تو شاہد کی کتابیں منگوا منگوا کر، اُن پر اپنا پیسہ پیسہ خرچ کر کے لوگوں میں، پڑھنے والوں اور سمجھنے والوں میں تقسیم کرائیں تا کہ لوگ زیادہ اچھی طرح سے کشمیر کے اس پُر درد شاعر کی دھڑکنوں سے واقف ہو جائیں جس نے کشمیریوں کا درد اپنا درد سمجھا اور کشمیر کے ماتھے سے بہتی ہوئی خون کی دھاروں کو دور پردیس امریکہ میں اپنے ماتمی گیتوں سے سلام کیا۔ یاسین نے لوگوں کو سمجھایا کہ شاہد غریب الوطنی میں اپنی ذہانت اور قابلیت سے اپنی جنم بھومی کو یاد کر رہا ہے اور شاندار انگریزی نغموں سے کشمیر کے لہو کو خراج عقیدت پیش کر رہا ہے۔ مجھے یاسین کی اس ادب نوازی کا دلی احترام ہے۔ پنشن خوار، بے یار و مددگار اشرف کی سوگواری میں اس طرح شریک ہونا یاسین کی توفیق ہے! وما توفیقی الا باللہ۔

دوستوں کے ساتھ اپنے شاگردوں کا تذکرہ ضروری ہے۔ اچھا اور مثالی استاد شاگردوں کو پڑھاتا سکھاتا ہی نہیں، تربیت ہی نہیں دیتا بلکہ ان کے ساتھ محبت کرتا ہے، سچی محبت۔ ہمارے ہاں شاگردوں کو اولادوں میں شامل کیا جاتا ہے اور شاگرد اپنے اُستادوں کی بہت عزت کرتے ہیں، جیسے چیلے گُرو کی۔ خود وہاں مغرب میں بھی استاد اور شاگرد کا رشتہ مادّی تہذیب کے باوجود بھی کِھل کِھلاتا ہے۔ مجھے وہاں کے استادوں پر ذاتی طور پر ناز ہے۔ میں نے اپنی زندگی کے پچاس سال شاگردوں کی تعلیم و تربیت میں گذارے ہوں گے۔ سپلانگر کی ٹائپ سیکالوجی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے ان کی اچھی خاصی پرداخت کی ہوگی۔ اوائل عمر سے ہی شاگرد کا مزاج، اس کا میلان پہچاننا کتنا سودمند رہتا ہے۔ میں نے اس پہچان سے یا اس میلان طبع کی شناخت سے حتی المقدور فائدے اٹھائے۔ چھوٹی عمر کو چھوڑیئے، بعد میں بھی یہ شناخت شخصیت کا اندازہ لگانے اور اس کی تعمیر کرنے میں مدد دیتی ہے۔

میں نے جب جب اپنے شاگردوں کو کھلتے دیکھا، میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ بہت

سوں کی قابلیت میری آنکھوں کے سامنے خوب نکھری۔ انہوں نے اپنی قابلیت دوسروں کو بنانے، سنوارنے، نکھارنے میں صرف کی۔ جس طرح انہوں نے انسانیت کی خدمت کرنا مجھ سے سیکھا۔ انہوں نے دوسروں کے اندر یہ قابل قدر جذبہ پیدا کیا۔ سینکڑوں شاگردوں نے سماج میں اچھی اچھی پوزیشن حاصل کی اور خاصے اچھے معیار قائم کئے۔ اچھے عہدوں پر فائز ہوئے اور کچھ ملک سے باہر دنیا میں پھیل گئے۔ کوئی لیکچرر یا کوئی پروفیسر بنا۔ کسی نے ہائر سیکنڈری سکول کی انتظامی ذمہ داری قبول کی، کوئی ہائر ایجوکیشن میں یا تو کالج کا پرنسپل بنایا یونیورسٹی میں جا پہنچا۔ کوئی امتحانات کا منتظم بنا اور کوئی رجسٹرار۔ بہت سارے شاگرد سکولوں کے ہیڈ بن گئے اور اس طرح دور دور تک تعلیم کی انتظامی باگ دوڑ سنبھالی۔ کوئی انتظامیہ کے دوسرے شعبوں میں اپنی اہلیت سے اچھا کام کرنے لگا اور کوئی سماجی یا تمدّنی مصروفیات میں محو ہو گیا۔ کسی نے قلم کاری شروع کی اور کسی نے دوسرے تخلیقی ذریعے ایجاد کئے۔ میں اپنے شاگردوں کو دیکھ کر ہارورڈ کمیٹی کی زبان میں خاموش انعامات اور داخلی تسکین پاتا رہا۔ جب دیکھا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی وہ کام کر رہے ہیں اور اپنے تجربات، اپنی اہلیت سے فیض پہنچا رہے ہیں تو میری تسکین بڑھتی رہی!

شیخ محمد عبداللہ کی ۵۳ء میں گرفتاری کی بدولت میں نے ایسے شاگرد پیدا کئے جن پر مجھے فخر ہے۔ اگر میں انتظامی امور میں مشغول ہوا ہوتا تو شاید شاگردوں کے ساتھ میرا رابطہ کٹ جاتا۔ مگر تعلیم میں جب بھی مجھے ناظم کا کوئی عہدہ ملا، میں شاگردوں اور استادوں کے ساتھ جُڑا رہا۔ سکولوں کی انسپکٹری کے ایام میں میں نے مدرسوں میں شاگرد بنائے۔ میں دورے پر جاتا، بیس بیس پچیس پچیس کتابیں ساتھ اُٹھاتا، استادوں میں بانٹتا اور ان کے ساتھ بیٹھ کر علمی و ادبی معاملات پر گفتگو کرتا۔ بس استادوں کے چھوٹے چھوٹے سٹیڈی سرکلز بنا بنا کر میں ان میں پڑھنے پڑھانے کی عادات پیدا کرتا، وہ آپس میں گفتگو کرتے، بحث و مباحثے کرتے اور سکولوں کے اندر اور باہر علمی مشاغل میں حصہ لے لیکر اپنی علمی

قابلیت میں اضافہ کرتے رہتے۔ مدت گزرنے کے بعد جب کبھی یہ استاد مجھ سے ملتے تو کہتے۔ ''آغا صاحب لُو ہوبرمین کی کتاب Man's Worldly Goods ابھی بھی ہمارے ذہنوں میں تازہ ہے۔ اس کتاب نے ہماری آنکھیں کھول دی تھیں۔ اسی طرح گاندھی جی اور پنڈت جی کی سوانح عمریاں بھی ہماری زندگی کی پونجیاں ہیں۔ یہ کتابیں بھی آپ نے پڑھنے کیلئے دی تھیں اور ہماری سمجھ بوجھ کے کواڑ کھول دئے تھے۔ ایسی کتابیں اب نایاب ہیں۔ اب نہ کوئی کتاب دیتا ہے اور نہ کتابوں پر بحثیں ہوتی ہیں''۔ مجھے وہ بہت ہی اچھے دن بھی یاد آتے ہیں جب میں ٹیچرس کالج میں شاگردوں کے ساتھ تن من دھن سے مصروف رہتا تھا۔ ان شاگردوں میں نوجوان بھی ہوتے تھے اور ادھیڑ عمر کے لوگ بھی۔ میں اُن کا اُستاد اور ان میں سے کچھ عمر کے لحاظ سے میرے آگے مگر ذوق وشوق اور لگن سے تجربوں کے ٹکراؤ بہت اچھے نتائج پیدا کرتے تھے۔ تعلیمی عمل بڑا جاندار معلوم ہوتا تھا۔ ان دنوں حکومت سکولوں میں کام کرنے والے استادوں اور استانیوں کو ہی زیادہ تعداد میں بی ایڈ کیلئے ٹیچرس کالج بھیجتی تھی۔ جو لوگ بی اے یا بی ایس سی پاس نہیں ہوتے تھے۔ اُنہیں بیسک ایجوکیشن سرٹیفکیٹ کیلئے تربیتی سکولوں میں Teachers Training Schools بھیجا جاتا تھا۔ شیخ صاحب اس بات پر زور دیتے تھے کہ کوئی بھی استاد ہیڈ ماسٹر یا تحصیل یا ضلع افسر بن نہیں سکتا جب تک اس نے بی ایڈ کی ڈگری حاصل نہ کی ہو۔ مجھے یاد ہے کہ ایک روگناتھ مٹو صاحب بھی ۵۳ سال کی عمر میں بی ایڈ کیلئے آئے تھے۔ اس نے خواجہ غلام السیدین صاحب کے ساتھ بھی کام کیا تھا اور وہ بہت ہی قابل اور تجربہ کار استاد تھے۔ اسی طرح مرحوم حسین علی انصاری دلنہ بارہمولہ سے آئے تھے، بہت قابل استاد تھے، شاعر تھے، بردبار تھے اور علمی وادبی اعتبار سے دُھلے منجھے۔ ان کی عمر ۴۰ سے پار کر گئی تھی اور میں ۳۰ سال سے ذرا آگے۔ ایسے ہی اور بھی بہت قابل لوگ آئے تھے۔ ان کے ساتھ کام کرنے میں مزہ بھی آتا تھا، مُسرّت بھی حاصل ہوتی تھی اور خاصے اچھے نتیجے بھی نکلتے تھے۔ دکھائی

دیتا تھا کہ علم نے ان کے ذہن پر ہی نہیں، ان کے کردار اور ان کے اخلاقی معیار پر بھی اپنا خاصا اثر ڈالا ہوتا تھا۔ وہ زندگی کی معمولی چیزوں کی طرف بہت کم دھیان دیتے تھے۔ کئی ایک استاد اپنی کارکردگی، اپنے رنگ ڈھنگ اور اپنی وضع سے مجھے یہ باور کرنے پر آمادہ کرتے تھے کہ کشمیر میں زندگی بہتر بنانے کے امکانات موجود ہیں اور یہاں کی شخصیات سے قرب وجوار میں مثبت اثرات پڑ سکتے ہیں۔

امریکہ سے واپس آ کر میں نے یونیورسٹی میں شعبہ تعلیم کھولا۔ وہاں بھی استادوں کو پڑھنے پڑھانے کے علاوہ تحقیق و تخلیق کا کام سکھانے میں اپنا وقت صرف کیا۔ تاہم مجھے افسوس ہے کہ سیاسی حالات غیر یقینی تھے۔ وفادار کام کرنے والوں کو شک کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اس وجہ سے کشمیر میں ایسا ماحول بن نہ سکا کہ تعلیمی اور تخلیقی اعتبار سے کوئی موثر کام ہو سکے۔ جتھ بندیاں اور جتھ بند وفاداریاں ایسی پھیل گئی تھیں کہ مایوسی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ میرے ساتھیوں نے بہت اچھا کام کیا تھا مگر سارا نہ سہی اس کا بڑا حصہ غارت ہو گیا۔ سیاسی ساز باز، گٹھ جوڑ، رشوت ستانی اور غلط طریقے پر اُستادوں کی تقرری جس میں حرص و آز کارفرما تھی، نے استاد کے وقار کو زبردست نقصان پہنچایا۔ ۵۳ء سے پہلے شیخ صاحب ہمیشہ کینن بسکو، میلنسن اور تبلیغی رنگ میں رنگے ہوئے استادوں کا نام فخر اور ادب سے لیتے تھے مگر وہ باتیں اور مثالی انداز کافور ہو گئے تھے۔ میں ابھی بھی کچھ اچھے اساتذہ سے ملتا ہوں جو میرے شاگرد رہ چکے ہیں۔ ان کے کام کرنے کے انداز نرالے ہیں اور ان کی شخصیت موثر ہے۔ مگر مجموعی اعتبار سے دیکھا جائے تو ماحول ناسازگار ہے اور غیر صحت مند۔ سب سے معیوب چیز جو میں کافی عرصہ سے دیکھتا ہوں، خاص کر پچھلے کئی سالوں سے، یہ ہے کہ لوگ جن میں استاد شامل ہیں، نہ کتاب پڑھتے ہیں، نہ اچھے اخبار اور جریدے۔ کچھ لوگ تاہم ابھی موجود ہیں جن کی پڑھنے کی عادتیں اچھی ہیں، جنہیں کتابوں کے ساتھ اُنس ہے۔ یہ لوگ میرے پاس آتے ہیں، کتابیں ڈھونڈتے ہیں، میں ان کے شوق کی قدر کرتا ہوں۔ انہیں کتابیں دیتا ہوں اور کبھی کبھی فوٹو سٹیٹ کاپیاں منگوا منگوا کر ان

میں بانٹ لیتا ہوں۔ کبھی کوئی والد صاحب مجھ سے تقاضا کرے کہ میں اسے اس کی اولاد کیلئے کتاب دوں، میری باچھیں کھل جاتی ہیں۔ میں نے اپنے آپ کو کبھی کوئی بڑا استاد مانا نہیں، مگر کتنی مسرّت ہوتی ہے جب میں کتابیں جمع کرتا ہوں، انہیں دوسروں تک پہنچاتا ہوں اور اسی طرح اپنے شاگردوں میں پڑھنے لکھنے کا شوق و ذوق پیدا کرتا ہوں۔ اب لائبریریاں ناپید ہیں۔ جو بھی ہیں وہاں سے کتاب حاصل کرنا مشکل۔ کوئی کتاب حاصل ہوجائے، اس کا معیار اتنا اونچا نہیں۔ مجھے یاد ہے کہ میں کس دلچسپی سے اور کس سنجیدگی سے لائبریریوں کیلئے کتابیں، جرائد، رسائل اور اخبار منگواتا تھا اور ہر وقت اپنے شاگردوں کی توجہ ان کی طرف مبذول کراتا تھا۔ یہی یادیں ابھی بھی میرے لئے خوشی کا سامان مہیا کرتی ہیں۔

میں جب اپنے شاگردوں سے ملتا ہوں اور ان کی خوش وقتی اور خوش حالی دیکھتا ہوں تو دل باغ باغ ہوجاتا ہے۔ بہت سارے شاگرد اب ریٹائرمنٹ کے بعد ایسا کام کررہے ہیں جو انہوں نے ملازمت کے دوران نہیں کیا۔ مشین کا تمدن اتنا پھیل گیا ہے کہ وہ بھی اس کی زد میں آگئے ہیں۔ چنانچہ میرے کئی شاگردوں نے اپنے تعلیمی ادارے کھول دئے ہیں اور کالج آف ایجوکیشن بھی۔ وہ بہت خوش ہیں کیونکہ کافی پیسہ بنا رہے ہیں۔ یقیناً ان میں کچھ ایسے ہیں جنہیں حقیقی تعلیم سے کوئی غرض نہیں اور نہ علم سے۔ مگر ان کا مقابلہ ریاستی سکولوں اور ریاستی تعلیمی اداروں سے ہورہا ہے۔ اس دوڑ میں وہ سرکاری اداروں سے آگے ہیں۔ میں اندر ہی اندر یاسیت کا شکار ہوں۔ اُستاد ریٹائرمنٹ کے بعد پیسے کا کاروبار کرنے بیٹھے، یہ احساس المناک ہے اور دل سوز بھی۔ میں کسی بھی صورت میں اس خیال کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کرسکتا کہ استاد یونیورسٹی پروفیسری کا باعزت مقام حاصل کرے، اپنا بہت سارا وقت یونیورسٹی میں گزارے، ریٹائر ہوجائے، گریجوٹی وغیرہ حاصل کرکے بڑی سے بڑی رقم لیکر گھر لوٹے اور دوسرے دن سکول کھولے اور وہ بھی پیسہ کمانے کیلئے۔ مگر میں کس جرأت کے ساتھ اس کی مخالفت کروں؟ رشوت کا بازار گرم ہے، بڑے بڑے گھروں میں

لکھشمی دیوی نے مال و دولت کے انبار لگائے ہیں، دولت اور حرص کے ساتھ سماجی وبائیں پھیل گئی ہیں۔ مثلاً اولاد کی شادی پر روپیہ پیسہ اڑانے میں کوئی کسر باقی نہیں رہتی ہے۔ دولت کام میں لاکر دامادوں اور لاڈلوں کیلئے بڑے بڑے عہدے، بڑی کوٹھیاں حاصل کی جاتی ہیں، عیش و عشرت کا سامان مہیا کیا جاتا ہے، کتابیں ردّی میں ڈال دی جاتی ہیں مگر اعصاب کی ٹھنڈک کے لئے جو بھی سامان میسر ہو، مہیا کیا جاتا ہے۔ یہاں مجھے ایڈمبرا کے ایک پروفیسر کی یاد آتی ہے جو الٰہیات میں ماہر تھے۔ یہ صاحب گھوڑے پر سوار ہو کے آتے تھے، زمانہ ۱۹ ویں صدی کا تھا۔ بقول وہ اس کا گھوڑا پکی سڑک پر یہ آواز پیدا کرتا تھا پراپرٹی، پراپرٹی، پراپرٹی (Property)۔ پروفیسر کے کان صرف پراپرٹی پراپرٹی سنتے تھے۔ کہتے ہیں کہ فلسفی سپنوزا کے وقت میں بھی اگر کوئی شخص روپیہ پیسہ کے پیچھے لگتا تو اس میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی تھی الّا یہ کہ اس شخص کو علیل قرار دیا جاتا تھا یعنی بیمار۔ آج کل یہ بیماری جسمانی ہی نہیں، دماغی، جذباتی اور روحانی بھی ہے۔ جسمانی بیماری سے کہیں زیادہ! یہاں ڈی، ایچ، لارنس کی مشہور کتاب لیڈی چٹرلیز لور (Lady Shatterley's Lover) کا حوالہ دینا ضروری ہے۔ اس کی ہیروئن کونی ہے۔ بے چاری ایک چھوٹی پہاڑی پر کھڑی اپنی تباہی کے بارے میں سوچ رہی ہے۔ لارنس کہتا ہے کہ قصور اس بے چاری کا نہ تھا، نہ اس کے عشق کا، نہ اس کی جنسی خواہش کا۔ اگر قصور تھا تو وہ بجلی کے قمقموں کا تھا اور انجنوں کے اس شور و غل کا جس کا اثر بے رحمانہ اور سفّاکانہ ہے۔ وہ ایسی سرزمین میں رہتی تھی جس میں حرص مشینی دور میں گھس گئی ہے اور مشینوں کے ساتھ گتھم گتھا ہو کر ان کو استعمال کر رہی ہے۔[1]

1. "It was not woman's fault, nor even love's fault, not the fault of sex. The fault lay there, out there in those evil electric lights and diabolical rattings of engines. There, in the world of the mechanical greedy, greedy mechanism and mechanized greed, sparkling with lights and gushing hot metal and roaring with traffic, there lay the vast evil thing, ready to distroy whatever did not conform. Soon it would destroy the wood and the bluebells would spring no more. All vulnerable things must perish under the rolling and running of iron. (Lawrence)

غرض کونی کی بے بسی مشینی تہذیب کی دین ہے جسے مہاتما گاندھی شر (Evil) کہتے ہیں۔ میں اپنے بڑھاپے میں اس حرص وہوا کو دیکھنے کیلئے تیار نہیں جس نے مشینوں کا روپ اختیار کیا ہے۔ اس سے ہم ہر ایک مثبت چیز سے الگ ہو گئے ہیں، فرحت سے، انبساط سے، مصوری اور سوز وساز سے، نرمی، اعتدال اور دھلے مجھے برتاؤ سے۔

مجھے پچھلی صدی کے وسطی دن یاد آتے ہیں جب میں شاگردوں کی لگن اور اُن کا ذوقِ سلیم دیکھ کر پھولے نہ سماتا تھا۔ مجھے نہ جانے زندگی بہتر بنانے میں بے حد آرام کیوں ملتا تھا۔ نوجوان زندگی کے ساتھ خاص طور پر ایسا کرتے کرتے میں خود بھی پھلتا پھولتا محسوس کرتا تھا۔ میں نے زندگی میں اگر کسی چیز کی خواہش کی ہے اور اگر کسی چیز کیلئے دعا مانگی ہے تو وہ یہ کہ میرے بچے، عقلی اور ذہنی اعتبار سے اعلیٰ سے اعلیٰ مقام حاصل کریں۔ شکر ہے کہ ان چاروں کی چاہت حُسنِ دماغ رہی ہے۔ وہ جتنا ادراک اس حسن کا کر چکے ہیں اتنا ہی زیادہ قصد کرتے ہیں اس اتھاہ سمندر کی گہرائیاں اور دیکھنے کا۔ میں نے ان کے لئے کچھ بھی نہیں کیا اور نہ کر سکا البتہ میں نے سالہا سال اپنے شاگردوں کے پھلنے پھولنے کی تمنا کی۔ ان کی حتی المقدور دیکھ بال کی اور ان کے حسنِ دماغ اور حسن کردار سے بے حد مسرّت پائی۔ دو جہاں کے مالک نے شاید اسی کی پاداش میں اپنا دستِ رحمت میرے بچوں کے سر پر رکھا۔ یہاں مجھے سقراط کے آخری دن یاد آتے ہیں جب اس نے فرمانِ قضا جاری کرنے والوں سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ ''مجھے سزائے موت سنا کر آپ یہ سوچتے ہوں گے کہ آپ نے کوئی بڑا کام کیا ہے یا کوئی کامیابی حاصل کی ہے۔ کیا یہ دوسری مثال نہیں آپ کے سوچ کی کہ آپ جانتے نہیں کہ آپ نہیں جانتے۔ ہوسکتا ہے کہ موت انسان کیلئے سب سے بُری چیز ہے مگر ہوسکتا ہے کہ یہی چیز بہترین واقعہ ثابت ہو جائے۔ پس ایتھنز کے میرے ساتھیو۔ آپ کو زندہ رہنا اور مجھ کو مرنا ہے۔ بہتر کیا ہے، یہ خدا ہی کو معلوم ہے، صرف خدا کو۔'' پھر سقراط نے وہ بات کہی جو زندگی بھر میری بھی دعا رہی ہے۔ ''ایتھنز کے ہم سفر

ساتھیو، مجھے آپ سے ایک گزارش ہے۔ میرے بچوں کی زجروتوبیخ کرو جس طرح میں نے تمہاری زجر کی ہے اگر وہ عزت، حکومت یا دولت کا زیادہ خیال رکھیں اور اپنے روح کی جمالیات کا کم!"

میر کے دین و مذہب کو.....

میں ہمیشہ اپنا مذہب، اپنا فلسفہ حیات، اپنی زندگی کا مُدعا تلاش کرنے کی فکر میں مستعد رہا۔ میری تلاش ہوشیار رہی اور مختلف ذرائع ڈھونڈتی رہی، استعمال کرتی رہی۔ کبھی ذاکر حسین، کبھی پال برنٹن، کبھی مارکسزم میری کھوج کے مینار بنتے رہے۔ وحدانیت کا علم بردار اسلام کہاں اور میرا موروثی روایتی اسلام کہاں جگہ پا گیا اس کھوج میں، اس کی تفصیل ذرا آگے۔ فی الحال یہ کہ جو اسلام میں نے اپنے گھر پر پایا، اس میں کوئی خاص عملی پہلو نظر نہ آتا تھا۔ صرف یہ کہ نماز پڑھی جاتی تھی اور میرے نانا کے طور طریقوں سے پتہ چلتا تھا کہ وہ مسلمان ہیں۔ اس کے علاوہ غفار بٹ بھی نماز پڑھتا تھا، وہی غفار بٹ جو کمر ناگ کار ہنے والا تھا، تانگہ چلاتا تھا اور جب میرے نانا زمین کے بندوبست میں مشغول ہوتے تھے، گھوڑے پر بیس بیس پچیس پچیس میل دوڑتے تھے تو بے چارا غفار بٹ ان کے پیچھے لگاتار دوڑتا تھا۔ اور بھی نوکر نوکرانیاں ہمارے گھر میں ہوتی تھیں مگر اُن سے کوئی خاص اسلامی عمل ظاہر نہیں ہوتا اور نہ میرے والد یا چاچا سے۔ میرا مطلب ہے کہ کوئی روایتی نماز روزہ والی بات میرے مشاہدے میں نہیں آتی تھی کہ جو اسلام کے ظاہری اور روایتی رنگ روپ ہیں۔ مگر جب میں نانا کے گھر جاتا تھا جس نے مجھے گود لیا تھا، میں اس کی بڑی بہن کو مولوی جواد مرحوم کے گھر میں دیکھتا تھا۔ مولوی صاحب آرچ بشپ آف کنٹربری جیسے تھے، زاہد، پرہیزگار اور بہت ہی پاک پاکیزہ شخص۔ جب میں ابھی پانچ سال کا ہی تھا، مولوی صاحب

نے مجھے اذان لکھ کے دی تھی۔ اُن کا عربی خط کتنا ستھرا اور عمدہ تھا۔ مگر پھر بھی جس گھریلو ماحول میں ہم نے آنکھ کھولی، اس میں روایتی مذہب کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ بلکہ کافی تضاد موجود تھا۔ ہمارے گھر میں زندگی گذارنے کے کئی رنگ تھے اور کئی ڈھنگ۔ کچھ بزرگ شراب پیتے تھے، کچھ انگریزی ادب پڑھتے تھے، کئی برطانوی طرزِ زندگی کے متوالے تھے اور سرینگر میں مسیحی مبلغوں کی سی زندگی گذارنے کی سعی کرتے تھے۔ میرے نانا اور دادا کی طرز زندگی میں کافی فرق تھا۔ جب ہم محرم کے دن مناتے تھے جو سیدنا حسین علیہ السلام کی شہادت کی یاد میں منائے جاتے ہیں، ہم کشمیری زبان میں مرثیہ پڑھتے تھے۔ حیرانگی کی بات ہے کہ میرے ممیرے بھائیوں پر رقّت طاری ہوتی تھی اور آنسو بھی بہہ نکل آتے تھے۔ وہ مجھے کہتے تھے کہ جہنم میں جاؤ گے اگر روؤ گے نہیں۔ مگر میں اُن کشمیری مرثیوں کا ایک لفظ بھی سمجھتا نہیں تھا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ میرے سیّد ممیرے بھائی کہتے تھے کہ مجھے جہنم میں جانا ہے اور ان کے لئے جہنم کی آگ سرد ہوگی اس لئے کہ وہ سیّد ہیں۔ اگر وہ گرمیوں کے دنوں میں اس یخ بستگی کی بات کرتے تو مجھے گرمی سے بچنے کی تسلی دیتے۔ بعد میں میں نے سوچا کہ میں جلدی جلدی جل جاؤں گا اگر جہنم میں ایسا انتظام نہ ہوگا کہ جل جل کے اور جلنا ہے اور ہمیشہ کیلئے۔ مگر سیّدوں کو کیا غم۔ ان کے لئے تو بس یخ بستگی ہوگی۔

یہ تو تھیں چھوٹی عمر کی باتیں! بڑا ہو کر جب میں ذاکر حسین صاحب سے ملا اور یوگی پال برنٹن سے تو مجھے مذہبی حقائق سے واقفیت ہونے لگی۔ ذاکر صاحب نے آگرہ سٹوڈنٹس فیڈریشن کانفرنس کے ایڈریس میں نوجوانوں کیلئے تلاش کرنے والا ذہن اور گرم دل مانگ لیا تھا تاکہ وہ شک کے اندھیروں سے ایماں کی کیفیت تک پہنچ جائیں۔ شک کے اندھیرے اور ایمان کی روحانی عظمت مجھے کریدتی رہی۔ میں مولانا آزاد سے گزرتے ہوئے امام غزالیؒ تک جا پہنچا۔ میں نے دیکھا کہ غزالیؒ بغداد میں عظیم پروفیسر کے منصب پر ہوتے ہوئے بھی شک اور انکار کے جاں سوز واردات ٹال نہ سکے۔ جب کافی گھوم گھام کر

واپس آ گئے تو ایماں کی روشنی یا قلبی نور پا کے واپس آ گئے۔ غزالیؒ کی زباں شک اور انکار سے تین سو عظیم شاگردوں کے سامنے بند ہوئی تھی اس لئے کہ تقریباً دو ڈھائی سو سال بغداد اور دیگر شہروں میں یونانی نظریات کا اثر پڑا تھا اور عقل و فکر کی بھول بھلیّوں سے بہت سوں نے اپنے ہوش گنوا دئے تھے۔ مولانا آزاد کے ترجمان القرآن کا پیش لفظ فیضی صاحب نے مجھے پڑھ کر سنایا تھا جس میں مولانا نے کہا ہے انہوں نے اس مذہب پر چلنے سے انکار کیا جو ان کے گھر والوں تعلیمی اداروں اور مذہب کاروں نے اُنہیں سکھایا تھا۔ ۱۹۴۵ء میں غبارِ خاطر سامنے آئی۔ یہ کتاب اگرچہ خطوط پر مشتمل ہے جو مولانا نے اپنے دوستوں کو بھیجے ہیں مگر ہے کام کی کتاب، معانی سے بھری ہوئی اور مدلّل۔ اگر میں اس کتاب کو سال بھر کم سے کم ایک بار نہ پڑھوں، نہ میری روح تسکین پائے گی اور نہ اُردو زبان کا شوق اپنی غذا حاصل کرے گا۔ یہ شوق میں نے جامعہ کے قیام کے دوران پیدا کیا اور اس کے اندر لسانی لطافتوں کے علاوہ پھولنے پھلنے اور روحانی بلندیوں کو چھونے کے امکانات موجود ہیں۔ غبارِ خاطر سے بھی پتہ چلا کہ انکار کفر نہیں، صحت کی، ایمان کی علامت ہے۔ مجھے اپنی زندگی سے بھی اس کا عندیہ ملا تھا۔ اسی کی مدد سے میری زندگی ارتقاء کے مراحل سے گزری ہے۔ مولوی صاحب کیا کہیں کیا نہ کہیں میں ہمیشہ صراطِ مستقیم پر تھا۔ ارک فرام "آزادی کا خوف" میں لکھتا ہے کہ ایماں کی ضرورت ہمیشہ محسوس ہوتی ہے۔ یہ ظرف، یہ صلاحیت انسان کے اندر موجود ہے مگر دورِ جدید نے ایسے حالات پیدا کئے ہیں کہ اس کے دب جانے کا امکان ہے۔

میں جامعہ میں ۱۹۴۴ء سے ۱۹۵۰ء تک رہا۔ وہاں کا ماحول اسلامی تھا اور اسلام پر عمل کیا جا رہا تھا۔ وہاں بڑی بڑی بحثیں ہوتی تھیں۔ ذاکر صاحب، مجیب صاحب، عابد صاحب، شفیق الرحمٰن قدوائی اور مولانا اسلم جیراج پوری صاحب اور دیگر معروف و مشہور پروفیسران میں حصہ لیتے تھے۔ یہ سب صاحبانِ نظر ایک ہی قسم کے قلبی واردات سمیٹے نہیں بیٹھے تھے۔ کبھی کبھی، ان کے فکر، ان کے خیالات میں ایسا ٹکراؤ پیدا ہوتا تھا کہ ذہنی دریچے

کھُل جاتے تھے اور نئی نئی باتیں سامنے آتی تھیں۔ مثلاً اسلم جیراجپوری صاحب کی بات کریں۔ بڑے نڈر قسم کے دینیات کے ماہر تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کی تاریخ ''تاریخ الاُمت'' آٹھ جلدوں میں لکھ ڈالی۔ جامعہ میں اسلامیات کے پروفیسر تھے۔ میں ۱۹۴۵ء میں ایک دن اس بزرگ ہستی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ نہایت ہی سنجیدگی سے اور بزرگانہ لہجے میں بول اُٹھے۔ ''روسی ہم سے بھی زیادہ مسلمان ہیں''۔ اُن کا مطلب کیا تھا، مجھے معلوم نہیں مگر میں نے وہی سمجھا جو علامہ اقبال نے تشکیل جدید الٰہیات اسلامی (Reconstruction of Religions Thought in Islam) میں کہا ہے اور وہ بھی پیش لفظ میں ہی۔ فرماتے ہیں کہ قرآن پاک میں زیادہ تر رجحان اس طرف ہے کہ ''فکر'' سے زیادہ ''عمل'' پر زور دیا جائے۔ مسلمانوں کی عام عادت یہ ہے کہ دینیات کے بارے میں بھی لمبی چوڑی بحثیں کرتے ہیں اور تجزیہ پر تجزیہ۔ ان باتوں میں جنت بھی ہے اور جہنم بھی۔ پل صراط بھی جو بال سے بھی زیادہ نازک ہے، پائجامے کا پہناوا ٹخنوں سے اوپر بھی اور کتنا اوپر، وغیرہ۔ ان باتوں کی طرف انسان کا دھیان سُن سُن کے ختم ہو جاتا ہے۔ میں شادی کے ایام تک نماز پڑھتا تھا مگر روزہ اب بھی رکھتا ہوں۔ مطلب یہ کہ اُس وقت تک رکھتا تھا جس وقت تک پت کا آپریشن ہوا اور ڈاکٹر نے فاقہ نہ رہنے کی تلقین کی۔ ایک دن جولائی کے مہینے میں ململ کا کرتہ پہنے ہوئے نماز پڑھ رہا تھا کہ ایک بھڑ اندر چلی گئی، میرا سارا جسم چھالوں سے بھر گیا۔ میں نے سمجھا کہ یہ کھلی فضا میں نماز پڑھنے کی قربانی ہے اور وہ بھی بے حد۔ اُن دنوں جامعہ میں بجلی نہیں ہوتی تھی۔، ہم گیس لمپ جلاتے تھے۔ گیس لمپ کی روشنی سے یہ سارے بھڑ وغیرہ جمع ہو جاتے تھے انسان کا قافیہ تنگ کرنے کیلئے۔ مگر جامعہ کا ماحول پاکیزہ تھا۔ لوگ دیانت دار تھے، نماز پڑھتے تھے اور حقیقتاً اللہ پاک کا قرب چاہتے تھے۔ درویشانہ زندگی کا چلن تھا اس لئے لوگ کم معاوضے پر کام کرتے تھے۔ جذبۂ ایثار نے سبھوں کو قربانی کی حد تک تیار کیا تھا۔ قول و فعل میں تضاد نہیں تھا۔ جو زبان سے کہا

جاتا، عمل میں لایا جاتا۔ اس ماحول میں میں قول و عمل کی تربیت پاتا تھا۔ جامعہ میں جب سلور جوبلی منائی گئی تو محمد علی جناح، لیاقت علی خان اور حفیظ جالندھری جیسے بڑے لوگ وہاں موجود تھے۔ اس کے علاوہ جامعہ کے پریذیڈنٹ اور چانسلر، بھوپال کے نواب، جواہر لعل نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، آصف علی خان، راج گوپال اچاریہ جیسی مہان ہستیاں بھی موجود تھیں۔ راج گوپال اچاریہ عبوری حکومت کے وزیر تعلیم تھے۔ ۱۹۴۶ء کا زمانہ تھا۔ میں نے پندرہ دن پہلے ہی شادی کی تھی تاکہ مری گھر والی بھی جشن سیمیں (سلور جوبلی) میں شرکت کرے اور قلب و نظر تعلیمی اور تہذیبی ارم کی ہواؤں میں کِھلتا دیکھے۔ یہ جامعہ کی قوت تھی اور جامعہ کی دینداری جو برصغیر میں انقلاب لانا چاہتی تھی۔ اندھی اور کھوکھلی تقلید سے لاتعلقی ایک طرف، گھریلو زندگی کے متضاد اقوال و افعال (مذہب کی نسبت سے) دوسری طرف، جامعہ کی زندگی کیساتھ جڑی ہوئی تعمیری و تخلیقی مذہبی سرگرمیاں تیسری طرف، میں کبھی مجلسی زندگی کو ٹٹولتا رہا اور کبھی اپنی روح کی گہرائیوں میں اُترنے کی کوشش کرتا رہا۔ میں تضادات سے دوچار ہوتا رہا مگر تضادات سے کبھی گھبراہٹ نہ ہوئی۔ کبھی کبھی میرے شاگرد بھی میرے تضادات پر خفگی کا اظہار کرتے رہے اور کبھی کبھی میری اپنی داخلی زندگی مجھے قوّت بخشتی رہی اور میں آگے بڑھتا چلا۔ مجھے کسی نے نماز نہیں سکھائی اور نہ یہ کہ نماز کس طرح پڑھتے ہیں، اس لئے نماز کا عربی طریقہ میں نے سیکھا نہیں۔ میں نے جب بھی نماز پڑھی، انگریزی میں پڑھی۔ مگر تین چیزیں میں عربی میں پڑھتا رہا اور اب بھی پڑھتا ہوں۔ کلمہ جس سے انسان مسلمان بننے کا دعویٰ کرتا ہے۔ سورہ فاتحہ جو ربُ العالمین اور صراط المستقیم کا نور سینے میں فروزاں کرتا ہے۔ سورۂ اخلاص پڑھتا ہوں۔ (خدا ایک ہے۔ وہ ہر لحاظ سے خود کفیل ہے۔ وہ کسی سے پیدا نہ ہوا اور نہ کوئی اس سے پیدا ہوتا ہے۔ کوئی اُس جیسا نہیں)۔

۱۹۷۷ء میں جب شیر کشمیر بیمار ہوئے اور جب جگ جیون رام نے کہا کہ شیخ صاحب اب مہمان ہیں اس لئے کشمیریوں کو کچھ اور سوچنا چاہیے، میں نے نیّت باندھی

کہ اگر شیخ صاحب صحت یاب ہوئے تو میں زائد روزے (نفل) رکھوں گا۔ یہ کہاں تک صحیح تھا مجھے معلوم نہیں مگر یہ ضرور معلوم ہے کہ ۱۹۸۲ء میں جب وہ چیف منسٹر تھے اور میں محکمہ تعلیم کا کمشنر، مجھے خیال آیا کہ ہمارے پاس ایک اسلامک لائبریری ہونی چاہیے۔ ۱۹۷۲ء میں میں نے مجیب صاحب کو اسلام پر ایک کتاب لکھتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں نے دیکھا تھا کہ وہ داؤد رہبر کی کتاب ''اللہ انصاف کا مالک الملک ہے'' (Allah, Lord of Justice) پڑھ رہے تھے اور کینتھ کریگ کی دو کتابیں، دی ایونٹ آف دی قرآن (The Event of the Quran) اور دی مائنڈ آف دی قرآن (The Mind of the Quran)۔ میرے دل پر اس کا اثر پڑ گیا۔ مگر دس سال کے بعد یہ دبی ہوئی خواہش میں نے شیخ صاحب سے ظاہر کی کہ کیوں نہ ہم اسلامک لائبریری بنائیں۔ شیخ صاحب نہ سنتے تو اور کون سنتا۔ انہوں نے کچھ پیسے دیئے اور میں نے پروفیسر سرور حسین صاحب کو ساتھ اُٹھایا جو ان دنوں اسلامیہ کالج سرینگر کے پرنسپل تھے۔ ہم کتابیں ڈھونڈھنے دلّی چلے گئے۔ کناٹ پیلس میں رام کرشنا بک شاپ والوں نے مجھے ایک چھوٹی سی سیڑھی دیدی جس پر اوپر چڑھ کر میں کتابیں ڈھونڈھنے لگا۔ وہاں ہی میں نے کینتھ کریگ کی دونوں کتابیں دیکھیں اور دوسری کتابوں کے ساتھ اُٹھالائیں۔ اسلام کے چودہ سو سال گزر چکے تھے اور کشمیر میں اسلام کی شاندار تہذیب منانے کی تیاریاں زور و شور سے ہو رہی تھیں۔ میں نے دلّی سے اسلام پر باتصویر یا تصویروں کے بغیر جو کتابیں خرید کر لائی تھیں، ان کو مدنظر رکھتے ہوئے ٹیچرس ٹریننگ کالج میں اسلام پر نمائش کرنے کی ٹھان لی۔ اس کا ذکر آچکا ہے۔ شیخ صاحب نے پندرہ منٹ گزارنے کا وعدہ کیا تھا مگر وہ گھنٹوں دیکھا کئے کہ اسلام نے دنیائے انسانیت کو کیا دیا تھا اور اسرار و رموز کا انکشاف کرنے میں کیا گرانقدر اور بے مثال کام کیا تھا۔ شیخ صاحب نے اُن کتابوں کو بھی دیکھا جو ہم نے اسلامیہ کالج کی لائبریری کے لئے دلّی میں خریدی تھیں اور جنہیں نمائش میں رکھا گیا تھا۔ میں ایجوکیشن کمشنر کے عملے کے نیچے

اتنا دب گیا تھا کہ اس نمائش میں میں نے پورے تین مہینے صرف کیے مگر بعد میں کچھ اور ہوا جس کی وجہ سے میں نے اپنا عمامہ شریف دُور پھینک دیا۔ میں نے جموں میں عالمی تہذیب وتمدن پر اور مہاتما بدھ کے زمانے کے حوالے سے نمائش کا اہتمام کیا تھا۔ اس مضمون پر بھی بہت اچھی کتابیں دستیاب تھیں، تصاویر موجود تھیں اور پتھروں پر بنائے گئے نقوش، نمونے۔ مگر شیخ صاحب نے آنے سے انکار کیا حالانکہ میں نے کہا تھا کہ ہم ایک کالج میں اسلام کی عظمت پر نمائش کریں گے اور دوسرے کالج میں ہندوستان کی عظمت پر۔ ملازمت کے دوران شاید یہ میرا آخری حملہ تھا اس مذہبی تعصب اور تنگ نظری پر جو مسلمان اور ہندو دونوں کے دلوں میں جگہ پا گئی تھی۔

میں نے ابھی کینتھ کریگ کی کتابوں کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ دو کتابیں اسلام سمجھنے اور اسلام اختیار کرنے کیلئے ایک صحت مند اور سائنسی باب کھولتے ہیں۔ میں نے The Event of The Quran کے پہلے ہی پچیس صفحوں میں اپنے آپ کو بدلتے ہوئے محسوس کیا۔ اس کے بعد میں دنیائے مذہب کو کھلی آنکھ سے دیکھنے لگا۔ ایونٹ اور مائنڈ دونوں کتابیں میں نے بار بار پڑھی ہیں اور اپنے عقائد اور ایماں کو پختہ سے پختہ تر بنانے کی سعی کی ہے۔ برسبیل تذکرہ کہا جائے کہ کینتھ کریگ کینس کالج کیمرج میں پادری (Bishop) تھا۔ اُنہی دنوں اُس نے یہ دونوں کتابیں لکھیں مگر وہ مسیحی مبلغ بھی تھا۔ میں بتانا چاہوں گا کہ وہ مشرق وسطیٰ کی کسی یونیورسٹی شاید بیروت میں گیا تھا وہاں اٹھارہ اُنیس سال کے مسلمان بچے اس سے ملنے آتے تھے۔ یہ بچے اسلام اور قرآن کے بارے میں اس سے گفتگو کرتے تھے۔ وہ ان کی دل بری کرتا تھا مگر اُن کی باتوں کو سنجیدگی کے ساتھ سنتا تھا، ان پر غور کرتا تھا۔ وہ دیگر ذرائع بھی استعمال کرتا تھا جن میں کتابیں شامل تھیں۔ اس طرح وہ اسلام فہمی میں منہمک رہتا تھا۔ میری رائے میں اس طرح کریگ اسلام جاننے والوں میں اچھے عالم کی حیثیت سے شامل ہو گیا۔[1] یہ اس کے باوجود ہوا کہ کریگ مسیحی مبلغ تھا۔ کریگ

۱۔ اس کی ایک مثال مائنڈ کے صفحہ نمبر ۸۰ سے دی جا سکتی ہے۔ ثنائے رب الارباب انسان کی زندگی میں کیف وسرور پیدا کرتی ہے، حیات کی گہری رمزیت کھول کے رکھ دیتی ہے اور ششدر کر دیتی ہے۔

کی قرآن پر کتاب کو براس فاونڈیشن ایلی نوائے (Illinois) نے اس دہائی کی بہترین کتاب قرار دیا تھا۔ براس کھرپ پتی تھا۔ اس کا بیٹا مر گیا تھا۔ اس نے بیٹے کی یاد میں فاؤنڈیشن کھڑی کی تھی۔ فاؤنڈیشن ہر دہائی میں مذہبی علم پر ایک کتاب چھاپتی تھی۔ کریگ کو شرف حاصل ہوا کہ اس فاؤنڈیشن نے اس کی کتاب ایونٹ کا انتخاب کیا۔ اس کتاب کا میرے اوپر اتنا گہرا اثر پڑا کہ میں جگہ جگہ اس کا تذکرہ کرتا گیا۔ ۸۲۔۸۳ء میں جب ایس پی کالج میں میں نے اس کا ذکر چھیڑا تو قرآن پڑھنے والوں اور انگریزی جاننے والوں نے کہا ہاں سچ مچ کریگ کی کتاب بہت اچھی ہے۔ سرینگر میں بہت سوں نے کریگ کی سراہنا کی مگر کچھ نکتہ چین بھی نکلے۔ فضل الرحمٰن نے اس کتاب کو بہترین کتاب قرار دیا تھا۔ یہ وہی فضل الرحمٰن ہے جسے عالم و فاضل ہوتے ہوئے بھی پاکستان نے ملک بدر کیا۔ کریگ ہندوستان بھی بعد میں آیا اور یہاں تقریریں کیں۔ ''قلم اور ایمان'' (The Pen and the Faith) میں آٹھ شخصیتوں کا انتخاب کیا جن میں مولانا ابوالکلام آزاد کا ذکر پہلے ہے۔ سید قطب، علی شریعتی وغیرہ بھی اس میں شامل ہیں۔ مولانا آزاد کے بارے میں کریگ نے کہا کہ جس شخصیت کو لوگوں نے پہچانا نہیں، جس کی مذمت کی گئی، جسے ایذا دی گئی، وہ آزاد ہیں۔ ایسی شخصیت کی موت کو موت نہیں بلکہ شہادت کہنا بجا ہے۔ اقبال کے بارے میں اس نے بہت اچھے الفاظ استعمال کئے ہیں، ان کی عظمت کی تعریف کی ہے مگر یہ بھی کہا ہے کہ اقبال بہت اونچا پرواز کرتے ہیں مگر بالآخر یکدم اُن کا دم پھول جاتا ہے اور وہ واپس چلے جاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ سالہا سال سے میں نے کہا ہے اور اور بھی کہتا ہوں کہ انسان جب تک دو جنمی نہ ہو جائے، اس کی تکمیل اور اس کی روحانی نشو ونما نہیں ہو سکتی۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ انسان جب اپنی ماں سے جنم لیتا ہے تو وہ اُس کا پہلا جنم ہوتا ہے مگر جب اس کا جنم اپنی ذات سے ہوتا ہے، تو دوسرا جنم کہلاتا ہے۔ پروفیسر محمد حبیب نے میرے آٹو گراف میں ۱۹۴۴ء میں لکھا تھا۔ ''خدا کی بادشاہت تمہارے اپنے ہی دل

میں ہے۔تم اس شہنشائیت میں داخل نہیں ہو سکتے اگر تمہارا دوسرا جنم نہ ہو جائے۔حبیب صاحب نے جو کچھ لکھا تھا۔وہ عیسائی مذہب کا ہی سنہرا اصول نہیں بلکہ ہر مذہب میں سراہا جا رہا ہے۔میں جرأت سے کہتا ہوں کہ اسلام میں میرا دوسرا جنم کریگ کی کتابوں سے ہوا۔ ان میں ایونٹ اور مائنڈ سرفہرست ہیں۔میں اُس وقت ساٹھ سال کا تھا۔میں نے کریگ کی کتابیں سمجھیں اور ان کی داخلی روپ ریکھاؤں سے بھی واقف ہوا۔مجھے اسلام کا جمال تاریخ کی ایک تحریک کے طور پر ہی نظر نہ آیا، بلکہ اس کی وسیع اور گہری سے گہری دنیا میں بھی دکھائی دیا۔یہ جمال عظمت اور جلال کو لئے ہوئے آگے بڑھ رہا ہے۔پندرہ سولہ سال میں میں نے اسلام پر چیدہ چیدہ کتابیں جمع کی ہیں۔یہ کتابیں اسلام کا وسیع مطالعہ ہے اور ان کے اندر عجیب وغریب اسرار چھپے ہوئے ہیں۔اس دوران میں میں نے پروفیسر ہاجسن کی کتاب The Venture of Islam پڑھی۔اس نے شکاگو میں اسلام اور اس کی تہذیبی اور تمدّنی اہمیت پچتالیس سال تک پڑھائی۔ہاجسن سماجیات (Committee for Social Thought) کے پروفیسروں کی جماعت سے تعلق رکھتا تھا۔اس کتاب کو ہاجسن کی بہترین تصنیف قرار دیا گیا ہے اور شاندار کارنامہ۔نیویارکر (New Yorker) نے کہا ہے کہ ہاجسن کی طرح اگر کوئی شخص کتاب لکھے تو تاریخ کا مثالی نمونہ سامنے آئیگا۔اس کتاب کی تین جلدیں تین سال تک میرے مطالعے کا ہدف بنتی رہیں۔میری چھوٹی بیٹی سمیتا 1986-87 میں جب یہاں کشمیر آئی تو میں نے اس سے ہاجسن کی کتاب سے مسلم انڈیا کا باب پڑھوایا۔[1] یہ عجیب بات ہے کہ مارشل ہاجسن کی کتاب میں کوئی بھی باب پاکستان پر

ا۔ سمیتا نے ٹیکساس یونیورسٹی میں تین سال گزارے تھے اور ریاضی، منطق اور کمپیوٹر سائنس کا مطالعہ کیا تھا۔وہاں اس کا بھائی بھی کام کر رہا تھا۔۱۹۸۷ء میں وہ پروفیسر فلپارٹ کی تقاریر سے اتنی متاثر ہوئی کہ اس نے اپنا مضمون بدل ڈالا۔میرالڑکا اقبال آغا مسوچسٹس یونیورسٹی میں گیا اور سمیتا کا ایڈمیشن سمتھ کالج میں کرایا۔اُسے وہاں ایک سال زائد گزارنا پڑا تاکہ ریاضی وغیرہ چھوڑ کر تاریخ کی جانب سفر ممکن ہو۔اس نے امریکہ پہنچنے کے تین دن بعد فون پر بہت خوش ہو کر بتایا کہ ہاجسن کی کتاب امسال بی اے فائنل ائیر میں شامل کی گئی ہے۔

نہیں۔اس نے لکھا ہے کہ جس طرح پندرہ فیصد مسلمان ساری دنیا میں رہتے ہیں اسی طرح ہندوستان کی کُل آبادی کا پندرہ فیصد حصہ مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ دُنیا میں کسی جگہ اتنی تحقیق، اتنی تخلیق اور اتنی تدوین نہیں ہوتی جتنی کہ یہاں ہندوستان میں اور وہ بھی بہترین طریقے پر۔اس سے مراد ہے کہ پاکستان میں بھی اتنا اچھا کام ہو نہیں پاتا۔غور کرنے کی بات ہے کہ اسلامی نمائش میں مجھ جیسا مارکسی اس کتاب سے کیسے متعارف ہوا۔اس کتاب نے مجھے اور بھی بہت کتابیں جمع کرنے کی تحریک بخشی۔مگر گراں بازاری کا مسئلہ درپیش تھا۔اس لئے میں پہلے جامعہ سے کتاب منگواتا، اس کی کاپیاں تیار کراتا اور پھر لوگوں میں بانٹتا۔اس طرح تنگدستی کا بھی مداوا ہوتا تھا اور اسلام فہمی کا بھی چارہ ہوتا تھا۔ میں نے تقریباً پچاس ایسی کتابیں جمع کی ہیں جو یقیناً بہت ہی نادر کتابیں ہیں۔ان میں جوزف نیڈم کی کتاب Science and Civilization in China بھی ہے۔اس کی بارہ جلدیں ہیں۔ یہ کتاب بیسویں صدی میں چھپی ہوئی کتابوں میں عظیم ترین کتاب مانی جاتی ہے۔ جوزف نے علم حیوانات و جمادات پڑھا ہے اور انہیں ایف آر ایس حاصل ہوا ہے۔نیڈم دوسری جنگ عظیم میں چین چلا گیا اور بیس تیس سال میں یہ کارنامہ انجام دیا۔ یہ جوزف نیڈم کا کتنا شاندار کمال ہے۔لوئی مسی نون کی حیرت انگیز کتاب ''حلاج منصور کا ذوق وشوق'' (The Passion of Hallaj) بھی قابل ذکر ہے جس کی چار جلدیں میں نے حاصل کیں۔ مسی نون نے باسٹھ سال اس کتاب کی تکمیل میں گزارے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد میں نے جگہ جگہ اس کتاب کا تذکرہ کیا۔مجلسوں محفلوں میں، گھر پر، دوستوں کے ساتھ، طلبا اور طالبات کے ساتھ۔اس طرح یونیورسٹیوں اور کالجوں میں اور ہر جگہ میں نے اپنا زاوئیہ نگاہ واضح کیا۔ان کتابوں کے بیچوں بیچ میں نے اپنا نظریہ پیش کیا تاکہ اکابر میرے تخیلات اور عقائد کی صحت کی شہادت دیں۔ میرا زاوئیہ نگاہ میرا دوسرا اور اصلی جنم ہے۔اس اصلی جنم میں حسین حلاّج منصور کا لہو کام آیا اُس جنّت الفردوس کے

طبقات سجانے میں جن کے اندر لافانی پھولوں کے تختے کھلے ہیں، جن کے اندر بیٹھ کر نہ نیند ہے نہ تھکاوٹ، نہ بے زاری، نہ بے قراریٔ جہل! ہم نے حلاّج کی کتاب امریکہ میں چار سو ڈالر میں خریدی۔ اس کتاب کا وزن اتنا زیادہ ہے کہ اس کا سری نگر لایا جانا ممکن نہ ہوسکا۔ میں کبھی روایت پرست نہ بنا۔ نہ کوئی خارجی مذہبی رسم پورا کرسکا۔ مگر اسلام کا داخلی اور حرکی عنصر جس نے آفاق میں زلزلہ پیدا کیا اور تاریخ کا اہم باب بنا، میری توجہ کا مرکز رہا۔ میری کوشش رہی کہ کتابیں بانٹنے سے، تقریروں سے، مجلس آرائی سے، خیالات بانٹنے سے یہ حرکی عنصر عام ہوجائے اور لوگ واقف ہوجائیں کہ بنی آدم کی روح کیسے رقص کرتی ہے اور اس رقص سے وہ کس طرح لافانی ہوجاتا ہے۔ میری روزمرہ کی زندگی میں اس حرکی عنصر کا کافی عمل دخل ہے اور ان مصنفین کا جنہوں نے مجھے اس عنصر سے روشناس کیا۔

۱۱/۹ کے بعد میرے دوست فاروق کاٹھواری صاحب نے مجھے ایک جگہ پہنچایا جس کا نام شاید ویسٹن (Weston) ہے۔ یہ جگہ نیویارک کے قریب ہے۔ وہاں چالیس پچاس اشخاص تھے جن میں کچھ سفیر تھے۔ ان کے سامنے میں نے اسلام پر تقریر کی۔ میں نے بار بار کہا کہ میں مسیحی مبلغ کی وساطت سے اسلام میں ساٹھ سال کی عمر میں پیدا ہوا۔ پھر ''حلاّج منصور کا ذوق وشوق'' کتاب کا 198 (جلد اول) واں صفحہ ان میں بانٹ دیا۔ میں نے کہا تیس سال تک میں نے روایتی تاریخ، یورپ کی تاریخ، دنیا کی تاریخ پڑھی تھی۔ میں نے یونان، روم، موسوی اور عیسوی ورثہ کی حتی الوسع جانکاری حاصل کی تھی۔ اسی طرح مصر سے ہوتے ہوئے رینا سینس اور ریفارمیشن کا جام پیا تھا۔ مگر اب مسی نون سے پتہ چلا کہ رینا سینس تو پہلے بغداد میں ہوا تھا۔ بغداد کا رینا سنس تاریخ میں پہلا احیاء العلوم تھا۔ یونان کے جو علوم دفن ہوگئے تھے، وہ آٹھویں اور نوویں صدی میں بغداد اور دوسرے شہروں میں پھر زندہ ہوگئے۔ بڑی بڑی کتابیں اور کارنامے جو یونانی اور سنسکرت زبان میں موجود تھے، عربی میں ترجمہ ہوئے۔ کیسے کیسے علماء وفضلا تھے جنہوں نے معانی سمجھائے،

وضاحتیں کیں اور سارے عالم کو اسلام میں سمو دیا۔ ابن رُشد جس نے ارسطو کو اپنی تقریر و تحریر سے زندہ کر دیا، ان عالموں میں موجود تھا۔ اس طرح ارسطو کی جائیداد ابن رشد نے تیرہویں اور چودھویں صدی میں یورپ پہنچادی۔ مگر دوسرے رینا سنس کی بھی لوئی مسینیوں نے بات چھیڑی کہ یہ سارا عربی مواد کچھ بڑھا کر بارہ ویں صدی میں لاطینی اور عبرانی زبان میں لایا گیا۔ یہ اُن علماء کا کارنامہ تھا جو سپین میں مسلمانوں کے ساتھ اکٹھے کام کر رہے تھے۔ عبرانی اور لاطینی زبان میں لایا ہوا علمی مواد ہی یورپ پہنچ گیا۔ دیکھئے جو چیز مبالغہ دِکھتی ہے وہ دراصل یہ ہے کہ یونانی فکر ونظر عیسائی شام سے مسلم سپین پہنچ گیا اور پھر واپس یورپ۔ یہ صدیوں کی کہانی ہے۔ کلیلہ ودمن نویں صدی میں بغداد میں سنسکرت سے عربی میں منتقل ہوئی۔ بغداد میں کتنے ہی سنسکرت علماء کارفرما تھے۔ ماموں نے مختلف جگہوں پر گھوڑے رکھے تھے تاکہ ایک عیسائی پروفیسر کے پاس جا کر ماموں کیلئے ریاضیات کے مسائل حل کرائے جائیں۔ یہ عیسائی پروفیسر ریاضیات کا نامی پروفیسر تھا۔ بغداد میں بارہ سو (1200) لائبریریاں تھیں اور تیرہویں صدی میں وہاں کی آبادی بیس لاکھ (20,00,000) تھی۔ اس وقت لندن کی آبادی صرف ایک لاکھ (100,000) تھی۔ پیرس کی آبادی اس سے بھی کم لگ بھگ نوے ہزار (90,000)۔ درجنوں دانش گاہیں (Universities) تھیں جن میں اعلیٰ قسم کے دانشور کام کرتے تھے اور فیضان علم وہنر میں مصروف کار۔ امرتا سین نے کہا ہے کہ جب جیمز (James) نے تاریخ لکھی تو کہا کہ ان کی لائبریری سے صرف دس کتابیں سارے سنسکرت مواد کو شرمندہ کر سکتی ہیں۔ اُس نے کہا کہ گیارہویں صدی کے شروع میں ابوریحان البیرونی نے سنسکرت، پالی اور پراکرت پڑھی اور ''کتاب الہند'' لکھی۔ یہ ہندوستان کی تہذیب وتمدن پر سب سے بڑی کتاب ہے۔

مجھے عمر بھر جن مصنفین اور لوگوں سے واسطہ پڑا اور جن سے میں نے فیض حاصل کیا، ان سے مجھے عاجزی اور انکساری ملی اور وہ قوت بھی جس کی بنیاد پر میں اپنے پاؤں پر کھڑا

ہوں اور اسلام اور دیگر مذاہب کا جائزہ ایک مسلمان کی حیثیت سے لے رہا ہوں۔ میرا پختہ یقین ہے کہ تقابلی مذہب اور تہذیب کے سماجی پس منظر کے بغیر لوگ حقیقی مذہب کے گل و گلزار میں نہیں پہنچ سکتے۔ اس کی بدولت ہی فرجاف شوان مذہب کے مافوق الفطری (metaphysical) حقائق کی نقاب کشائی کرتا ہے اور یہ کام اس کا مایہ ناز کارنامہ ہے۔ شوان کے بارے میں پیغمبر اسلام کا سوانح نگار مارٹن لنگز (Martin Lings) کہتا ہے کہ جب شوان کسی مذہب سے دوچار ہوتا تھا، اسے آرام نہیں ملتا تھا جب تک اُس مذہب کا عاشق نہ بنے۔ یہ عاشق بننا کنجی ہے تہذیبوں، تمدنوں اور مذاہب کے سمجھنے کی۔ نزاع، فتنہ و فساد، بغض و عناد مذہب کو، روح کو غارت کرتے ہیں۔ یہ مذموم فتنے دراصل امارت، جائیداد اور استحصال سے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر کوئی آدھی روٹی کھاتا ہے تو وہ اس آدمی سے ضرور ڈرتا ہے جس کا پیٹ بھوک سے جلتا ہوگا۔ ہم نہیں چاہتے کہ امارت کو غارت کریں اور لوٹ مار کریں مگر ہم ضرور چاہتے ہیں کہ کھربوں ڈالر جو تباہی کیلئے استعمال کئے جاتے ہیں، کھربوں ڈالر جو لہو و لعب اور مذموم قسم کی عیش و عشرت پر لٹا دئے جاتے ہیں، بنی نوع انسان خاص کر غریبوں کا پیٹ پالنے کیلئے اور انہیں بھی زندگی کا حق دینے کیلئے استعمال کئے جائیں۔ وقت کی پکار یہی ہے اور اس سے صحیح مذہب کی رُوح پیدا ہوگی اور استحصالی مذہب کا بستر دھیرے دھیرے گول ہوگا۔

میں ۱۹۸۲ء کے زمانے میں اسلام کی صحیح تعبیر سے واقف ہوا۔ اس کی کچھ تفصیل دی گئی ہے اور کچھ یوں ہے۔ اگر ہم ساری دنیا کو سامنے رکھیں اور اسلام کو ایک تحریک کی حیثیت سے جانچ لیں، تو ہمیں نظر آئیگا کہ اس مذہب نے دنیا کو ہلا کے رکھدیا۔ سینکڑوں سال اسلام کا عروج بڑھتا گیا اور اپنے پیچھے بے مثال روایات چھوڑ گیا، سپین سے لیکر چین کی سرحدوں تک۔ وسیع القلب رواداری، اقلیتوں کی حوصلہ افزائی، عراق (بغداد)، ایران، سپین اور سینکڑوں ایسی جگہوں پر دیکھی گئی تا کہ اقلیتیں حکومت کے اندر گھس کر کام کر سکیں۔ کس طرح اصولوں کا پابند اور روایتی اسلام انسان دوست اور روح پرور اسلام کے شانہ

بشانہ چلا۔ سپین سے جب مسلمانوں کو نکال دیا گیا، یہودیوں کو بھی نکال دیا گیا مگر یہودیوں کو رعایت دی گئی کہ وہ عیسائی مذہب اختیار کریں۔ کئی ایک نے عیسائی مذہب اختیار تو کیا مگر جان بچا نہ سکے۔ ان پر الزام لگایا گیا کہ وہ چوری چھپے یہودیوں کا مذہب اختیار کئے ہوئے ہیں اور یہودیوں کی طرح عبادت کرتے ہیں۔ مگر سلطنت عثمانیہ نے اُنہیں کُھلے دل سے قبول کیا۔ عثمانیہ سلطنت قسطنطنیہ میں ۱۴۵۳ء میں قائم ہوئی تھی۔ پس پچاس سال میں چالیس ہزار سے پچاس ہزار یہودی ترکی میں داخل ہوئے تو ان کا خوش آمدید کیا گیا۔ کون کس منہ سے کہے گا کہ مسلمان تنگ نظر تھے، متعصب تھے اور تشدّد پسند۔ یا یہ کہ وہ وسیع القلب نہیں تھے اس لئے مذہب کے جنوں میں ادھر اُدھر مارے مارے پھرتے تھے۔ براؤ ڈیل ہو یا لوئی مسی نون یا کوئی اور اُن جیسا، انہوں نے مسلمانوں کی دریا دلی اور ان کی بے مثال مہمان نوازی کا اعتراف کیا ہے۔ یہ مہمان نوازی یہاں بھی تھی اور وہاں بھی یعنی جہاں جہاں مسلمان موجود تھے، وہاں۔ جب وہ دیہات میں لوگوں سے ملتے، مختلف قسم کے روایات کا سامنا کرتے، مختلف عقائد کو دیکھتے تو کھلے دل سے نیاز مندی کے تعمیری اور تخلیقی رجحانات قبول کرتے۔ ہمارے ہاں طیّب جی اور فیضی صاحب دونوں مسلمانوں کی مہمان نوازی کی سراہنا کرتے ہیں۔ فیضی صاحب نے جن الفاظ میں مسلمانوں کی خوشنما دریا دلی کی وضاحت کی ہے، وہ زبان پر بار بار لانے کے لائق ہیں۔ وہ مصر کے سفیر رہے ہیں۔ انہوں نے دنیا دیکھی ہے۔ بڑے لوگوں اور مؤرخوں سے ملاقاتیں کی ہیں جو مسلمانوں کی نفسیاتی حالات اور ان کی رگ رگ سے واقف ہیں۔ جس بناء پر انہوں نے کہا ہے کہ مسلمان دریا دلی اور مہمان نوازی کی بے مثال روایات چھوڑ گئے ہیں اور وہ بھی رنگا رنگ۔ زبان، مذہب، تہذیب اور دیگر شعبوں میں انہوں نے بڑی فیّاضی سے کام لیا ہے اور بہترین چیزوں کو اپنایا ہے۔ اس سے وہی لوگ منکر ہو سکتے ہیں جو تنگ نظر اور متعصب ہوں۔ مگر جب امپریلزم آیا اور نوآبادیاتی وبا نے مسلمانوں کو گھیر لیا، تو وہ تخلیقی اور تعمیری

اسلام رفتہ رفتہ فنا ہونے لگا۔ تین بڑی سلطنتیں قائم ہوگئیں، سلطنت عثمانیہ ترکی میں، صفوی سلطنت ایران میں اور مغل سلطنت ہندوستان میں۔ انہیں بارود کی حکومتیں کہا جاتا ہے۔ گو کہ ان شہنشاہی مملکتوں نے وہ تخلیقی کام نہ کیا جو اسلام نے کیا تھا، تاہم اس دوران بھی فنِ تعمیر اور دیگر فنی شعبہ ہائے زندگی نے کمال کر دکھایا۔ میں نے صنعتی انقلاب کے بارے میں بہت کچھ پڑھا ہے اور مسلمانوں کے زوال اور ان کی بدصورت گراوٹ کے بارے میں، مگر زوال آیا تو غربت اور حرمان نصیبی آئی۔ عثمانیوں نے جنگ عظیم میں بیس لاکھ آرمینیا کے لوگوں کو موت کے گھاٹ اُتارا۔ ہمارے سماج میں اور اردگرد پاکستان اور دیگر مسلم ممالک میں کسی بھی وقت کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ وحشت طاری ہوتی ہے جب مذہبی جنون اور اندھی تقلید آنکھوں کے سامنے آگ کی طرح پھیلتے دیکھی جاتی ہے۔ اس کی وجہ شہروں اور قصبوں میں رہنے والے نچلے درمیانی طبقے ہیں جن کی زندگی کے طور طریقوں نے ہر مذہب، ہر تہذیب اور ہر تمدن کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کیا۔ ارک فرام Erich Fromm سے بہتر کسی شخص نے اس کی بہتر وضاحت نہیں کی ہے۔ فرام کی کتاب ''آزادی کا خوف'' میں درج ہے کہ جرمنی میں یہ نچلا طبقہ بغض وعناد میں بہت زیادہ راغب تھا۔ گوئٹے، شیلر، باخ اور بیٹوون جیسی شخصیتوں نے جو تہذیب انسانی ہمدردی اور انسانیت کیلئے پیدا کی تھی، وہ نچلے درمیانی طبقے نے بے دردی سے غارت کردی۔ نازیوں نے کتابیں جلا ڈالیں اور سب کچھ تباہ کیا۔

مذہبی جنون نے یہودیوں، عیسائیوں اور ہندوؤں کو بھی گھیر لیا ہے مگر مسلمان جب اس جنون کی زد میں آگئے تو اپنا نام رسوا کر گئے اور اسلام کی نہایت ہی تعمیری، تخلیقی اور انسان پرور صلاحیتوں پر کاری ضرب لگا بیٹھے۔ گجرات کا بھونا ہوا انسانی گوشت ہندوستان کی بڑھتی ہوئی جہوریت اور اس کی قدیم وجدید قدروں کی پامالی ہے، ننگا استحصال ہے، زنا بالجبر ہے۔ کتنے کم عرصے میں ہندوؤں کا ذہن کتنا آلودہ ہوگیا۔ اس کی پہلی نشانی رتھ یاترا تھی۔ (رتھ کشمیری زبان میں خون کو کہتے ہیں، یا یوں کہیے کہ رتھ لہو ہے)۔ یہ آلودگی ہندو

ذہن میں تب سے موجود تھی جب سے محمود غزنوی کا ہندوستان آنا دہرایا جاتا ہے۔ حالانکہ ہندوستان میں ہائی سکول کی درسی کتابوں میں کہیں بھی درج نہیں کہ مہاتما گاندھی کا خون ایک ہندو نے کیا۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے بارے میں جتنا کم لکھیں اتنا ہی بہتر ہے۔ صرف پچھلے چند سال میں انہوں نے مشرق وسطیٰ اور آس پاس میں خون آشامی اور اجتماعی قتل کے ایسے ریکارڈ قائم کئے کہ مذہب دار تو درکنار ناستک لوگ بھی شرم سے منہ جھکاتے ہیں اور توبہ توبہ پڑھتے ہیں۔ بہتان، دھوکہ، جعل سازی، رشوت، اخلاقی پستی کے منحوس ترین ہتھکنڈے انہوں نے روا رکھے اور اپنی چرب زبانی اور بے شرمی سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ اُن انسانی بستیوں کو قدیم زمانے کے کھنڈرات میں بموں سے تبدیل کر دیں گے جو ان کی استحصالی قوتوں کے سامنے سجدہ نہیں کرتے۔ مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ مسلمانوں کا مذہبی جنون اخلاقی اور روحانی زوال کا نتیجہ ہے۔ جو لوگ مذہبی جنون کو مذہب سمجھ کر اختیار کرتے ہیں اور اس لئے جان دیتے ہیں ان کی نفسیاتی کیفیت جاننے کیلئے معتبر تحقیق کی ضرورت ہے۔ یہ لوگ عشق کی دولت سے محروم ہیں، بھوکے ہیں، زندگی میں ایسے لوگوں کے ساتھ کسی نے نہ محبت کی ہوتی ہے اور نہ ہمدردی۔ آج کل تحلیل نفسی کے آئینے میں تاریخ لکھنے کا نیا رجحان پیدا ہو گیا ہے۔ میں بھی سوچتا ہوں کہ لوگوں کا سفاکانہ قتل، گھروں میں بند کر کے جان و مال کی آتش زنی، پھر بھنے ہوئے انسانی گوشت کی بُو سے لطف اندوزی تحلیل نفسی سے واضح کی جانی چاہیے۔

یہ جو مذہب کو جنوں کے طور پر استعمال کرنے کی رَو چلی ہے، بنیادی طور پر معاشی مسئلہ ہے۔ ہمارے خطّے کو مثال کے طور پر لیجئے، یہاں لوگ بھوکے ہیں، پیاسے ہیں، پیٹ کی آگ میں جل رہے ہیں، آگ جس کے مناظر صرف روٹی کے ٹکڑے اور پانی کے گلاس سے بجھ نہیں سکتے۔ پھر یہ کہ گلوبلیزیشن کا خون خوار دیو نہ جانے کس کس روپ میں کس کس قسم کی تیاری میں مصروف ہے موت کی قیامت برپا کرنے کیلئے۔ عراق کی مثال

لیجئے۔ فی کس آمدنی نو سے دو ہزار ڈالر تھی۔ اسے دس سال میں باپ بیٹے نے (Bush, the elder, the younger) چالیس ڈالر پر پہنچادیا۔ ایک ہارورڈ اکنامسٹ (Harvard Economist) نے اسے بیسوی صدی کے آخری ایام کی سب سے بڑی ٹریجڈی قرار دیا۔ مگر عراق کے اندر رشوت کا بازار گرم تھا، امیر لوگ حرص کے پاگل پن میں لوگوں کو روندتے تھے، تعلیم اور ادب کا معیار پست اور ناقابل بیان تھا، گراوٹ بے حد بھیانک روپ اختیار کرگئی تھی اور آگے پیچھے، دائیں بائیں تہذیب وتمدن کے گھاؤ ہنستے تھے۔ عام لوگوں نے بہتر زندگی دیکھی ہی نہیں تھی۔ بس نفرت، حسد، بغض اور تناؤ کا رُخ امیروں کی طرف تھا (جو اس بدحالی اور پستی کے ذمہ دار تھے)۔ صدام نے ایران پر حملہ کیا تو عراقی بھیڑیئے بنے اور اپنے ہی ایرانی بھائیوں پر ٹوٹ پڑے۔ وہاں ان کے کیا کیا مذموم اور ذلت آمیز اعمال سامنے آئے کہ ان کے اپنے ہی چہرے غلاظت سے بھر گئے اور داغدار ہوئے۔ اس تمدن کی سیہ روئی امریکہ میں بھی دیکھی جاتی ہے جہاں کوئی پاگل آتا ہے تو اسقاط حمل کا کلینک چلانے والے کسی ڈاکٹر کا قتل کرتا ہے۔ کوئی محض شک کی بنیاد پر کسی سیاہ فام کے جسم میں گولی داغتا ہے، اس طرح انسانی حقوق پامال کرتا ہے۔ اب وہاں پریذیڈنٹ اور اس کی خونخوار جماعت بھی بنیاد پرستی میں ملوث ہے۔ وہاں بھی مذہبی جنون کو سیاسی اور خاص کر معاشی غرض کیلئے استعمال کیا جاتا ہے تاکہ تیل کی چوری کی جائے اور نوآبادیات میں سستے داموں صنعت کو بڑھاوا دیا جائے۔

میں نے اس وقت تک ایک بات کہی نہیں مگر وہ تو سب سے ضروری اور بنیادی بات ہے میری زندگی اور میرے ایمان کی! یعنی محمد مصطفےٰ کی والہانہ محبت جس کیلئے نہ کوئی منطقی تعبیر چاہیے نہ عقلی، صلی اللہ علیہ وسلم! امریکہ میں جب میں نے اقبال احمد سے اس کا تذکرہ کیا تو اس نے کہا کہ وہ خود بھی اس سے فیضیاب ہیں۔ تاہم اُس نے ایک وزنی بات کہی کہ اگر دنیائے اسلام کو کوئی چیز متحد کرتی ہے تو یہی کملی والے صلعم کی والہانہ محبت ہے۔ اُس نے

کہا کہ سینکڑوں فرقوں کے باوجود اسلام کی ملی وحدت اسی ایک معجزے کی مرہون منّت ہے۔ میں بھی اس بات کو دل کی گہرائیوں سے مانتا ہوں کہ عقلی اور فکری کربتوں کے باوجود اور ادھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر جاتے جاتے، روایتی مذہب سے دور رہتے رہتے بھی محمد عربی صلعم کی محبت اور ان کا عشق میری رگوں میں گرم خون کی طرح دوڑ رہا ہے۔ یہ بھی میں مانتا ہوں کہ مسلمان پیدائشی اعتبار سے بھی اس عشق میں مست ہیں اور اس کے نور سے منوّر! پس عشق رسول صلعم اسلام کا بنیادی سحر ہے۔ میں نے مسلمانوں کی کئی مجلسوں میں لوگوں کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ "مجھے خدا پر بھروسہ نہیں، یقین نہیں"، مگر یہ کبھی نہیں سنا کہ کوئی مسلمان کوئی ایسا کلمہ کہے جو محمد صلعم کی شان کے لائق نہ ہو۔ پچھلے چالیس سال سے میں، میری گھر والی اور میرے بچے رسول اللہ صلعم کے الوداعی خطاب[1] کی گہرائی اور گیرائی سے متاثر ہی نہیں مسحور بھی ہیں۔

> اپنے غلاموں کو اس طرح کھلاؤ جس طرح خود کھاتے ہو اور ان کی ستر پوشی کرو جس طرح اپنی ستر پوشی کرتے ہو۔ اگر وہ کوئی خطا کریں یا اُن سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے، تو اُنہیں معاف کرو۔ تاہم اگر تم معاف نہیں کر سکتے یہ جانتے ہوئے کہ شاید وہ اصلاح کے قابل نہیں اس لئے سیکھ نہیں سکتے، تب بھی اُنہیں رہا کرو کیونکہ وہ بھی اللہ کی پیدا کی ہوئی مخلوق ہیں۔

میں نے کوئی مسلمان گھر نہیں دیکھا جہاں اس پر عمل کیا جا رہا ہو یا جہاں اس مسئلے کو سمجھا جا رہا ہو۔ میری نظر میں اکیسویں صدی کی نقلی اور احمقانہ زندگی ہے۔ کسی حد تک آج

---

1. Feed your slaves as you feed yourself, and clothe them as you clothe yourself, and should they do anything wrong or commit any mistake, forgive them but if you cant, meaning most probably that if they are incorrigible they can't learn, then free them for they are also creatures of God."

کل کے حالات میں اس مایہ ناز اصولِ زندگی پر عمل کرنا ناممکن دکھائی دیتا ہے۔ تاہم اگر نیّت صاف ہو، اگر گھر کے غلاموں کو بھی انسان تصور کیا جائے، تو بات بن سکتی ہے۔ میری گھر والی جب سے میرے گھر آئی اور ایک روحانی خصلت سی لئے ہوئے، تب سے وہ گھر کے خادموں کے ساتھ رحم دلانہ سلوک کیلئے بے تاب رہتی ہے۔ جب کبھی مسلمانوں کے بڑے دن آتے، وہ کہتی کہ وہ گھر جائیں اور اپنے والدین اور بیوی بچوں کے ساتھ بڑا دن منائیں۔ حد یہ ہے کہ گھر میں کسی فرد کے ذہن میں یہ خیال نہیں آتا تھا مگر وہ کہتی کہ ہم کھانا پکانے کا، یا کسی اور کام کا کوئی نہ کوئی انتظام کریں گے اور خادموں کو گھر جانے دیں گے۔ اس طرح ہم رسول اللہ صلعم کے فرمائے ہوئے اصول زندگی پر بقدر توفیق عمل کرتے رہے۔ جب عمل شروع ہوا تو پہلی ہی عید پر مشکلات پیدا ہو گئے۔ ہمارے پاس عید کے دن کشمیری پنڈت عید مبارک کہنے آتے تھے۔ کئی ایک میری آنکھ کا اشارہ پا کر کھانے پر بیٹھتے تھے۔ مگر اُس دن چاول پکا نہیں۔ ایک کشمیری پنڈت شاگرد سکھانے پر بیٹھا کہ پانی اتنا ہونا چاہیے اور چاول اتنا، پھر بھی چاول پکے نہیں۔ نتیجہ یہ کہ تین بجے کے قریب ہم نے وہی کھانا کھایا جو خدمت گاروں نے پکا کے چھوڑا تھا۔ ہمارے گھرانے کا معمول رہا ہے کہ خدمت گاروں کے ساتھ نہایت ہی اچھا سلوک کریں۔ اگر میں کسی خدمت گار کے ساتھ اونچے لہجے میں بات کرتا تھا تو میرے بچے بڑے ہو کر اپنی خفگی کا مدبّرانہ اظہار کرتے تھے۔ مثلاً میرا شاعر فرزند شاہد اُسی وقت مکان سے باہر چلا جاتا اور مجھے مہذّب طریقے سے عندیہ دیتا کہ میرا سلوک اچھا نہیں۔ میں اس کے چہرے سے بھی خفگی کے آثار دیکھ سکتا تھا۔ کتابوں کی دنیا خلقِ خدا کے ساتھ اچھا خاصا برتاؤ کرنے کیلئے بھی گھڑی گھڑی ہمیں تیار کرتی تھی۔ پھر مارشل حاجسن کو لائیں گے اس نقطے کی وضاحت کرنے کیلئے۔ کہتا ہے کہ بغداد کے بازاروں سے ایک بزرگ آدمی جا رہا تھا۔ اس نے ایک بچے کو روتے دیکھا۔ وجہ جو پوچھی تو بچے نے کہا کہ اس کے ہاتھ میں مالک کا ایک چھوٹا فانوس تھا جو گر کر ٹوٹ گیا۔ اب مالک

مارے پیٹے گا۔ بزرگ نے کہا پروا مت کرو، ساتھ چلو۔ یہاں ایک مالدار شخص ہے جس نے ایک وقف کھڑا کیا ہے، محض نوکروں اور غلاموں کیلئے۔ اگر وہ خطا کریں تو وقف اس خطا یا غلطی کا معاوضہ دیتا ہے۔ وہ وقف پر چلے گئے اور وقف نے فانوس کا نقصان پورا کیا۔ یہ تھا رسول اللہ صلعم کے آخری خطبے کا اثر۔

میں بورڈ آف سکول ایجوکیشن کا چیرمین تھا۔ ۱۹۷۵ء کا زمانہ تھا۔ میں جہاں دیدہ تھا۔ ہمارا ایک چپراسی ایک چھوٹے مکان میں رہتا تھا، وہاں ہی قریب باہر۔ میں نے ایک دن اس سے دریافت کیا کہ وہ کیا کھاتا ہے اور کیسے رہتا ہے۔ وہ صبح شام چائے پیتا تھا اور دو دفعہ چاول کے ساتھ تھوڑی سبزی پکا کے کھاتا تھا مثلاً کچے پیاز جن کو وہ ہلدی اور مرچ کے ساتھ پکا کے کھاتا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں کم سے کم ایک مہینہ اُسی کی طرح کھاؤں پیؤں گا اور دیکھوں گا کہ اس طرح کی زندگی کیسے ممکن ہے۔ میرا چچا ایسے وتیرے پر مجھے چارلس ڈکنز کا کردار پک وک (Pick Wick) کہتا تھا۔ مگر میں یقیناً اسی طرح کھانے لگا۔ ابھی آٹھ ہی دن ہوگئے تھے کہ شیر کشمیر نے ایک شاندار عشائیے پر مجھے بھی بلایا۔ وہی وازوان اور وہی ایک کے بعد ایک پکائے ہوئے گوشت کے نخرے، رنگ اور ذائقے۔ عشائیہ کے بعد میں پھر چپراسی کی طرح کھانے لگا۔ میں نے کوشش کی کہ تاجدار عالم صلعم کی راہ پر چلوں جو انہوں نے آخری خطبے میں وضع کی تھی۔ مگر ایسا لگا کہ اس راہ پر چلنا مشکل ہے۔

میرے چھوٹے گھرانے میں خدمت گار پچھلے پچاس سال سے ہمارے ساتھ رہتے آئے ہیں۔ انہیں نوکری ملی، انہوں نے بچوں کو پڑھایا، وہ سرکاری ملازمت میں اوپر چڑھ رہے ہیں جتنا ایسے لوگوں کیلئے چڑھنا ممکن ہوتا ہے۔ ان کے گھرانے ممکنہ حد تک آباد ہو رہے ہیں۔ وہ آتے ہیں، جب ہمیں ضرورت ہوتی ہے اور ان کو فرصت، تو ہمارا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ میں خوش ہوتا ہوں ان کے بچوں کو اچھا کام کرتے ہوئے دیکھ کر۔ ان کے کچھ بچے غزالیؒ، ذاکر صاحب، مجیب صاحب، علامہ اقبال اور سیدین کے مضامین حتی الوسع

پڑھتے ہیں اور اسی طرح میری روح کی شگفتگی کا سامان بہم کرتے ہیں۔ وہ محمد صلعم کا گیت بھی پڑھتے ہیں جو اصلاً گائٹے نے لکھا ہے مگر مجیب صاحب نے اس کا ترجمہ کر کے اردو زبان کو زینت بخشی ہے۔ غلام محمد کی دو بیٹیاں تاہم ناخواندہ ہیں۔ میں نے ان کے بھائیوں کو کہا کہ وہ انہیں خواندہ بنائیں تا کہ وہ کچھ لکھ سکیں، پڑھ سکیں۔ انہوں نے تسلیم کیا۔ خدمت گاروں کے کچھ بچے استاد ہیں اور کچھ کلرک۔ ایک لڑکے نے کمپوٹر میں مہارت حاصل کی ہے اور وہ کیسٹ کالج میں کام کرتا تھا مگر اب ترال میں اپنا کمپیوٹر سکول چلا رہا ہے۔[1] اس کی بہن بی ایس سی ہے۔ اس تفصیل سے مراد یہ ہے کہ خدمتگاروں کی زندگی پھلے پھولے تو ہماری زندگی بھی فرحت و شادمانی محسوس کریگی۔ ہم ان خدمت گاروں کی بقدر توفیق عزت کرتے ہیں اور ان کے مسائل اچھی طرح سمجھ لیتے ہیں۔

مجھے سمجھ میں آتا ہے کہ مجھے رسول اللہ صلعم کے حکم پر سو فیصدی تعمیل کرنے کا موقعہ ملا جب میرا خدمت گار محمد و بیمار ہوا۔ محمدُو وہ شخص ہے جس نے میرے تین بچوں کو بہت لاڈ پیار سے پالا ہے۔ میرے بچے اس سے اتنی ہی محبت کرتے ہیں جتنی مجھ سے۔ وہ امریکہ سے آتے ہیں تو اس کیلئے تحفے تحائف لاتے ہیں۔ محمد و بڑا ہی اچھا آدمی ہے۔ اس نے میری پوتی کی شادی پر دلّی میں حصہ لیا۔ وہ دمّے کا مریض تھا۔ ڈاکٹر کے کہنے پر اس نے تھوڑی سی برانڈی پی اس لئے سانس پھولنے کی بیماری سے تھوڑا آرام پالیا۔ جب براتی آئے اور انہوں نے محمد و کو دیکھا تو وہاں دلّی میں ایک عجیب سا ماحول پیدا ہو گیا۔ یہی محمد و ایک دن مہینے بھر کیلئے غائب ہو گیا۔ محمد و بیمار ہو گیا تھا اور گاؤں میں نہ جانے کن کن لوگوں سے کیا کیا دوائیاں لیکے کھائی تھیں۔ نتیجہ یہ کہ اس کا معدہ زخمی ہو گیا اور تقریباً تقریباً اس کا سارا خون نکل گیا۔ میں نے اسے ڈاکٹر ایس ایل در کے پاس لے لیا۔ اُس نے فوراً ہسپتال میں بھرتی کا مشورہ دیا۔ محمد و بھرتی ہو گیا اور وہاں ڈاکٹر ملک جیسے نیک دل ڈاکٹر نے اسے خون دلوایا، آکسی جن دلوایا اور اچھا خاصا علاج کیا یہاں تک کہ اس کا ہیموگلوبن ذرا اوپر

۱۔ اب سنٹرل یونیورسٹی اونتی پورہ میں کمپیوٹر اوپریٹر کی حیثیت سے کام کر رہا ہے۔ خدا کا شکر!

آ گیا۔ میں نے اسے گھر لایا اور ذاتی طور پر اس کی دیکھ بال شروع کی۔ چار پانچ ہفتے مجھے موقع ملا کہ محمدو کی خدمت کروں۔ میں سمجھتا تھا کہ امریکہ اور یہاں کشمیر میں خوش حال گھرانوں میں بھی اسی طرح کسی کو کھانا نہ ملتا ہوگا جس طرح محمدو کو ملا۔ شہد اور پھلوں کا رس، مرغے کا سوپ، کلیجی اور بادام اور ترکی کی خوبانیاں اور عربی کھجور اور کیا نہیں۔ پندرہ دن کے بعد محمدو کا ہیوموگلوبن سات پر پہنچا۔ پھر ڈاکٹر نے کچھ خاص انجکشن دینے کی تجویز کی اور میں نے انتظام کیا۔ محمدو یکدم کھڑا ہو گیا اور پھر کام کرنے لگا۔ مجھے محمد صلعم کے دُربار میں گھسنے کا شرف حاصل ہوا! ان کے میٹھے میٹھے بول جو شہد کی طرح ان کے آخری خطبے میں ٹپکے، میری ہدایت کا باعث بنے۔ مجھے یاد آیا کہ شاید حضرت بایزید بسطامیؒ نے کہا کہ وہ خربوزہ نہیں کھائیں گے اس لئے کہ انہیں معلوم نہیں کہ نبی برحق صلعم نے خربوزہ کھایا ہے کہ نہیں!

یہ واردات قلبی مجھے بڑھاپے کی اس سطح پر نرادسی چودھری کی یاد دلاتے ہیں جس نے Continent of Circie میں ہندوستانیوں کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ مارکس، فرائڈ اور ڈارون سے گزرتے ہوئے جدید سامان سے لیس، دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم نے عہد حاضر کو، اس کی تبدیلیوں کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے مگر آخر پر سادھو سنت لوگوں کو گود میں بیٹھ کر سہارا لیتے ہیں اور اپنے قلبی واردات کا علاج کراتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ آغا اشرف علی بھی جدید علوم وفنون کے مراحل سے گزرتا ہوا ایسا ہی کچھ کرتا ہوگا۔ مگر یہ بات صحیح ہے کہ انسان جب مولانا آزاد اور غزالیؒ کی طرح انکار کے مراحل اور شک کے خاردار راستوں سے گزر جائے تو لازماً پھر کیوں وہی مذہب اختیار کرے جو پہلے اختیار کئے ہوئے تھا۔ ذاکر صاحب نے بھی کہا ہے کہ شک کے بعد ایمان کا قرار مل جاتا ہے۔ مگر یہ قرار اسلام میں ہی کیوں ملتا ہے۔ صرف کچھ لوگوں میں ہی جرأت ہوتی ہے جو امبیدکر کی طرح ہندوازم چھوڑ کر بدھ ازم اختیار کرتے ہیں یا مولانا جلال الدین رومیؒ کی طرح اسلام، عیسائیت، یہودیت، آتش پرستی سے گزرتے ہوئے نہ انسان رہتے ہیں اور نہ ملائک اور نہ جن، نہ ایرانی رنگ اختیار کرتے ہیں نہ تورانی، بس عشق کا جام پیتے ہیں اور مدہوش رہتے ہیں۔ اِس مستی و مدہوشی میں ہر چیز

مست رہتی ہے اور ہر جاندار مخلوق۔ محمد لاہجی نے خوب کہا ہے کہ اس مستی میں یار اور اغیار، جام، بادہ اور میخانہ مست ہوتے ہیں۔ جان، حریف، ساقی، بزم، شاہد، مطرب اکٹھے مست ہوتے ہیں۔ عقل، عشق، عاشق، معشوق، زہد، توبہ، زاہد، کعبہ، بت خانہ، مسجد، محراب، سنگ، چوب، گل، در و دیوار، گبر، ترسا، کلیسا، عیسیٰ، دیر، ناقوش، صلیب، راہب، زنار، بت پرست، بت، بت خانہ، کافر، انکار، مومن، خاک و باد، آب و آتش، انجم و افلاک، کوکب سیّار، عقلِ کل، ملائک، روح، جسم، جبرئیل، وحی، احمد مختارؐ سب مست ہوتے ہیں[1]۔ بقول فرجاف شئوان اگر ہم تقابلی مذہب کا مطالعہ کریں گے اور مذہب کو مختلف سماجی اور مجلسی مسائل کے ساتھ جوڑ دیں گے تو ہمارے من میں مذہب کی کوئی واضح شکل اُبھر آئیگی اور ہم اس پر عمل پیرا ہوں گے۔ کینتھ کریگ نے اپنی کتاب ''محمدؐ اور عیسائیت'' (Mohammad and the Christians) میں داؤد رہبر کا قول دہرایا ہے کہ حضرت عیسیٰ روح اللہ اور حضرت محمد مصطفےٰ صلعم جنت میں دوست ہیں۔ ہمیں زمیں پر دوست بن کے رہنا چاہیے۔ میں مذاہب کے درمیان دیوار کھڑا کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ میرا ایمان ہے کہ پیغمبر وقتاً فوقتاً انسان کی نجات اور اس کی راہنمائی کیلئے آئے اور یہ ایمان قرآن پاک کے فرمودات کے عین مطابق ہے۔

۱۔

دوش دیدم یار مست و جملۂ اغیار مست
جام مست و بادہ مست و خانہ خمار مست

جان ما مست حریفان مست و ساقی مست مست
بزم مست و شاہد و مطرب ہمہ یکبار مست

عقل مست و عشق مست و عاشق و معشوق مست
زہد مست و توبہ مست و زاہد و ہشیار مست

کعبہ و بتخانہ مست و مسجد و محراب مست
سنگ و چوب و گل ہمہ مست و درو دیوار مست

گبر و ترسا و کلیسا مست و عیسیٰ نیز مست
دیر و ناقوس و صلیب و راہب و زنار مست

خاک بادو آب و آتش جملگی بودند مست
انجم و افلاک مست و کوکب سیار مست

عقل کل مست و ملائک مست و روح و جسم مست
جبرئیل و وحی مست و احمد مختار مست

ہم ''اسیری'' مست بود و جملۂ ذرات مست
کفر و ایمان مست و دین و مذہب و دین دار مست

(شرح گلشن راز، محمد لاہجی گیلانی)

پروفیسر حبیب کا ممنوں ہوں جنہوں نے لاہجی کا اقتباس مجھ تک پہنچایا۔

نساء

میں بار بار سوچتا ہوں کہ اگر مرد اور عورت کے درمیان صحت مند رشتہ قائم نہ ہو تو کردار اور تمدن کے بہت سارے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اگر عورت کو اچھی طرح سے اُبھرنے کا موقعہ دیا نہ جائے تو وہ اپنے اندرون کو ظاہر نہیں کر پاتی اور اس کے ذہنی، نفسیاتی اور روحانی قواء دب کے رہ جاتے ہیں اور وہ جزوی طور پر انسان بن جاتی ہے۔ بہت سی عورتیں پانی کے بلبلوں کی طرح صفحۂ ہستی پر اُبھرتی ہیں، بیاہی ہو جاتی ہیں، بچوں کو جنم دیتی ہیں اور گذر جاتی ہیں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے۔ میں یہ بات جدید دور کے سماج خاص کر مسلمانوں کے حوالے سے کہہ رہا ہوں۔ میں اُستاد ہوں اور دنیا کے اطراف واکناف سے گھوم گام کر آیا ہوں۔ میں شدت سے محسوس کرتا ہوں کہ کوئی بھی شے موزون اور متوازن کردار بنانے میں کام نہیں آتی جتنا کہ عورتوں اور مردوں کا ملنا اور اکٹھے رہنا۔ عورت ماں ہے، بہن ہے، بیٹی ہے اور بیوی بھی، مگر عورت عورت ہے۔ ملنے کی جگہوں میں گھر ہے، مدرسہ ہے، بازار ہے، تہوار منانے کے مقامات ہیں اور سماجی و دیگر ادارے۔ ناظم کی حیثیت سے میرا تجربہ ہے کہ جہاں جہاں ہائی اسکول علیحدہ نہیں تھے، وہاں تعلیم حاصل کرنے کا قدرتی نظام ہوتا تھا۔ لڑکے لڑکیاں اکٹھے پڑھتی تھیں مگر کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس سے دوسری بات بھی اُبھرتی ہے۔ اگر مردوں اور عورتوں کے درمیان صحت مند تعلقات نہیں اور مساوی، ان کی شخصیت میں توازن بھی نہیں۔ تعلقات میں کھل

کر باتیں کرنا، خیالات کا آزادانہ اظہار کرنا، ایک دوسرے کے اندرون کو سمجھنے کی کوشش کرنا اور جذبات وغیرہ کی ہم آہنگی اور فرق کو محسوس کرنا شامل ہے۔ ذہنی قرار کے لمحات میں اور اس لئے طرب ونشاط کے موقعوں پر میں نے جس طرح اچھے مردوں کے ساتھ اچھے لمحات گزارے ہیں، اسی طرح اچھی عورتوں کے ساتھ بھی اچھے اوقات بسر کئے ہیں۔ ان کے ساتھ بیٹھنا، باتیں کرنا اور زندگی کی گتھیاں سلجھانے کی کوشش کرنا کتنا فرحت افزا ہے اور نشاط انگیز! آندرے موروا (Andre Maurois) نے اپنی کتاب ''کسی آدمی کو خوش مت کہو'' (Call No Man Happy) میں ایک اچھی بات کہی ہے۔ بہترین ساتھی وہ عورت جس میں نسوانی جمال کے ساتھ ساتھ مردانہ دیانت کا وصف موجود ہو[1]۔ موروا کی کتاب ''زندگی گزارنے کا صحیح ڈھنگ'' (The Art of Living) میں اس سے بھی زیادہ پتے کی بات ہے۔ انسانی تمدن کی بہترین دین وہ خوبصورت عورت ہے جو ذہنی اعتبار سے بھی پرکشش ہو[2]۔

امریکہ، انگلستان، ہندوستان کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے سب سے زیادہ نفیس خاتون جو میرے ذہن میں آتی ہے اور جس کے ساتھ میں نے قریباً پچاس سال گزارے ہیں، پی این دھر کی سرگباش بیٹی شیلا در ہے۔ بہت ہی قابل اور ضوفشاں اندازِ بیان سے متصف یہ خاتون عقل مند مگر ظریفانہ کلام سے محظوظ کرتی تھیں، ہنستی تھیں اور ہنساتی تھیں۔ شیلا جی مہذب تھیں مگر ہندوستانی موسیقی میں اس کا فنی اعتبار کس کے نکلا تھا، دلّی میں ایک گھرانہ تھا، تہذیب کے دھلے منجھے ماحول کی مثال۔ سلجھے ہوئے دماغ اور موسیقی کے دل دادہ وہاں رہتے تھے۔ اس گھرانے کا نام بہادر تھا اور شیلا جی کی ماں وہاں ہی رہتی تھیں۔ شیوراج بہادر ان کے پتا جی کا نام تھا۔ شیلا جی نے اپنی سوانح عمری میں اس گھرانے کا تذکرہ تحسینی الفاظ میں کیا ہے۔ ان کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تمدّن اور موسیقی کی لطافتوں کو جانتی تھیں،

1. A beautiful woman who has the quality of an honest man affords the most beautiful companionship.
2. When you see intellectual charm combined with beauty in a woman, it is the most exquisite product of civilization.

سمجھتی تھیں اور دہراتی تھیں اس طرح کہ پڑھنے والا قطعی محظوظ ہو جاتا۔ ضمناً یہ کہیں کہ مجیب صاحب نے شیوراج بہادر کے سرگباش ہونے پر ان الفاظ میں ان کو خراجِ عقیدت پیش کیا تھا۔

"یہ دنیا ایک مسافر خانہ ہے جس میں کبھی کبھی ایسا آدمی پیدا ہوتا ہے
کہ جس کی وجہ سے یہ تھوڑی دیر کیلئے گھر معلوم ہونے لگتا ہے۔

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اسی مجیب صاحب نے ایک دن شیلا جی کے گلے سے گل ہائے رنگا رنگ کی بو باس نکلتی دیکھی۔ اس نے مانسبل میں گت چھیڑی اور ہم دونوں نے اس کے فنِ موسیقی کے جوہر دیکھے۔ مجیب صاحب کو میں نے ہی مانسبل تشریف لانے کی درخواست کی تھی۔ شیلا جی کی فن پرستی نے ہمارا شوق اپنی تشریف آوری سے پورا کیا تھا۔

شیلا جی کو ہمارے گھرانے سے کافی اُنس تھا۔ وہ میرے بیٹھے آغا شاہد مرحوم کو بیٹے کی نظروں سے دیکھتی تھیں۔ اُنہیں بھیّا کی طبع آزمائی بہت پسند تھی اور ان کا ادبی ذوق۔ بھیّا کی موسیقی کے ساتھ دل چسپی دیکھ کر شیلا جی اور بھی خوش ہو جاتی تھیں۔ پچھلے پندرہ سال سے وہ اسے بہت چاہتی تھیں۔ آخر بار جب ہم شیلا جی کے گھر گئے تو اُنہوں نے ہمیں پسندہ کھلایا جو انہوں نے ہم دونوں باپ بیٹے کیلئے بنایا تھا۔

وسطی بیسویں صدی کی ایک اور خاتون کا نام لیا جا سکتا ہے جو حسن طبع کی مثال تھی۔ یہ مسٹر پی سی، چٹر جی، جسے ہم ٹائی چٹر جی بھی کہتے ہیں، کی پتنی تھی، لولا چٹر جی۔ مادام چٹر جی کہیں تو زیادہ مناسب ہوگا اور حسب حال! لولا جی انگریزی جانتی تھی اور اس کے بول دُھلے منجھے ہوا کرتے تھے۔ شیلا جی بھی انگریزی جانتی تھی مگر اس کے علاوہ موسیقی ان کا ہیرا تھی۔

مغرب میں عورتوں کے ساتھ مردوں کا اختلاط بہت عام ہے۔ وہاں نہ رسموں کی پابندی ہے اور نہ بندش۔ وہاں جنسی قربت زندگی کا واحد مقصد نہیں۔ ہمارے یہاں اگر مرد اور عورت ملتے ہیں تو لوگ یکدم اس ملاقات کا ایک ہی مقصد اور مطلب لیتے ہیں، جنسی غرض۔ کسی وقت بھائی بہن یا نسبتی بھائی بہن کا اکٹھے چلنا یا اکٹھے بیٹھ کر باتیں کرنا بھی شک

آور نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ مرد جس طرح عورتوں کی طرف دیکھتے ہیں، وہ بھی کردار کا کھوکھلا پن ظاہر کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بچپن سے ہی ہم مرد اور عورت کے رشتوں کو غلط انداز سے سمجھنے کے عادی بن جاتے ہیں۔ اس سے ہمارا احساس کمتری جھلکتا ہے۔ اس سے ایک اور چیز مترشح ہوتی ہے کہ ہم عورتوں پر حکومت کرنا چاہتے ہیں۔ ذات پات کا معاملہ بھی عورتوں کی آزادی میں مخل ہے اور یہ مسلمانوں میں بھی پھیل گیا ہے۔

میرا خیال ہے کہ لوگ زیادہ خوش ہوتے اگر مرد اور عورتیں آپس میں آزادی سے ملتے، باتیں کرتے اور زندگی گزارنے کے رنگ ڈھنگ اکٹھے سیکھتے۔ میرے کالج کے ایّام میں مرد اور عورت کا ملنا محال تھا۔ کالج کے طالب علم عورتوں سے ملنے کے بڑے شوقین ہوتے تھے مگر عورتیں باہر تھی ہی نہیں۔ کالج چند ایک لڑکیاں آتی تھیں جن کے اردگرد کالج کے چپراسیوں، استادوں اور لوگوں کا پہرہ رہتا تھا۔ یہ پہرہ دراصل لوگوں کے خوف و ہراس نے پیدا کیا تھا اور ان کے احساسِ بے خودی نے۔ اس میں اُن کا جہل بھی کارفرما تھا اور ان کی تہذیبی خامی۔ کلاس روم میں بھی ان کے لئے علیحدہ بنچ تھے جن پر وہ بیٹھتی تھیں۔ ایک دن مردوں کے لئے کوئی جگہ باقی نہیں تھی۔ عورتوں کے بنچ پر کافی جگہ تھی۔ ایک لڑکا آیا اور اس نے بنچ پر بیٹھنے کی اجازت مانگی۔ پروفیسر برج کشن مدن نے کہا کہ اپنے اوپر اگر بھروسہ ہے تو بیٹھو۔ بہت معنی خیز جملہ تھا۔ عورتوں کی حالت زار دراصل مردوں کے اپنے اوپر بھروسے کا فقدان تھا۔ برج کشن مدن نے سوچا ہوگا شاید یہ لڑکا کلاس میں کوئی بدتمیزی کر بیٹھے گا۔ ہوسکتا ہے کہ شباب میں انسان کا دھیان دونوں طرف سے اِدھر اُدھر جائے مگر ہوا کی مست خرامی تہ کمند تو نہیں ہوتی۔ ہمارے کالج اور یونیورسٹی کے ایام اچھی طرح نہ گزرے کیونکہ عورتیں غائب تھیں۔ اگر نہ ہوتیں تو ان کے ساتھ گفتگو کرنے سے، مافی الضمیر بانٹنے سے یا اُن کے ساتھ اکٹھے رہنے سے زندگی بہتر طریقے سے گزر سکتی۔ اب بڑے بڑے شہروں میں یا یہاں کشمیر میں بھی ایسا ہوتا ہے اور بلا عذر یا نقصان کے۔ جب

ہم علی گڑھ میں تھے تو ہمارے ساتھ ایک لڑکا رہتا تھا جو فٹ بال کھیلتا تھا۔ جب کبھی باہر سے کوئی یکہ چلتا، کسی کالے چادر میں لپٹی ہوئی کسی خاتون کو لئے ہوئے، تو نظام کا سر کھڑکی کے پاس لوہے کی سلاخوں سے ٹکراتا مگر وہ دیکھنے لگتا۔ انسان سمجھ سکتا ہے کہ اس پر عورتوں کا بھوت کتنا سوار ہوا تھا اور وہ کتنا پریشاں خاطر تھا۔ اس کی عمر بیس کے قریب ہوتی اور وہ لوہے کے ساتھ سر ٹکراتا۔ رالف رسل نے خوب تجزیہ کیا ہے اس حالت کا۔ کہا ہے کہ ہندوستان میں مردوں اور عورتوں کا اختلاط چونکہ اٹھارہویں صدی میں ناممکن تھا اس لئے غزل اس ناممکنہ حالت کا اظہاری ذریعہ بن گیا۔ نتیجہ یہ رہا کہ شاعر اپنی بیوی سے نہیں، دوسرے کی بیوی سے پیار کرنے لگا۔

اب ذرا مسلمانوں کی تاریخ کی طرف متوجہ ہو جائیں اور ان کے عروج کے زمانے پر نظر ڈالیں تو دیکھیں کہ عورتیں تین سو سال تعلیم کے زیور سے آراستہ تھیں اور وہ بھی اعلیٰ تعلیم کے۔ میں نے کیمبرج ہسٹری آف اسلام میں تیرہ سو اکیاسی (1381) خواتین کی سوانح عمریوں کے حوالے دیکھے ہیں۔ ان میں ایک ممتاز نام اُم ہانی کا ہے جو دینیات کی پروفیسر تھیں اور حاجیوں کو مکے میں پڑھاتی تھیں۔ ان میں غیر ملکی لوگ ہوتے تھے جو مکہ شریف حج کے دنوں میں آتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ جب کسی سماج میں زوال آنے لگتا ہے تو اس کے تمدن کا بھی زوال شروع ہوتا ہے اور عورت بیچاری شکار ہو جاتی ہے۔ سماج جتنا زیادہ بدحال ہوگا، اتنی ہی عورتوں کی حالت زیادہ خراب ہوگی۔ اکبر اعظم شہنشاہ ہندوستان کی طرف دیکھئے، اس کی ملکہ اپنی قابلیت اور صلاحیت کی بنیاد پر تاجر تھی۔ اب منصور حلاج کے عہد کا رُخ کریں۔ خلیفہ وقت کی ایک ملکہ یونانی تھی۔ اس نے بغداد میں پانچ ہسپتال قائم کئے تھے۔ یہ بات لوئی مسی ناں کی تحقیق کردہ حقیقت ہے۔ لوگ جو تاریخ پڑھتے ہیں، وہ اپنا زاویہ نگاہ وسیع کرتے ہیں اور ان کا فکر بلندیوں کو چھوتا ہے۔ اُنہیں مثلاً معلوم ہو جاتا ہے کہ مسلمان کس طرح تہذیب اور تمدن بنانے میں مشغول کار تھے۔ کس طرح انہوں نے

سپین سے لیکر چین تک نورانی پر پھیلائے تھے۔ ان کی دانش گاہیں بے مثال تھیں۔ وہ نہ صرف یونانی علم سے مزیّن تھے بلکہ سنسکرت کا علمی جام بھی پی چکے تھے۔ مصر نے بھی ان کی آنکھیں کھولی تھیں اور سمیریا نے بھی۔ اس طرح ان کی تہذیب عالمی تہذیب بن چکی تھی اور اس تہذیب میں عورتوں کا بھی عمل دخل تھا۔

گاندھی جی کی تحریک آزادی کی بات کریں۔ دکھائی دیتا تھا کہ باپو نے عورتوں کو چھوڑ دیا مگر سبھوں کی آنکھیں کھل گئیں جب اس کی تحریک میں عورتیں دھڑا دھڑ شامل ہوگئیں۔ سروجنی نائیڈو، رامیشوری نہرو، چٹوپادیہ، پنڈت وجے لکھشمی اور کتنی اور عورتیں۔

میں اُستاد کے منصب سے گر جاؤں گا اگر اعتراض نہ کروں گا مردوں کے اس روّیے پر جو میں نے بارہا مجلسوں میں دیکھا ہے۔ عورت کا نام کچھ مرد اس طرح لیتے ہیں کہ گویا وہ انسان نہیں۔ کچھ مرد ان کے بارے میں گھٹیا قسم کے الفاظ زبان پر لاتے ہیں یہاں تک کہ گالی گلوچ سے بھی کتراتے نہیں اور جو عورتیں ان کی غلاظت طبع کا شکار ہوتی ہیں، ان میں کچھ مدبّر اور قابل احترام شخصیتیں بھی ہوتی ہیں۔ یہ ٹھٹھے مخول اور یہ مذموم حرکتیں دل پر کتنا بوجھ ڈالتی ہیں۔ یہ ایسی مجلسوں میں ہوتا ہے جہاں ایک بھی خاتون موجود نہیں ہوتی۔ جن مجلسوں میں عورتیں موجود ہوتی ہیں، ان کی کیفیت ہی کچھ اور ہوتی ہے اور تمدّنی سطح! یہ کیفیت عرب میں بھی ہوتی تھی۔ میں اس سلسلے میں زیلڈن کی کتاب Intimate History of Humanity کا حوالہ دینا چاہوں گا۔ کہتے ہیں کہ عرب عاشق تھے اور اس باب میں یورپ کے سورماؤں (knights) سے آگے تھے۔ عاشقی اور مستی اُن کا خاصا تھا اور موسیقی ان کا چہیتا مشغلہ۔ دیوان خانوں میں مجلس آرائیاں ہوتی تھیں اور مشاعرے۔ زیلڈن کے ساتھ دوسرے مصنفیں بھی لکھتے ہیں کہ مولا حسین علیہ السلام کی دختر معصومہ جناب سکینہ علیہا السلام بھی علم میں، ادب میں، اُٹھنے میں بیٹھنے میں، رفتار گفتار میں، شعر و ادب کے افہام و تفہیم میں مشہور زمانہ تھیں۔ پھر دیکھئے جناب زینب کبریٰ علیہا

السلام یزید ملعون کے دربار میں نہ صرف فصاحت و بلاغت کا نمونہ پیش کرتی ہیں بلکہ علم و عرفان کا علم بلند کرتی ہیں۔ اُن کے لفظ لفظ سے اور الفاظ کے انتخاب سے ٹپکتا ہے کہ کربلا حسینیت زینبؑ کے دل و دماغ کے حوالے کر گیا۔ اس کا بڑا ثبوت یزید کے دربار میں جناب زینبؑ کی دلیری اور صاف گوئی ہے۔ زبان کی لطافتوں کے ماہر اور اس کی وسعتوں کے متوالے زینبؑ کے کلمات کا تجزیہ کریں تو نئی راہیں ادب فہمی اور عرفان سنجی کی نکل آئیں گی۔ مسلمان خواتین کی ادب نوازی اور علمی صلاحیتیں ابھی بھی کچھ لوگ اپنی نافہمی کی وجہ سے قبول نہیں کرتے۔ ایک دن میری ممانی مجھ پر برس پڑی جب اس نے سنا کہ میں جناب سکینہؑ کی ادب نوازی اور علمی صلاحیت کی بات کرتا ہوں، اس کا خیال تھا کہ جناب سکینہؑ کوئی برقعہ پوش معصومہ تھی جو گھر کی چار دیواری میں بند تھیں۔

میں اب ٹیچرس کالج واپس چلا جاؤں گا اور ان ساری کشمیری پنڈت اور مسلمان خواتین کو یاد کروں گا جو سکنڈری سکولوں میں پڑھانے کے لئے تربیت پانے آتی تھیں۔ ان کے ساتھ علمی، ادبی اور تمدنی بحثیں کرنے میں دل کو کتنی تسلی ملتی تھیں کہ کشمیر کی عورتوں کے بھی نصیب جاگے ہیں۔ کل ہی بھدرواہ کی میری ایک شاگردہ کی بیٹی جموں سے آئی تھی۔ اس کا نام صدف ہے اور شعر و ادب پر پی ایچ ڈی کر رہی ہے۔ اعلیٰ سطح پر پہنچی ہوئی اس خاتون کو دیکھ کر کتنی خوشی ہوتی ہے۔ سٹی فن ذوی (Stefan Zweig) نے اپنے ناول میں فسق اور دوہرے اخلاق کی وضاحت کی ہے۔ کہتا ہے کہ مردات کے وقت جہاں چاہے عیش کرنے کیلئے جا سکتا ہے مگر گھر واپس آ کر اپنی بیٹی کو سائیکل چلانے سے منع کرتا ہے۔ یہ تو پہلی جنگ عظیم سے پہلے کی بات ہے، مگر اس کے بعد تو سارے اخلاق بدل گئے۔ اخلاق کی ترقی یافتہ صورت ہی اس کی صحت مند صورت ہے۔ جو لوگ یونانیوں کی طرح عورت کو چیزے دگر سمجھتے ہیں، وہ تو اپنے سماج کی بگڑی ہوئی حالات کی دلالت کرتے ہیں۔ یونان میں جب ارسطو نے عورت کو رُک رُک کے بنی ہوئی زندگی (arrested growth) کا نام دیا

اور کہا کہ جب قدرت مرد کی تخلیق میں ناکام ہوتی ہے اور عورت پیدا ہوتی ہے تو انسان شرمندہ ہوتا ہے۔ ارسطو جیسا آفاقی ذہن جس نے سینکڑوں علوم وفنون کا تجزیہ کیا۔ ان کے اندر ربط اور باقاعدگی پیدا کی اور اس طرح عقل وفہم کو آسمان پر پہنچایا، عورت کو اپنی دنیا میں جگہ دے نہ سکا۔ دراصل غلاموں کی موجودگی کو فطری قانون جتلانے والے غلامانہ ذہنیت کا شکار ہو گئے۔ اس لئے عورت کو بھی پیچھے دھکیل کر رکھ دیا۔ نیٹشے بھی اسی طرح اپنی بڈ بولتا ہے۔ ''عورت ایک معمہ ہے جس کا حل بچہ ہے۔'' ''یا'' جب عورت کے قریب جاؤ تو قمچہ ساتھ اٹھا کے جاو۔'' مگر اس مجذوب نے آخر سچ بول ہی دیا کہ اگر عشق سچا ہو تو روح جسم کو گلے لگاتی ہے۔ میں نے وِل ڈیوراں کی کتاب The Pleasures of Philosophy کی سفارش ہمیشہ کی جب کبھی میرے شاگرد اچھی کتابوں کا نام پوچھنے آئے۔ اس کتاب میں میں مرد عورت کے رشتے بہت اچھی طرح واضح کئے گئے ہیں اور جدید زمانے میں عورتوں کی بڑھتی ہوئی زندگی سے بھی نقاب اٹھایا گیا ہے۔ ایک زمانے میں یہ کتاب بی ایڈ سطح پر پڑھی جاتی تھی۔ اس کی انگریزی بہت اچھی ہے مگر معیاری اور طرحدار۔ اب ایم ایڈ سطح کے استاد یا شاگرد ہی اس کتاب کو پڑھ سکتے ہیں۔ بدقسمتی سے میرے کچھ شاگرد مذہبی جنوں کے شکار ہوئے مگر میں سب شاگردوں سے یہی کہتا آیا ہوں کہ جب تک وہ اپنے زمانے کی نبض نہ پہچانیں اور اس کے ساتھ ساتھ سماج کی بدلتی ہوئی ہیئت کا جائزہ نہ لیں، تب تک وہ عورت کا مقام نہیں سمجھ سکتے اور نہ اس کی حوصلہ افزائی کر سکتے ہیں جو اس کا پیدائشی حق ہے۔ یہاں میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ والہ وسلم کا حوالہ دونگا جنہوں نے فرمایا کہ جنت ماں کے قدموں میں ہے اور یہ کہ عورت کو زور سے بھی چھیڑنا نہیں چاہیے۔ چھیڑنے کیلئے ریحاں کی شاخ ہی استعمال کیوں نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ میں ابتداء سے ہی اپنے شاگردوں کو ڈارون، فرائڈ اور مارکس سے روشناس کراتا تھا تاکہ وہ عہد جدید کی بدلی ہوئی ہیئت سمجھ کر سماج کو سمجھیں، بدلے ہوئے اور بدلتے ہوئے رشتوں کو سمجھیں اور ساتھ ساتھ یہ بھی جان لیں

کہ انسانی رشتوں میں کافی لچک تاریخی صفحات میں دیکھی گئی ہے اور آئندہ بھی دیکھی جائیگی۔ میں ضرور کہوں گا کہ موجودہ زمانے میں تحلیل نفسی نے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں اور عورت مرد کے پاکیزہ رشتے سمجھنے میں بھی خاص کر۔ میں بلاخوف تردید کہوں گا کہ ہمارا تعلیمی ڈھانچہ فرسودہ ہے جہاں مرد اور عورت الگ الگ مدرسوں میں پڑھا رہے ہیں۔ میں اس صورت حال سے ناخوش ہوں اگرچہ پچھلے کئی برسوں سے اب مرد عورت اِدھر سے اُدھر جاتے دیکھے جاسکتے ہیں۔

اپنے گھرانے کی مثال دیکر بھی مرد اور عورت کے پاکیزہ رشتے کی بات کھل سکتی ہے۔ میرے پردادا حکیم علی نقی مرحوم شاہی حکیم تھے مگر وہ اپنی گھر والی کو جموں نہیں لے جاتے تھے اس لئے بھی کہ راستے ناہموار تھے۔ جموں اور سرینگر کے درمیان سڑک کا انتظام ناقص تھا خاص کر خراب موسم میں جب بارشیں ہوتی ہیں یا برف گرتی ہے۔ ہماری عورتیں گھر پر ہی رہتی تھیں۔ مرد لوگ عارضی نکاح کر سکتے تھے۔ اس کی اجازت جعفری شریعت دیتی ہے۔ آغا محمد جان عارضی نکاح کا (مطاع) سے ہی پیدا ہوئے تھے۔ وہ اچھے آدمی تھے اور بچوں کا خیال رکھتے تھے۔ اس وجہ سے بھی ان کے بچوں نے اپنی زندگی بنائی تھی۔ آغا محمد جان نے مجھے بتایا تھا کہ ہم مغل ہیں۔ میں اور میرے بھائی بہن سے محروم رہے اس لئے ہمارے عادات واطوار اتنے شائستہ اور نفیس نہ بنے جتنے ہمارے ممیرے بھائیوں کے جن کی ایک بہن تھی۔ ہماری بول چال بھی اتنی نفیس اور شائستہ نہیں تھی جتنی ان کی۔ ہمارے آنے سے پہلے ہمارے بزرگوں کے زمانے میں حالات زیادہ خراب تھے۔ جاگیردارانہ نظام میں، جس میں ہمارا گھرانہ گھرا ہوا تھا، عورتیں زندگی میں شریک نہیں ہوتی تھیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہوتی تھی کہ عورتوں کو مردوں کی طرح تعلیم نہیں دی جاتی تھی۔ حد یہ کہ امریکہ میں بھی ایسا ہی ہوتا تھا۔ امریکہ میں میرے ایک دوست نے جو میرے ساتھ پی ایچ ڈی کر رہا تھا، اپنی بیوی کی کمائی پر پڑھا لکھا۔ جب یونیورسٹی پہنچا تو مرد عورت دونوں سے ملا

اوران کے ساتھ اُٹھا بیٹھا۔ پھر اپنی بیوی کو ہی چھوڑ دیا اور دوسری شادی کی۔ کشمیر کے کچھ لوگوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ وہ امریکہ چلے گئے۔ وہاں پڑھا لکھا اور بالیدہ ہو گئے۔ جب کشمیر واپس آئے تو اپنی بیوی کو ہی خیر باد کیا اور کہیں اور شادیاں رچائیں۔ اس طرح اپنے لئے جدید زندگی سے حظ اٹھانے کے انتظامات کئے۔ اب کشمیری لڑکیاں بھی سکول اور کالج سے ہوتے ہوئے یونیورسٹی تک پہنچ گئی ہیں۔[1] مگر مردوں اور عورتوں کے اکٹھے پڑھنے اور اٹھنے بیٹھنے سے جو نفسیاتی موزونیت اور آرام حاصل ہوتا ہے وہ ابھی ناپید ہے اور اس لئے ذہن میں خلش اور طبیعت میں کچھاؤ ہے۔ میں اس شعبہ زندگی میں کسی بھی صورت میں ماہر ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ مگر جب تک عورتوں کو مواقع فراہم نہ کئے جائیں جب تک ان کو تعلیم کے ساتھ اچھی خوراک، اچھا لباس اور تمدنی غذا مہیا نہ کی جائے، تب تک ان کے کاندھوں سے بوجھ نہیں اُترے گا جو سالہا سال کے تحکمانہ رویے اور استحصال سے ان پر پڑا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ گھرانوں میں جب تک بیٹی کا جنم اسی طرح عنایت ایزدی تصور نہ کیا جائے جس طرح بیٹے کا، کوئی بھی اچھا سلوک عورت کے زخموں پر مرہم نہیں لگا سکتا۔ میں اس مبارک دن کا انتظار کروں گا جب معاشی اور مادی ترقی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ عورت آزاد ہوگی، اسے اپنی روٹی روزی کمانے کا خود موقع ملے گا۔ وہ تمدنی اور تعلیمی سرگرمیوں میں حصہ لیگی اور اس طرح مرد اور عورت کے درمیان زیادہ حقیقی تعلقات اور

۱۔ میں حال حال میں کچھ کشمیری لڑکیوں سے ملا۔ انہوں نے پڑھنا لکھنا شروع کیا ہے اور اچھی اچھی کتابوں کی تلاش شروع کی ہے۔ کچھ تو شاعرانہ ذوق اور مذاق بھی رکھتی ہیں۔ ان میں پھلنے پھولنے اور عقلی و جذباتی بلوغیت کا شوق پایا گیا ہے۔ اگر ایسی لڑکیوں کو اچھے ماحول نصیب ہونگے، اگر ان کی حوصلہ افزائی کی جائیگی — اس لئے بھی کہ وہ اچھے لوگوں کے ساتھ رابطہ رکھیں۔ ان سے ملیں اور ذہنی لین دین سے فائدہ اٹھائیں — تو ان کی شخصیت ابھرے گی، کھِل کھِل کے نکھرے گی۔ ان کے دلوں میں خلش نہیں رہیگی اور وہ زندگی کی بہاروں میں مرجھا نہیں جائیں گی۔ دھیرے دھیرے گلوں سے بھرے کشمیر کے چمن ان سدا بہار پھولوں سے بھی بھر جائیں گے۔ یہاں کی سیدھی سادھی زندگی کو نئے موڈ دینے کیلئے۔

صحت مند رشتے پیدا ہو جائیں گے۔ اگر عورتوں کی ملازمت اور خود کفالت کا انتظام بھی ہوتا ہے مگر مرد اس سے جہیز طلب کرتا ہے، اس کا کمایا ہوا روپیہ پیسہ چھین لیتا ہے اور اپنی اعلیٰ تعلیم یا تکنیکی مہارت کا تاوان اس سے حاصل کرتا ہے، تب مسئلہ حل نہیں ہوتا ہے بلکہ عورت کی زندگی جوں کی توں غلامانہ حالات کا شکار ہو جاتی ہے۔ حرص نے انسان کو اندھا بنایا ہے۔ وہ عورت کا بھی بیوپار کرنے لگا ہے۔ اور منڈپ میں اس سے نیک دل بیوی طلب نہیں کرتا بلکہ موٹر، کمپیوٹر، سونا اور جواہرات حاصل کرنے کی چاہت رکھتا ہے۔ یہ تہذیب کی منحوس ترین جہت ہے۔ اس کی پامالی لازمی ہے اور وقت کی اہم ضرورت! بالکل ایسی ہی مذموم جہت سامنے آتی ہے جب عورت کھانا پکاتی ہے، کپڑے دھوتی ہے، جھاڑو دیتی ہے، بچوں کی بہر صورت دیکھ بال کرتی ہے مگر جب وہ تنخواہ لاتی ہے تو بڑے میاں ہاتھ مارتا ہے۔ ایسی عورتوں کا حال اس وقت اور بھی برا ہو جاتا ہے جب نندیں اور دیگر عورتیں اس سے معاوضہ طلب کرتی ہیں، بلواسطہ یا بلاواسطہ، مہذب طریقے سے یا بزور اور وہ بے چاری ماں باپ، بھائی، بہن کی طرف مدد کیلئے رجوع کرتی ہے۔ بڑے بڑے مولوی صاحبان، شیعہ اور سنی دونوں، بڑی بڑی مسجدوں اور مجلسوں میں، بڑے بڑے مقدس اور متبرک موقعوں پر منبر پر خطاب کرتے ہیں مگر نہ یہ کہتے ہیں کہ مسلمان عظیم کیسے بنے اور نہ ہی کہ مسلمانوں کا انحطاط اور زوال کیسے شروع ہوا، کیسے وہ گہری کھائیوں میں پڑ گئے جہاں سے ان کے کراہنے کی آواز کے سوا کوئی بھی صدا آتی نہیں۔ میں اس موقعے پر ''مذہبی اجتماعیت اور آفاقی برادری'' Religious Pluralism and World Community سے اقتباس لینے کی مسرت حاصل کرنا چاہوں گا۔ یہ کتاب ایڈورڈ جے جورجی نے تالیف کی ہے۔ اس میں ''اسلام عہد جدید میں'' ایک مضمون ہے جسے مشہور و معروف عارفہ انا ماری شمل نے لکھا ہے۔

''مستقبل میں قیادت کرنے والے اماموں کی تعلیم جدید اداروں میں مفید ثابت ہوگی۔ اس تعلیم سے وہ سائنسی تحقیق کے نتائج سے

باخبر ہوں گے اور تاریخ کے صحیح مطالعے سے۔ تاریخ کے مطالعے میں مذاہب کی تاریخ بھی شامل ہوگی جس سے امام صحیح سوال پوچھنے کے مناسب طریقوں سے واقف ہوں گے۔ آنکھیں بند کر کے وہ ہر اُس چیز کو تسلیم نہیں کریں گے جو ان کے پاس موروثی حقیقت کے نام پر پہنچائی جاتی ہے۔ نقل سے اس روح پر بے جان تہہ جم گئی ہے جو ایک زمانے میں مسلمانوں میں بیدار تھی۔ نقل وہ علمی ذخیرہ ہے جسے محض روایات دُرست اور جائز قرار دیتے ہیں۔ اس میں معلم کی باتوں پر مکمل اور قطعی اعتبار سے بھی شامل ہے (جو مذہبی رواداری پر مبنی اداروں میں بھی نظر آتا ہے)۔ اگر ہم مسلمانوں کے سنہری زمانے کو بار بار نہ دہرائیں بلکہ ان وجوہات کی نشاندہی کریں جن کی بدولت مسلمانوں نے آرٹ اور سائنس کے کارنامے تحقیق کئے تھے تو اس قوم کی مستقبل کی تقدیر بنانے میں مدد ملے گی۔۔۔ تمام مذاہب سائنس کے زمانے میں ایک ہی قسم کے اہم ترین مسائل سے دوچار ہیں۔ مثلاً روحانی مدار (axis) کا نقصان، بڑھتی ہوئی مادیت، شاندار سائنسی تحقیق کے نتائج سے پیدا شدہ حد سے زیادہ خوف اور ایمان کی عدم موجودگی میں انسان کی تنہائی۔ ہمارے پاس بس ایک امید ہے کہ مسلمانوں کو صحیح راستہ معلوم ہوگا۔۔۔ صراط مستقیم ۔۔۔ بشرطیکہ وہ اپنے مذہب یا اپنی تہذیب کی مایہ ناز قدروں کی تہہ تک پہنچنے کے لئے عرفانی نظر پیدا کریں۔ اس سے وہ الٰہی ضابطے کے مطابق اپنی زندگی گذارنے کے اہل ہونگے۔ اس طرح اظہر کے سابق ناظمِ اعلیٰ محمد عبداللہ دراز کے تحسینی بول ایک دن شرمندہ

تعبیر ہونگے۔(انہوں نے کہا تھا) کہ اسلام داخلی سلامتی اور خارجی
سلامتی کا نام ہے یعنی یہ مذہب خدا کے ساتھ اتصال پیدا کرتا ہے اور
اس کی ساری مخلوقات کے ساتھ ہم آہنگی۔[1]

اس سے مراد یہ ہے کہ ہمارے مذہبی راہنماؤں کی آنکھ کھلنی چاہیے تاکہ وہ سائنسی دنیا میں پیدا شدہ نورِ علم کا ادراک کرسکیں اور اُن خطرات سے پرہیز کرنا سیکھ سکیں جو موجودہ زمانے میں پیدا ہوئے ہیں۔ سب سے زیادہ ضروری ہے کہ وہ ایمان کی بازیابی کا بیڑا اٹھا سکیں۔ یہی راہِ مستقیم ہے جو اُنہیں ایک دن داخلی اور خارجی اطمینان عطا کرے گا اور خدا کے ساتھ ساتھ خلقِ خدا کے ساتھ جوڑ دیگا جن میں عورتیں شامل ہیں۔ یہ مذہبی رہنما شیخ اکبر محی الدین ابن عربی جیسے اولوالعزم اور صاحب قلب ونظر کا حوالہ تک نہیں دیتے جسے خود سرورِ

---

1. "The education of the future Imams in modern institutions, acquainting them with the results of scientific research and leading them to the study of history including the history of religions, in order to teach them the art of asking not blindly accepting whatever is transmitted to them as inherited truth, would be likewise useful. The NAQL, the transmission of chains of information which is sanctified by tradition, and the absolute faith in the word of the teacher (which can be witnessed even in secular universities) has formed a lifeless crust on the spirit which once lived in the Muslim community. Not to recall over and over again the Golden Age of Islam but to ask for what reasons Muslims have created these great works of art and science, would help mould the future destiny of the community... for all the great religions are confronted in the age of science with the same vital problems, i.e. the loss of the spiritual axis, growing materialism, overwhelming fear of the results of the glorious scientific research, and the loneliness of man in a world without faith. We can only hope that the Muslims by deepening their insight into the distinctive values of their religion, and that means, of their civilization, will find the right way, --- the straight path --- for living their lives according to the divine order, so that the praising words of Mohammad Abdullah Daraaz, former rector of Al-azhar, may become true one day, namely that Islam is external peace and internal peace, peace with God and peace with all creatures."

Annemarie Schimmel

کائنات محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کتاب لکھنے کو کہا اور اس نے ''فصوص الحکم'' لکھ ڈالی۔ اس کتاب میں ''محمدؐ'' کے باب میں لکھا ہوا ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ تین چیزیں پروردگار عالم نے ان کے لئے عزیز بنائیں۔ عورت، عطر اور عبادت۔ پھر بحث کرتے ہوئے شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ عشق حقیقی تک پہنچنے کیلئے مجازی عشق سے گزرنا لازم ہے۔ عشق مجازی میں کوئی قبح نہیں۔ مگر افلاطون دوہرے پن کا شکار ہو گیا اور اس نے نفس اعلیٰ اور نفس ادنےٰ کا قضیہ کھڑا کیا۔ تاہم افلاطون کے قضیے کا نہ نفسیات میں کوئی جواز ہے اور نہ کسی اور چیز میں۔ حقیقت یہ ہے کہ فکر، جذبہ اور احساس میں ہم آہنگی ہونی چاہیے۔ ہم یہاں کلیات عرفی، دیوان نظیری اور امراؤ جان ادا (رسوا) سے بالترتیب تین اشعار نقل کریں گے[1] جو ہمارے دعویٰ کی مزید دلیل بن سکتے ہیں

سینہ گرم نداری مطلب صحبت عشق
آتشے نیست چو در مجمرہ ات عود معز
(عرفی)

روئے نکو معالجۂ عمر کوتہ است
ایں نسخہ از بیاضِ مسیحا نوشتہ اند
(نظیری)

لذتِ معصیت عشق نہ پوچھ
خلد میں بھی یہ بلا یاد آئی
(ہادی رسوا)

۱۔ یہ تینوں اشعار مولانا آزاد کی ''غبار خاطر'' سے نکالے گئے ہیں۔ صفحہ ۲۵۸۔

ترجمان الاشفاق[1] میں بھی ابن عربی کہتا ہے کہ اس کا دل ہر فارم کی جگہ بن گیا ہے۔ یہ غزالوں کی چراگاہ ہے اور عیسائیوں کا کلیسا۔ بتوں کیلئے بت خانہ ہے۔ حاجی کیلئے کعبہ ہے، تورات کے الواح اور قرآنی صحیفہ ہے۔ میں عشق کا مذہب اختیار کر بیٹھا ہوں۔ عشق کے اونٹ کونسا راستہ اختیار کریں گے، وہاں ہی میرا دین ہوگا اور وہاں ہی ایمان!

---

1. My heart has become capable of every form, it is
a pasture of Gazelles and a
convent for Christians
and a temple of idols
and the pilgrim's Ka'ba
and
the tables of the Torah,
and the book of Quran
I follow the religion of Love: Whatever way Love's camels
Take, that is my religion
and my faith.